UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222912
UNIVERSAL
LIBRARY

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قیمت فی پرچہ ۸/

محسن الملک

مرتبہ:- حامد بھوپالی

قیمت ششماہی سے/	ماہ ستمبر ۱۹۲۴ء	انہ صہ

فہرست مضامین

ایڈیٹر - ۲
...م (نظم) مولنا ماہر بھوپالی ۴
...دعالیہ - صاحبزادہ احمد سعید خان عاشق ٹونکی
...م - ایڈیٹر ۸
...حضرت شہزادہ قدسی ۱۰
...مولوی محمد حسین محوی لکھنوی ۱۲
...نما (غزل) مولنا سہا علیگ ۲۳
...مولنا سعید رزمی ۲۴
...حضرت صدق جائسی ۲۶
...م مولنا نیاز فتحپوری ۲۷
کلام ذکی (غزل) حضرت ذکی وارثی - ۳۱
مریم (ناول) ترجمہ (ترجمان) ۳۲
غزل - حضرت ناصر اٹاوی ۳۶
بختیار خلجی مولنا حسن اجمل بی اے علیگ ۳۷
رنگ شفق - مولنا شفق بھوپالی ۴۳
عورت - حضرت ماہر بھوپالی ۴۴
ایثار کا نمونہ - ایڈیٹر (افسانہ) ۵۰
غزل - ایڈیٹر ۵۵
پاپیہائی (ناول) مولوی برکت علی ۵۶
کلام عالی - حضرت عالی صفی پوری - ۶۴

افتتاح

مشیت کے احکام کسی قوت سے مغلوب نہیں ہو سکتے، اور نہ قانون قدرت کسی طاقت سے فنا ہو سکتا، مخلوقات میں موجِ حیات پیدا ہوتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے دامانِ بحرِ فنا میں ناپید ہو جاتی ہے، غنچے کھلتے ہیں، پھول شگفتہ ہوتے ہیں، نزہت آفرین بہار چمنستان میں تختے کے تختے شاداب کر دیتی ہے، لیکن تھوڑے سے وقفہ کے بعد نہ غنچے باقی رہتے، نہ پھول، نہ بہار کی رنگ آرائیاں باقی رہتیں اور نہ تختۂ گلزار میں نکہت بیزیاں قائم، خزاں کا دور نظارہ کی تمام دلفریبیاں چھین لیتا ہے اور ذوق نظر کی حسیات کو مضمحل بنا دیتا ہے۔

کائنات کا ہر ذرہ مرقع عبرت ہے اور موجِ سراب کی طرح بے حقیقت۔ طوفانِ حوادث سے کرۂ ارضی محفوظ نہیں ہے، کہیں طغیانیٔ آب و ہوا سے ہزاروں ہستیاں تباہ و برباد ہوتی ہیں اور کہیں امراض کے جراثیم حیات انسانی کو فنا کر ڈالتے ہیں۔ لیکن اس سیلاب سانحہ میں اس طوفانِ حوادث میں بعض ایسا دلریش واقعہ سامنے آجاتا ہے جو سکونِ قلب کا تختہ الٹ دیتا ہے اور عالم کو غریقِ یاس و حرماں بنا دیتا ہے۔

بھوپال کا مطلع جو پُر انوار تھا، افسوس کہ آج ایک ہمدرد کی رحلت سے تاریک ہو رہا ہے نواب محسن الملک بہادر فردوس مکاں کا ذوق علمی کسی تفصیل کا محتاج نہیں ہے، مرحوم کی دلی خواہش تھی کہ بھوپال کی فضا کمالاتِ علمیہ سے معمور ہو جائے، مرحوم کے دماغی افکار کے اکثر قیمتی لمحات اسی میں صرف ہوتے تھے۔

مرحوم کی سنجیدہ حیات نے اس کا فیصلہ کر لیا تھا کہ کوئی قوم بغیر اعلیٰ تعلیم ارتقائے ترقی کے منازل طے نہیں کر سکتی، اور اسی لئے افراد ملکی کی مالی معاشرتی زندگی جو مرقع آلام تھی اس پر ہمدردانہ نظر ڈالی جاتی تھی اور اہل ملک کی خوابیدہ فطرت کو ابرِ کرم کی بارش سے بیدار کیا جا رہا تھا۔

ساڑھے چار لاکھ روپیہ کا بیش بہا سرمایہ اسی لئے وقف فرمایا گیا تھا کہ افراد

ملک کے دل و دماغ اعلیٰ تعلیم دینی و دنیوی کے انوار سے منور ہو جائیں آیندہ کے لئے بھی ہمدردی اور فیاضیوں کا ابرِ مطیر جو برسنے والا تھا افسوس کہ مرحوم کی بے وقت وفات نے اُس کے استفادہ سے محروم رکھا۔ ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

مرحوم کے سانحہ وفات نے دل و جگر کو شق اور ہماری آنکھوں کو آبشارِ حسرت بنا دیا ہے اور ہماری ترقیاتِ مستقبل کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا ہے اُس کا اظہار ناممکن ہے۔

مرحوم جو تنظیمِ تعلیمی پیدا کرنا چاہتے تھے، اکتسابِ صنعت و حرفت کے لئے جو راہ عمل ترتیب دے رہے تھے اور علوم و فنون کی ضیا بیزی سے اہلِ بھوپال کے دل و دماغ کو جس طرح مطلع انوار بنانے کی کوشش فرما رہے تھے اُسکی تصریحات ہم کسی دوسری صحبت میں پیش کرینگے،

فی الحال ہم ایک تاریخی نظم "**افکارِ غم**" حضرت **ماہر بھوپالی** کی ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ یہ نظم درحقیقت شاعری نہیں بلکہ جذباتِ غم کی تصویر ہے جسکی رگ رگ میں تخیلات کے موقلم نے "تاثرات کا خون بھرا ہے؛ سچ ہے جو چیز دل سے نکلتی ہے وہ دل میں بیٹھتی ہے۔

اس وقت یہ رسالہ اُسی ہمدرد کی یادگار میں ناظرین کے سامنے پیش ہے۔ اس لحاظ سے کہ مرحوم کو جو شغف علمی رہا ہے اس رسالہ کو بھوپال سے نکالنے کا عزم مصمم کر لیا گیا ہے۔

اہلِ مذاق سے عموماً اور اہل بھوپال سے خصوصاً امید ہے کہ وہ اس کا گرم جوشی سے خیر مقدم کریں گے اور اس یادگار کو مفید اور کارآمد بنانے میں سعی خاص سے کام لیں گے۔

ایڈیٹر

افکارِ غم

۱۳۴۲ھ

الٰہی ہر طرف یہ منظرِ دلگیر کیسا ہے؟ زمیں سے آسماں تک نوحۂ تقدیر کیسا ہے؟
دفورِ غم سے وارفتہ جوان و پیر کیسا ہے؟ جگر فرطِ خلش سے صورتِ نخچیر کیسا ہے؟
کھنچا ہے سامنے آنکھوں کے نقشہ درسِ عبرت کا
جسے دیکھو مرقع ہو رہا ہے یاس و حسرت کا

ہوائے کوہِ شملہ تعزیت انگیز کیسی ہے؟ فضا بھوپال کی یارب قیامت خیز کیسی ہے
ہر اک منظر کی صورت آج حسرت ریز کیسی ہے؟ زمانہ کی طبیعت آج غم آمیز کیسی ہے؟
شبستانِ تمنا میں یہ ظلمت گستری کیوں ہے؟
الٰہی آج ہر اک آنکھ آنسو سے بھری کیوں ہے؟

اداسی چھا گئی ہے کس لئے صحنِ گلستاں پر یہ چرکے نشترِ غم دے رہا ہے کیوں رگِ جاں پر
حوادث کی شکن کیوں پڑ گئی اوراقِ گیہاں پر الٰہی داغ کیوں ہے سینۂ ماہِ درخشاں پر
صبا! یہ کیا کہا جنرل کو پیغامِ اجل آیا!!
زبانِ بدحواسی سے یہ کیا جملہ نکل آیا!!

قیامت ہے عبید اللہ خاں کا آج ماتم ہے ہر اک سینہ دفورِ رنج سے اک تودۂ غم ہے
جگر صد چاک ہے فرطِ الم سے آنکھ پرنم ہے غبارِ رنج و حسرت سے جہاں کا ناک میں دم ہے
بتائیں کیا کہ کیا ذوقِ نظر کو کرب ہوتا ہے
بڑا اندھیر ہے خورشیدِ رخشاں غرب ہوتا ہے

خبر تھی مرگ کی یا برقِ عالم سوز تھی کیا تھی؟ کہ تاثیرِ صدائے الاماں جس سے ہویدا تھی
خبر ہر گز نہ تھی وہ ایک سیلِ روح فرسا تھی جدھر دیکھو قیامت پر قیامت آشکارا تھی
زمیں سے آسماں تک کس قدر کہرام برپا تھا
عبید اللہ خاں کی موت کا ہر سمت چرچا تھا

جنازہ اُٹھ کے جب جانے لگا ہی جانبِ مدفن — کلیجہ آتشِ رنج و قلق سے بن گیا گلخن،
جگر سے آہ نکلی لب پہ تھا بیساختہ شیون — بہت سے تھے جنہوں نے چاک کر ڈالے تھے پیراہن

جنازہ تھا الٰہی یا کوئی سیلابِ حسرت تھا
کہ ہر لختِ جگر طوفانِ دریائے جراحت تھا

شمیمِ خلق سے اُسکی معطر سارا عالم تھا — نسیمِ لطف سے اُسکے نفس بشاش و خرّم تھا
وہ اہلِ ملک کے زخمِ جگر کا طرفہ مرہم تھا — طلبگارِ حقوقِ ملتِ قومی وہی دم تھا،

الٰہی کیا غضب ہے وہ رفیقِ ملک جاتا ہے
رہے جاتے ہیں ہم تو وہ شفیقِ ملک جاتا ہے

جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ہم کسی جا کر دکھائیں گے — ہمارے لختِ دل ذوقِ سکوں کس طرح پائینگے
اگر زندہ رہے تو دوستو تم کو بتائیں گے — زمانہ کی ہزاروں ٹھوکریں ذلت سے کھائیں گے

عبیداللہ خاں تھا جو ہمیں محفوظ رکھتا تھا
تلطف ریزیوں سے آئے دن محظوظ رکھتا تھا

رعایا پر وہ شیدا تھا، رعایا اُسکی طالب تھی — غرض تنظیمِ خلاقی کی وسعت ہر دو جانب تھی
بُرا ہو تیرہ بختی کا یہ ایسی ہمہ غالب تھی، — کہ وقتِ صبح دن کی روشنی آنکھوں سے غائب تھی

وہ نکہت خیزیِ باغِ تمنا اب کہاں باقی؟
مگر حسرت کا دل میں رہ گیا ہو اک دھواں باقی

بہی خواہِ وطن تھا اور وطن سے اُسکو الفت تھی — اُسے اہلِ وطن کے ساتھ اک قلبی محبت تھی
طبیعت میں سخاوت اور سخاوت جزوِ فطرت تھی — غرض ایثار سے بالخاصہ اُسکو جو نسبت تھی،

سخن سے اور درم سے ہر طرح وہ کام آتا تھا
کہاں دہلیز سے اُسکی کوئی ناکام جاتا تھا؟

اُسے احساس تھا اہلِ وطن کی پست حالت کا — اُسے غمگین رکھتا تھا ہمارا دورِ نکبت کا
اُسے معلوم تھا اچھی طرح سے رازِ صنعت کا — وہ واقف تھا وہ ماہر تھا جو بازارِ تجارت کا

تمنا تھی کہ صنعت اور حرفت میں بڑھیں آگے
کہ منزل دور ہے جلدی سے اُٹھ کر ہم چلیں آگے

سمجھتا تھا حصولِ علم وجہ اوجِ عزت ہے　　دُہ واقف تھا کہ جہلِ فن نمودِ قعرِ ذلت ہے
اُسے معلوم تھا صنعت میں رازِ جلبِ دولت ہے　　وہ کہتا تھا تجارت کو کلیدِ گنجِ عزت ہے

یہ تھا ارشاد اہلِ ملک سے اکثر کہ اے لوگو
اگر رہنا ہے دنیا میں تو پھر علم و ہنر سیکھو

عجب پبلک کو اُس ذاتِ گرامی پر بھروسہ تھا　　کہ جس سے نخلِ اُمیدِ مستقبل شگفتہ تھا
ریاضِ آرزوئے خلق اُسکے دم سے تازہ تھا　　گلِ مقصود کھلنے کا وہ اک عمدہ وسیلہ تھا

زمانہ منقلب یارب یہ کیسا آج ہوتا ہے ؟
کہ خاک آلود اُسکی زندگی کا تاج ہوتا ہے ؟

تھا جوہر رحم و ہمدردی کا مضمر اسکی فطرت میں　　نظر آتا تھا جب کوئی اُسے رنج مصیبت میں
ودیعت چونکہ تھا ذوقِ کرم اُسکی طبیعت میں　　وہ اُس بیکس کو لے لیتا تھا آغوشِ سخاوت میں

وہ ہستی کیا تھی اک مجموعۂ اخلاقِ خوبی تھی ،
وہ ذاتِ قدس گویا مظہرِ آفاقِ خوبی تھی ،

نظر غائر - فراست تیز - باتیں ہوشمندانہ　　دلائل میں عجب جدت - طریقِ بحث فرزانہ
وقارِ تمکنت موزوں - تدبر اُسکا شاہانہ　　سیاست تھی پسندیدہ - طبیعت تھی شریفانہ

غضب ہے ایسی ہستی آج ہوتی ہے جدا ہمسے
خدا جانے کہ قسمت ہوگئی ہے کیوں خفا ہمسے

یہ خواہش تھی کہ ابنائے وطن کا جہل زائل ہو　　دیا سرمایہ لاکھوں کا کہ شوقِ علم کامل ہو
ہر اک سینہ علومِ مشرقی سے بحر کامل ہو　　علومِ مغربی پر بھی نہیں اور اک حاصل ہو

فنون و علم و حکمت میں شرف افزائے دوراں ہوں
یہ سب بھوپال کے ذرے جوابِ مہرِ رخشاں ہوں

یہ مانا عالمِ امکاں بنایا ہے حوادث سے
مگر کب تک کوئی صدمے سہے رنج و الم جھیلے

محیطِ غم میں بہتر ہو کہ کشتی عمر کی ڈوبے
کشاکش ہائے گوناگوں سے عمرِ ناتواں چھوٹے

الٰہی ضبط مجھ سے رنج و غم کا ہو نہیں سکتا
دلِ صد ریش اچھا ہو وہ اچھا ہو نہیں سکتا

تو واقف ہے عبید اللہ خاں سالارِ اعظم تھا
سخاوت میں وہ حاتم تھا، شجاعت میں وہ رستم تھا

فلاحِ ملک و ملت کا مقدس خیر مقدم تھا
وہ حاجی تھا، وہ حافظ تھا، غرض خیرِ مجسّم تھا

ترے افضال کا سر پر الٰہی اُسکے پرچم ہو
وہ فردوس بریں میں بھی معزز ہو مکرّم ہو

بس اے طوفانِ بیتابی یہ کلفت بیزیاں کبتک
کسی کی یاد میں ایسی قیامت خیزیاں کبتک

مری ہر بات میں آخر قلق انگیزیاں کبتک
مجھے تاریخ لکھنے میں یہ حسرت ریزیاں کبتک

نہ کوشش کی نہ کچھ امدادِ ہاتف کی ضرورت ہے
عبید اللہ خاں کا حادثہ۔ خود سالِ حسرت ہے

۱۳ ھ ۴۲

افکارِ عالیہ

اب ترا عشق ستاتا ہے مجھے
کچھ نہ ہوتا نظر آتا ہے مجھے

آدمی ہوں کوئی فتنہ تو نہیں
کیوں وہ محفل سے اُٹھاتا ہے مجھے

اے رہِ شوق ترا کیا کہنا
کوئی کھینچے لئے جاتا ہے مجھے

آنکھوں آنکھوں میں گھلا جاتا ہوں
کوئی مجھ میں سے چُراتا ہے مجھے

آج سنسان ہے دنیا عاشق
عالمِ ہُو نظر آتا ہے مجھے ؎

عاشق ٹونکی

سحر مرحوم

سراج میر خاں سحر مرحوم بھوپال کی سنگلاخ زمین میں ایک ایسا درخشاں ذرہ گزرا ہے جسکے اوجِ فکر نے سپہر شاعری میں چار چاند لگا دیے تھے۔

مرحوم کی طبیعت کو جسقدر صنف شاعری سے دلچسپی تھی اُسیقدر شہرت طلبی سے نفرت تھی یہی سبب ہے کہ اُن کا کلام بیاض کی صورت میں محفوظ نہیں ہے۔

جو شعر ان کی زبان سے نکلتا تھا وہ بہتر نشتروں میں سے ایک نشتر ہوتا تھا جس کو سنکر اہل مذاق کی طبیعت وجد میں آجاتی تھی اور اہل فکر فکر کی بلندی کو دیکھکر حیرت زدہ ہو جاتے تھے۔

شوکت لفظی، رفعت تخیل چستیِ بندش، مرحوم کی شاعری کا حصہ خاص تھا، تغزل میں انکا پایہ بہت بلند تھا، جسوقت مرحوم کوئی غزل لکھانے بیٹھتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابر نیساں طبع سے مسلسل موتیوں کی بارش ہو رہی ہے۔

چند لمحات میں مشکل سے مشکل زمینوں میں وہ ایسی سیراب غزل فرماتے تھے کہ سامعہ وجد کرنے لگتا تھا اور باصرہ غرقِ حیرت ہو جایا کرتا تھا۔

مشاعروں یا مختلف صحبتوں میں جو مرحوم کا کلام میرے بیاضِ قلب میں منقوش ہے میں چاہتا ہوں کہ رسالہ ہذا کے صفحات میں نذرِ اربابِ ذوق کرتا رہوں۔ فی الحال ایک غزل پیش کی جاتی ہے:۔

غزل

سینہ میں دل ہے، دل میں داغ، داغ میں سوز و سازِ عشق
پردہ بہ پردہ ہے نہاں پردہ نشیں کا رازِ عشق

باندھ کے صف ہوں سب کھڑے، تیغ کے ساتھ سر جھکے
آج تو قتل گاہ میں دُھوم سے ہو نمازِ عشق

پردہ میں چھُپ کے الحذر گوشہ میں رہ کے الاماں
ہمکو خبر ہے ہوگیا حُسن سے ساز بازِ عشق

سر کو کٹا کے لوٹ لی دولتِ وصلِ سرمدی
تیغ کے گھاٹ قطع کی ہمنے رہِ درازِ عشق

خاص خدا کا وہ مقام، دل میں خدا کے اُس کا گھر
عرش سے کچھ بلند ہے، درگہِ بے نیازِ عشق

فرشِ زمیں پہ مصطفیٰ، عرشِ بریں پہ کبریا
پہونچا کہاں ہے دیکھنا، سلسلۂ درازِ عشق

دار پہ کوئی چڑھ گیا، پھوڑ کے سر کوئی مرا
نام جہاں میں کر گیا، سحر اُٹھا کے نازِ عشق

نغماتِ قدس

کائنات میں ہر ذرہ حسین ہے لیکن حُسنِ بشری طرفہ چیز ہے، آہ! حسن عجب خوبی ہے، دل کو لُبھانے والی، تڑپانے والی"..."، تماشا گاہِ عالم میں جس چیز پر نظر ڈالو حُسن کی تصویر ہے، گویا دنیا حُسن کا عجائب خانہ ہے، ہر شے اپنے اندر ایک مخصوص اور ممتاز حُسن رکھتی ہے اور اسی خصوصیت سے وہ ایک دوسرے پر تفوق رکھتی ہے اور یہی اختصاص اسکو نمایاں کرتا ہے۔ انسان، مجموعہ ہے تمام محاسن و خوبیوں کا، گویا حُسن مجسم یا حُسن کامل ہے۔ حُسن بشری کو کسی چیز سے تشبیہ دینا اسکی شان کو گھٹانا ہے "حُسن انسان، بے مثل و بے نظیر ہے" حُسن وہ ہے جو مرغوبِ طبع ہو، جسکو جو پسند آئے اُسکے لئے وہی حسین ہے۔ پس جس پر دل فریفتہ ہو جائے وہ سب سے بہتر ہے، اور جو سب سے بہتر ہو وہ بے مثل و بے نظیر ہے۔

"کسی بے مثل و بے نظیر شے کے لئے تشبیہ موزوں نہیں"

حسن کی تعریف میں جو بھی کچھ کہا جائے وہ شعر ہے لیکن کسی خاص ترتیب و موزونیت کے ساتھ حُسن کے متعلق اپنے حسیات کو بیان کرنا نظم کہلاتا ہے۔ "نظم کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر قسم کی تشبیہات و استعارات اور کہانیوں سے پاک ہو"!

شاعری اچھی چیز ہے لیکن فرضی تصورات اس شریف فن پر ایک بدنما دھبہ ہیں۔

خیالی باتیں پُرکیف نہیں ہوتیں، جذباتِ صادق میں جو لطف و سرور اور حسیات خالص میں جو نشاط و انبساط ہوتا ہے وہ فرضی تصورات میں کہاں؟

عام طور سے شاعروں کا معشوق ایک فرضی بُت ہوتا ہے جو قد میں سرو کے برابر، کمر بالکل غائب، ابرو تلوار کی طرح، مژگاں تیر کی مانند، بجائے دنداں موتیوں کی لڑی، لب کی جگہ مرجان کی شاخیں، رخسار مثل گلاب، اور چہرہ جیسے چاند، یہ تو اُس بت کا سراپا ہے، اب اُس بُت کی حرکات کو دیکھئے تو رفتار میں آندھی کو نیچا دکھائے اگر کہیں ہنس پڑے تو بجلیاں گرنے لگیں اور قیامت برپا ہو جائے۔

بے شک سرو، شمشیر، تیر، گہر، مرجان، گلاب، اور چاند، بجائے خود نہایت حسین ہیں اور بہت مفید ہیں لیکن اگر کسی بشر کا قد سرو کے برابر ہو تو اُسے بجائے معشوق بنانے کے ایک دیو یا بھوت کہا جائے گا، کمر کا بالکل نہ ہونا بعید از قیاس ہے، بجائے ابرو تلوار برہنہ اور بجائے مژگاں تیر کمان پر چڑھا ہوا ہو تو یقین ہے کوئی عاشق بھی اُدھر رُخ نہ کرے، البتہ اگر دانتوں کی بجای موتی ہوں تو سوداگروں، جوہریوں اور حریص و طامع لوگوں کو فائدہ حاصل کرنے کی امید ہو سکتی ہے، یہی حال مرجاں کا ہے، رخسار کی بجائے گلاب کے پھول ہوں تو

صوفیوں کو ایک حد تک بہرہ اندوز کر سکتے ہیں ورچھوڑ کا چاند ہو جانا شاید سائنس دانوں کی معلومات میں کچھ اضافہ کر سکے آندھی کی طرح چلنا یا ایسی ہنسی جس سے بجلیاں گرنے لگیں ہرگز پسندیدہ نہیں۔

جھوٹی شاعری کی قرآن حکیم نے مذمت کی ہے اور سچی شاعری کو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا ہے۔

محبت بڑی اچھی چیز ہے، کمالِ محبت کا نام عشق ہے عشق صادق وہ ہے جو جذباتِ شہوانی و خیالاتِ نفسانی سے پاک او رحیات و مدرکات کو ملاءِ اعلیٰ کی طرف مائل کرنے والا ہو سچے عاشق کا ملاءِ اعلیٰ کی ہمتیں خطوطِ شعاع کی مانند احاطہ کر لیتی ہیں اور دمبدم ایسے الہام خاطر میں وارد کرتی ہیں جس سے ذوق و شوق میں ترقی ہوتی ہے اور قلب جوشِ اشتیاق میں مشتاقِ دیدار ہو کر تڑپنے لگتا ہے اور ایک خاص حالت طاری ہو کر عجیب پُرکیف نورانیت ظاہر ہوتی ہے۔

عشق سے وہ عشق مراد نہیں جو عام طور پر دیکھا اور سنا جاتا ہے یہ تو بوالہوسی ہے ؎

عشق نبود ایں کہ در مردم بود ایں فساد از خوردن گندم بود

لُغت میں عشق کے معنی افراطِ محبت کے ہیں اور بتکلف عشق کرنے کو تعشق کہتے ہیں، حسن و عشق کی داستانیں سُننے اور پڑھنے سے تعشق کی تحریک ہوتی ہے، شہوت کے ہیجان سے یہ حالت پیدا ہوتی ہے صاحبِ قاموس کا قول ہے کہ تعشق ایک سوداوی مرض یا خیالی بیماری ہے، فرضی فسانۂ عشق و محبت کے اور حسن و جمال کے قصے، حکایتیں اور کہانیاں سُننے سے اس کا ظہور ہوتا ہے طبیعت اپنی ہوس کو پورا کرنے کیلئے ایک معشوق کی جستجو کرتی ہے یا کسی کی خوبی سنکر یا کسی حسین کو دیکھ کر جذبات شہوانی مہیج ہوتے ہیں اور ایک فکر دل پر مسلط ہو جاتی ہے اور نفس بار بار ہوس نکالنے کی خواہش کرتا ہے، صاحب سدیدی نے اس تعشق کو مالیخولیا کہا ہے اس سے احتراق خون کا اور استحالہ سوداکا اور التہاب صفرا کا ہوتا ہے، نیند جاتی رہتی ہے قلق کی شدت ہوتی ہے، اضطراب بڑھ جاتا ہے، طغیان سوداسے فکر فاسد بڑھجاتی ہے اور فساد فکر سے عقل و خرد و ہوش ندارد ہو جاتے ہیں ؎ نہ دن کو چین نہ شب کو قرار ہوتا ہے ؛؛ یہ عشق کا ہے کو ٹھیرا کوئی بلا ٹھیری۔

وہ عشق جو محض جذبات شہوانی کا نتیجہ ہو جب وصل معشوق نصیب ہوا اور نفس کی ہوس پوری ہوئی ختم ہو جاتا ہے، یا ایسے بوالہوس عاشق پر کوئی بلائے ناگہانی نازل ہو یا کسی سخت آفت میں مبتلا ہو جائے تب بھی ختم ہو جاتا ہے ؎

قدسی (غفرلہ)

درسِ اخلاق

(سلاطین اسلام کی زندگیوں میں)

مولوی محمد حسین محوی لکھنوی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آپ کی وسعت نظر اور ادبی لٹریچر ذوق نظر یں سرمایۂ معلومات پیدا کرتی ہے۔

مولانا نے براہ عطوفت وعدہ فرمایا ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے افکار تازہ سے رسالہ ہذا کی اعانت فرماتے رہیں گے، یہ مضمون ایفائے عہد کی پہلی قسط ہے، جو ہم نہایت تشکر سے درج کرتے ہیں۔ ایڈیٹر

مامون الرشید خاندانِ عباسیہ میں بڑا زبردست، نامور، علم دوست خلیفہ گزرا ہے۔ وہ اپنے اخلاق، تدبر، اور کمالِ ادب، حلم و بُردباری اور نیز سیاسی قابلیت کی بدولت بڑی زبردست و قابلِ قدر شخصیت رکھتا ہے، وہ حلم و کرم کا دل میں عجیب جذبہ رکھتا تھا۔ اور مجرموں کو اس طرح نوازتا کہ پھر اسکے بندۂ بے دام ہو جاتے تھے۔ بڑے بڑے سیاسی و ملکی مجرموں کے ساتھ اُس نے ایسا سلوک کیا کہ وہ پھر ہمیشہ کے لئے اسی کے ہو رہے۔ اپنے قصوروں پر اُنھیں ایسی ندامت ہوئی کہ بڑی سے بڑی سزا اس طرح اپنے کئے پر اُن کو نادم و پشیماں نہیں کرسکتی تھی، اور اس رحم و کرم کا یہ نتیجہ ہوا کہ مامون کا نام آج بھی زندہ ہے۔

ذیل میں ایک واقعہ لکھتا ہوں، جسمیں درحقیقت کئی درسِ اخلاق ہیں۔ مامون جب وقت مسندِ خلافت پر متمکن اور اس منصبِ جلیل پر فائز ہوا ہے، ابراہیم بن مہدی اس کا چچا اور ہارون کا بھائی "مقام" رے "میں گورنر تھا، وہاں اُس نے علمِ بغاوت بلند کیا، اور دعوائے خلافت کر کے تمام علاقہ "رے" پر قابض و متصرف ہوگیا، ڈھائی سال تک مامون کچھ نہ کرسکا اور یہ حکومت کرتا رہا، آخر اور طرف سے مطمئن ہو کر مامون نے اسکی سرکوبی کو رے پر لشکر کشی کی اور اسے زیرنگیں کرلیا، اب ابراہیم کو اسکے سوا چارۂ کار ہی نہ تھا کہ اپنی جانِ عزیز موت کے آہنی پنجہ سے بچا کر بھاگے، اور کہیں روپوش ہو کر اپنے کو بچائے، اس زمانہ میں

جو کچھ مصائب اور واقعات اسے پیش آئے وہ خود اسی کی زبانی حوالہ قلم ہیں۔ ابراہیم کا بیان ہے کہ جب مامون رشید برقابض ہو گیا اور مجھ کو گرفتار نہ کر سکا تو اس نے اعلان کیا کہ جو ابراہیم کو گرفتار کر کے لائے گا اُسے ایک لاکھ دینار (اشرفی) دربار خلافت سے انعام عطا کیا جائے گا۔ یہ خبر تمام شہر میں بجلی کی طرح پھیل گئی۔ ایک لاکھ اشرفی کی لالچ میں ہر متنفس میرا جویا اور میرے خون کا پیاسا نظر آنے لگا، دنیا اب میری نگاہوں میں بالکل تاریک تھی اور ہر طرف یاس ہی یاس نظر آتی تھی، ہر جانب خوف و ہراس مجھ پر طاری تھا، میں حیران تھا کہ کیا کروں کدھر جاؤں، عرصۂ زمین میرے لئے تنگ ہو گیا تھا، غرض اسی عالم مایوسی میں اپنے قصر شاہی سے تبدیل ہیئت کر کے نکلا، دوپہر کا وقت تھا، شدید گرمی پڑ رہی تھی، دن آتشکدہ کی طرح دہک رہا تھا بدنصیبی سے میں ایک ایسی سڑک پر نکل گیا کہ آگے رستہ نہ تھا، اب مجھے اپنی جان دوبھر ہو گئی، دل پر مزید مایوسی کی بجلی گر گئی۔ میں کہنے لگا "انا للہ وانا الیہ راجعون" میں نے اپنی جان خود ہلاکت میں ڈالدی۔ اب اگر واپس ہوتا ہوں تو لوگ ضرور مشکوک نظروں سے دیکھیں گے اتنے میں مجھے سڑک کے وسط میں ایک حبشی غلام اپنے مکان پر کھڑا ہوا نظر آیا میں اُسکے قریب گیا اور بڑی لجاجت سے کہا کیا تمہارے یہاں کوئی ایسی جگہ ہو گی جہاں میں آج دوپہر کو قیلولہ کر لوں، غلام حبشی نے کہا:۔ جی ہاں۔ اور دروازہ کھول کر کہا کہ اندر چلے آیئے۔ میں اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ مکان نہایت صاف و ستھرا ہے، عمدہ عمدہ فرش بچھے ہوئے تھے۔ جابجا قرینے سے گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے میں اندر جا کر آرام سے بیٹھ گیا۔ غلام حبشی باہر سے دروازہ بند کر کے چلا گیا، اب میرے دل میں یہ خوفناک خیال گزرا کہ افسوس میں اپنے ہاتھوں آپ گرفتار ہوا یقیناً یہ غلام مجھے پہچان گیا ہے۔ اور یہاں مجھے بند کر کے اس لئے گیا ہے کہ میرے دشمنوں کو اطلاع دیکر مجھ کو گرفتار کرا دے۔ اور ایک لاکھ اشرفی انعام لیکر خود دولتمند بن جائے اس خیال کے آتے ہی میری کچھ عجیب کیفیت ہو گئی۔ یہ حال تھا کہ گویا دہکتے ہوئے انگاروں پر لوٹ رہا ہوں وہ قالین اور گاؤ تکیے میرے لئے آتشیں بستر تھے۔ میں اس سوزش و کرب میں مبتلا تھا کہ دروازہ کھلا، اور میرا نیک دل میزبان اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک حمال تھا۔ اور حمال کی سر پر میری ضرورت کا تمام سامان روٹیاں۔ کچا گوشت۔ ایک نئی پتیلی (دیگچی) ایک نئی صراحی اور

دونئے پیالے یہ سب سامان حمال کے سر سے اُتار کر اسے رخصت کیا اور میری طرف متوجہ ہوکر نہایت ادب و تعظیم سے کہنے لگا :۔

میرے آقائے ولی نعمت ! خدا مجھے آپ پر قربان ہونے کی عزت دے میں ایک حجام ہوں سنگیاں لگانا میرا پیشہ ہے ۔میں جانتا ہوں کہ میری جو کچھ حیثیت اور وجہ معاش ہے اسے معلوم کر کے حضور کا نفس کبھی اسے قبول نہ کرے گا کہ میرے ہاتھ کی پکی ہوئی کوئی چیز کھائیں ۔ لہٰذا میں یہ اشیاء لایا ہوں حضور جس طرح مناسب سمجھیں انہیں اپنے کام میں لائیں ۔ان چیزوں سے کسی کا ہاتھ نہیں لگا ہے ۔ یہ کہکر حجام سامان میرے پاس رکھ کر چلا گیا ۔ ابراہیم کہتے ہیں اسوقت مجھ کو بہت سخت بھوک لگی ہوئی تھی ۔میں نے خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکایا اور کھایا ۔ مجھے یاد نہیں کہ اس روز جسقدر کھانا کھایا ہے ۔اس سے زیادہ لذیذ و خوش ذائقہ زندگی میں کبھی اور بھی نصیب ہوا ہو ۔ میں شدت جوع سے نجات حاصل کر چکا تو غلام پھر حاضر ہوا اور نہایت ادب سے بولا :۔

میرے آقا ! حکم ہو تو کچھ شراب (نبیذ) حاضر کروں ۔کہ وہ غم کو دور طبیعت کو مسرور کرتی ہے اندوہ و پریشانی سے نجات دیتی اور لطف حیات بخشتی ہے ۔

ابراہیم :۔ کچھ حرج نہیں ۔ تمھاری محبت و شرافت کے خیال سے میں اسے پسند کرتا ہوں ۔

یہ سنتے ہی اس نے شیشے کے ظرف لاکر حاضر کئے ۔جو بالکل نئے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ ابھی کسی نے انہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے ۔ اور ایک صراحی سر بہ مُہر پیش کر کے کہا :۔

میرے آقائے ولی نعمت ! آپ اب خود اپنے ہاتھ سے جام لبریز کریں اور جس طرح چاہیں نوش جاں فرمائیں ۔ ابراہیم نے شاہانہ تہذیب اور حسن شائستگی کے ساتھ صراحی کے منہ سے مُہر توڑی ، اور شراب نکالی جبتک اتنے میں اور ایک نیا پیالہ لے آیا جس میں کچھ تازہ میوے اور ساتھ ہی چند طباق تر و تازہ پھولوں کے لاکر سامنے رکھدیے ۔ پھر کہا کہ :۔ کیا حضور اجازت دیں گے کہ میں بھی الگ بیٹھ کر حضور ہی کی خوشنودیِ مزاج کی خاطر کچھ شغل کروں ۔

ابراہیم :۔ ہاں ہاں ! ضرور کیا مضائقہ ہے ۔

دونوں نے اپنی اپنی جگہ کئی جام پیئے ، اور اب غلام نے محسوس کیا کہ شراب اپنا اثر پورا کر چکی ہے تو وہ اُٹھا اور بند کوٹھری کو کھولا ۔ اور ستار نکال لایا ، پھر کہا کہ :۔حضور والا ! میری جرأت تو یہ نہیں

کہ حضور سے کچھ استدعا کر سکوں، لیکن حضور کی عالی قدری اور عالی ظرفی پر کچھ مجھ غریب کا حق بھی ہے لہذا اگر حضور اپنے بندۂ بے دام کو مسرور و سرفراز فرمانا چاہیں تو یہ کمال عزت افزائی ہوگی

ابراہیم۔ یہ تجھے کیونکر معلوم ہوا کہ میں عمدہ گانا بھی جانتا ہوں۔

غلام۔ سبحان اللہ! یہ خوب فرمایا۔ حضور تو آفتاب سے زیادہ اس شہر میں روشن ہیں، آپ ہمارے بزرگ آقا ابراہیم بن مہدی ہیں، ہمارے خلیفہ و بادشاہ ہیں جن کی نسبت مامون نے یہ اعلان کیا ہے کہ جو گرفتار کر کے لائے گا ایک لاکھ اشرفی انعام پائے گا لیکن میری طرف سے حضور مطمئن رہیں کہ غلام سے کبھی یہ نمک حرامی نہ ہوگی۔

حجام نے جسوقت یہ کہا ابراہیم کی نگاہوں میں اسکی عظمت و مروت اور شرافت کی قدر دوبالا ہوگئی۔ اسکی عالی ظرفی نے اسے اس قدر مسرور کیا کہ بے تکلف ستار اس کے ہاتھ سے لیکر تار درست کرنے لگا۔ اس وقت ابراہیم کا بیان ہے کہ سب سے زیادہ جو خیال سوہانِ روح تھا وہ وطنِ عزیز اور اپنی اولاد کا غمِ فراق تھا۔ اور یہ وہ غم ہے کہ خدا کی قسم کوئی انسانی طاقت برداشت نہیں کر سکتی۔ چنانچہ میں نے یہ چند شعر نہایت دردناک انداز سے ستار پر گائے ؎

عسیٰ الذی اہدی لیوسف اہلہ ٭ واعزّہ فی السجن وہو اسیر

ان یستجیب لنا و یجمع شملنا ٭ واللہ رب العالمین قدیر

(ترجمہ) کچھ دور نہیں کہ وہ ذات گرامی (خدا) جسنے یوسف کو اُسکے گھر والوں سے ملایا اور جب کہ وہ زندان میں اسیر تھے ان کو عزت دی۔ وہ ہماری بھی التجائیں قبول کرے اور بچھڑے ہوؤں کو ملائے کہ اللہ رب العالمیں سب پر قادر ہے۔"

یہ قطعہ سنکر غلام کو غیر معمولی سرور طاری ہوا۔ شراب کے ساتھ میں ابراہیم جیسے ماہر موسیقی کے نغمہ دلگداز نے مست کر دیا۔ انبساط و سُرور نے دل و دماغ پر ایسا اثر کیا کہ بے اختیار کہنے لگا:۔

حضور والا! کیا اجازت ہے کہ میں بھی اس وقت کچھ گاؤں جو میرے ذہن میں ہے۔ گو درحقیقت نہ میں اس کا اہل ہوں اور نہ میرا گانا اس قابل کہ حضور کو محظوظ کر سکے۔

ابراہیم۔ یہ میرے ساتھ تمہارا اور بھی کمالِ اخلاق اور حُسنِ ادب ہوگا۔

غلام نے ابراہیم کے ہاتھ سے ستار لے لیا۔ اور ایک گیت گایا جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"جس وقت ہم نے اپنے احباب اور غم خواروں سے اپنی طولانی شبِ فراق کا شکوہ کیا تو انہوں نے
داب دیا کہ (افوہ) ہماری راتیں تو نہایت کوتاہ و مختصر ہوتی ہیں اور یہ اس وجہ سے ہے کہ غلبۂ خواب
نے اُن کی آنکھوں کو بہت جلد مدہوش اور بند کر دیا ہے اور ہماری بدنصیب آنکھیں نیند سے آشنا ہی
ہوئیں جس وقت یہ غم فزا رات آتی ہے تو ہم اہل محبت و عشق بیقرار و پریشاں ہوتے ہیں اور وہ
لوگ جن کے دل مسرتوں سے معمور ہیں ہمیشہ شاد و مسرور ہوتے ہیں، اگر انہیں بھی ان مصائب کا
خدانخواستہ سامنا ہوتا جو ہمکو درپیش ہیں تو یقیناً وہ بھی ہماری طرح اپنی ناز و نعم سے معمور خوابگاہوں میں
بیتاب و بیقرار ہوتے"

یہ اشعار سنکر ابراہیم کے دل و دماغ میں کیف و سرور کا وہ عالم تھا کہ ناممکن البیان ہے وہ کہتا
ہے کہ یہ گمان ہوتا تھا کہ سرور و شادمانی کا جوش مکان اور مجھ کو لیکر اڑ جائے گا، مجھے جو کچھ
پریشانی اور اپنے واقعات سے دل گرفتگی تھی سب گویا کافور ہوگئی، پھر ابراہیم نے غلام سے
سوال کیا کہ اب کچھ اور سناؤ کہ تمہارے نغمۂ جاں نواز نے میرے تمام آلام و مصائب کو
فراموش کر دیا ہے، اور میرا دل نعمت کیف و سُرور سے مالا مال ہے۔

غلام نے پھر بسر و چشم کہہ کر ایک نغمہ شروع کیا، جسکا ترجمہ یہ ہے:۔

میرا محبوب مجھے عار دلاتا ہے کہ ہم لوگ تعداد میں کم ہیں تو میں نے اُس سے کہا کہ دنیا میں اچھے
اور شریف لوگ کم ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنی قلت تعداد سے کچھ نقصان نہیں پہونچ سکتا کہ ہمارے
ہمجوار غالب اور عالی مرتبہ لوگ ہیں۔ اور بظاہر تعداد میں زیادہ ہیں۔ وہ اور ان کے ہمسایہ بہت ذلیل
و حقیر ہیں۔ ہم وہ لوگ اور اُس کے افراد ہیں کہ حرب و ضرب ہی کو محبوب جانتے ہیں جس طرح کہ قبیلۂ
عامرہ و سلول والے۔ میدان کارزار میں جان دینا ہی صرف ہمارے لئے قابل فخر و مباہات بات ہے
اور یہی سبب ہے کہ ہماری تعداد کم ہے۔ اور جو بزدل و ذلیل ہیں اُن کی تعداد زیادہ ہوئی تو کیا۔
اور یہی سبب ہے کہ ہمارا شوقِ مرگ ہماری موت کو ہم سے قریب تر کر دیا کرتا ہے۔ ہم خوشی سے
جان دیتے ہیں مگر ان (حریفوں) کی عمریں رفیق اجل سے گھبراتی ہیں۔ اس سے ان کی عمریں
زیادہ ہوتی ہیں"

ابراہیم کہتے ہیں کہ یہ اشعار پھر بار سنکر مجھپر اس قدر مسرت و شادمانی کا غلبہ ہوا کہ نیند آگئی

پریشان اور تھکا ہوا تو تھا ہی ایسا سویا کہ عشا کے بعد آنکھ کھلی، اب میں نے ہاتھ منھ دھویا۔ میں اس سنگی لگانے والے حبشی کی نفاست طبع حسنِ ادب۔ تہذیب و دانائی پر غور اور حیرت کر رہا تھا، پھر میں نے اُسے بیدار کیا۔ میرے ساتھ ایک تھیلی میں بہت سی اشرفیاں تھیں وہ سب کی سب نکال کر میں نے حجام کے سامنے رکھدیں، اور کہا :۔ اچھا خدا حافظ! میں جاتا ہوں، اور چاہتا ہوں کہ یہ ناچیز رقم قبول کرو، اور اپنے تصرف میں لاؤ۔ اگر میں محفوظ اور زندہ بچا اور اس مصیبت سے نجات پائی جس میں مبتلا ہوں تو انشاء اللہ تم کو بہت کچھ صلہ و انعام دوں گا۔

یہ حبشی حجام درحقیقت شریف الطبع، عالی ظرف انسان تھا۔ اسنے جواب دیا۔

حضور والا! ہم ایسے فقیروں کی حضور جیسے سرداروں کے نزدیک کیا قدر ہوسکتی ہے اتفاق زمانہ نے مجھے جو شرف و فخر عطا کیا ہی اُسکی اجرت میں ہرگز نہیں لے سکتا، خدا کی قسم! اگر آپ اسے واپس نہ لیں گے تو ضرور بالضرور خودکشی کرلوں گا۔

ابراہیم کہتے ہیں۔ چار و ناچار وہ تھیلی واپس لے لی، مگر اب وہ مجھکو اس قدر گراں معلوم ہو رہی تھی کہ اس کا بار میرے لیے ناقابل برداشت تھا، غرض میں حجام سے رخصت ہوا اُس کے گھر سے نکلتے ہی میری پریشانیوں اور یاس انگیز خیالات میں پھر زیادتی ہوگئی، اندیشہ و خوف نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا، اور خود میرا ذاتی تجربہ ہی کہ مجرم پر خود بخود خوف و ہراس غالب ہوجاتا ہے، اور یہ خوف و ہراس دماغ میں یہ تخیل پیدا کردیتا ہے کہ گویا ہر شخص اسے دیکھ رہا ہی، ہر متنفس اس سے اور اسکے مکان سے واقف ہے۔ اس کی بدولت کہیں اس کا جی نہیں لگتا۔ اور نہ اسکو کسی صورت سے اطمینان حاصل ہوتا ہی۔ اور اگر کہیں ٹھہر جائے تو سمجھ لو کہ مجبوری و بیکسی ہی، غرض آٹھ روز تک برابر میں رات کی تاریکیوں میں ادہر ادھر مارا مارا پھرتا تھا۔ مجھ کو جو کچھ کرب و تکلیف تھی اُسے کچھ خدا ہی جانتا ہی۔ ایک روز میں پُل (جسر بغداد) کو عبور کر رہا تھا اور یہ پل اس زمانہ میں بغداد ایک عام سیرگاہ بنا ہوا تھا۔ یہ پل وہ مقام ہی جسکی نسبت ابن جہم شاعر لکھتا ہے ؎

عیون المھا بین الرصافۃ والجسر   جلبن الھویٰ من حیث ادری ولا ادری

رصافہ اور جسر کے مابین حسینان عالم (کی سے فریب آنکھیں) لوں میں وہ عشق و محبت کا اثر

پیدا کرتی ہیں کہ میں ہی جانتا ہوں مگر (سچ پوچھو) تو کچھ نہیں جانتا

پُل پر جھگڑا کا وکیا ہوا تھا، کسی قدر کیچڑ اور پھسلان بھی تھی۔ اسی اثنا میں مجھے ایک فوجی افسر نے دیکھا جو میری حکومت کے زمانہ میں میری خدمت میں رہا کرتا تھا، وہ مجھے پہچان گیا اور بولا :۔

آہاہ! یہی تو امیرالمومنین کا مطلوب ہے، یہ کہکر جھپٹا، مجھے بھی اپنی جان شیریں عزیز تھی، وہ گھوڑے تھا اور میں پیدل مگر میں نے اس زور سے دھکا دیا کہ وہ دور جا کر گرا۔ وہ اُٹھ کر پھر میری طرف بڑھا، مگر بہت لوگ اُس کے آس پاس جمع ہو گئے تھے میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور جھٹ وہاں سے چلدیا پل کو طے کر کے ایک راستہ پر ہولیا، تھوڑی دور بڑھ کر دیکھا کہ ایک مکان کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور دروازہ پر ایک عورت کھڑی ہوئی ہے، بحالت یاس میں نے اُس عورت سے کہا :۔

اے معزز خاتون! مجھ پر رحم فرمائیے اور میری جان بچائیے، میں ایک خوف زدہ انسان ہوں مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہے، تم سے پناہ مانگتا ہوں۔

شریف دل خاتون نے کہا :۔ بسر و چشم آیئے، کرم فرمایئے۔ اسنے جھٹ پٹ مجھے ایک بالاخانہ پر پہونچا کر میرے لئے بستر بچھا دیا۔ اور کھانا لائی۔ پھر مجھ سے کہا :۔ آپ مجھ سے اپنا خوف و ہراس دور کیجئے یہاں کسی کو آپ کا علم نہیں ہو سکتا۔

اتنے میں دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی، اسطرح جیسے کوئی گھبرا گھبرا کر کھٹکھٹا رہا ہو، عورت نے جا کر فوراً دروازہ کھولا۔ مینے دیکھا کہ اُس کا شوہر وہی سوار تھا، جسے میں نے پل پر گھوڑے پر سے گرادیا اُس کے سر سے پٹی بندھی ہوئی تھی، اور خون بہ بہ کر کپڑوں پر ٹپک رہا تھا۔ مگر گھوڑا اس کے ساتھ نہ تھا، یہ منظر دیکھ کر میرے حواس غائب ہو گئے میں نے دل میں کہا کہ اب جاں بری دشوار ہے۔

خاتون نے اس آنے والے سے پوچھا :۔ یہ کیا مصیبت پیش آئی تمھیں کسنے مجروح کیا ؟

مجروح :۔ آج ایک بڑی دولت پر ہاتھ مارا تھا، مگر افسوس شکار ہاتھ سے نکل گیا، یہ کہہ کر سارا قصہ سُنایا، شریف عورت نے فوراً ریشم کا کپڑا نکال کر جلایا، اور زخم میں بھر کر پٹی باندھ دی۔ اس کے لئے جلد بستر بچھا دیا کہ آرام سے سو رہے، وہ ابھی کچھ کچھ سویا تھا کہ یہ خاتون اوپر ابراہیم کے پاس آئی اور کہنے لگی :۔

میرے شوہر سے اور جس سے جھگڑا ہوا ہے۔ غالباً وہ تمھیں ہو ؟

ابراہیم - ہاں نیک دل خاتون وہ بدنصیب میں ہی ہوں -

خاتون - خیر آپ کچھ خوف نہ کرو - جب تک میرا شوہر علیل ہی، تم میری حفاظت میں ہو کیونکہ تم میرے مہمان ہو، اور مہمان کی عزت وتعظیم مجھ پر فرض ہی -

ابراہیم کہتے ہیں کہ اب میں مطمئن ہوا، اور تین روز تک اُس شریف وپاک دل خاتون کا مہمان رہا وہ نہایت اعزاز واکرام سے پیش آتی رہی، پھر اُس نے کہا -

میرے شوہر کو اب الحمد للہ صحت ہوگئی ہے - اور مجھے خوف ہے کہ کہیں اُسکو تمہاری یہاں موجودگی کا علم نہ ہوجائے - اور وہ مخبری نہ کردے - لہذا آپ اپنی جان بچانے کی کوئی تدبیر کرو چار ونا چار میں رات تک وہیں ٹھیرا - اور رات کی تاریکی میں زنانہ لباس پہنکر نکلا اور اپنی آزاد کی ہوئی لونڈی کے مکان پر پہونچا - مجھکو یقین تھا کہ یہ ضرور میرے ساتھ ہمدردی کرے گی اور اپنی وفا ومروت کا ثبوت دیگی - وہ بھی مجھے دیکھتے ہی زار زار رونے لگی - نہایت حزن وملال ظاہر کیا - میری سلامتی پر خدا کا شکر ادا کرتی رہی - پھر گھر سے اس انداز سے نکلی کہ گویا میرے لئے بازار سے کچھ لانے کو جارہی ہے، مگر میرا یہ خیال غلط نکلا اور تھوڑی ہی دیر بعد معلوم ہوگیا کہ وہ ارباب حکومت کو میرا پتہ دینے گئی تھی - چنانچہ میری گرفتاری کے لئے ابراہیم موصلی اور چند سوار اور پیدل سپاہی آگئے - وہ ابراہیم موصلی کے ساتھ ساتھ تھی - اندر پہونچکر مجھے ابراہیم موصلی کے حوالے کردیا - اب گویا میں موت کو خود اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا تھا - اس زمانہ میں یہ لوگ مجھے اُٹھا کر مامون کے حضور میں لیگئے مامون نے اسی وقت ایک مجلس شوریٰ منعقد کی اور میں پیش کیا گیا - جس وقت مامون کے سامنے لاکر کھڑا کیا گیا - آداب خدمت بجالایا - اور سلام کیا کہ السلام علیکم یا خلیفۃ المسلمین !

مامون - لا سلمک اللہ (خدا تجھے زندہ وسلامت نہ رکھے) -

ابراہیم - امیر المومنین ! ذرا تامل فرمائیے منتقم (بدلہ لینے والے کو اختیار ہے کہ بدلہ لے یا معاف کردے) اور آپ جانتے ہیں کہ معاف کردینا خدائے پاک کے نزدیک زیادہ محبوب اور منتقیانہ فعل ہے - اور آپ کا عفو تمام معافیوں سے اسی طرح برتر رہے گا - جسطرح میرا جرم تمام جرائم سے بڑھا ہوا ہے اگر آپ کو انتقام لینا ہو تو بجا ہے آپ کو حق حاصل ہے - اور اگر عفو سے کام لیں تو یہ آپ کا فضل واحسان ہوگا - اور انصاف سے فضل واحسان کا مرتبہ بلند وبرتر ہے - پھر ابراہیم نے تین عربی شعر پڑھے

جن کا ترجمہ یہ ہے۔

"میں نے آپ کا بہت بڑا قصور کیا ہے۔ لیکن آپ کی ذات میرے قصور سے کہیں برتر و بزرگ ہے جوش انتقام اسکے نزدیک کوئی بات نہیں، پس آپ خواہ بدلہ لیں یا اپنی حلم و بردباری کی بدولت اس خطا سے درگزر کریں، گو میں اپنے افعال سے شریف ثابت نہ ہوا، مگر آپ اپنی شرافت اور عالی ظرفی کا ضرور ثبوت دیں۔"

ماموں نے نہایت غضب ناک تیوروں سے سر اٹھا کر ابراہیم کی طرف دیکھا، اس نے پھر جھٹ دو شعر اور پڑھے، جنکا منشا، یہ تھا کہ حقیقت میں مینے بڑا قصور کیا ہے، لیکن آپ اس کے اہل ہیں کہ میرا قصور معاف فرمائیں کہ یہ احسان و کرم ہوگا، اور اگر سزا دیں تب بھی عین عدل و انصاف ہے

اب ماموں کا غصہ جذبہ ترحم سے بدل گیا، میں نے بھی تاڑلیا، ماموں نے اپنے بیٹے عباس اور اپنے بھائی ابو اسحاق اور نیز خاندان عباسیہ کے ان ارکان کی طرف دیکھا جو اس وقت دربار خلافت میں موجود تھے اور فرمایا:۔"حضرات! ان کی نسبت اب آپ لوگوں کی کیا رائے ہے"

سب نے بالاتفاق کہا:۔ قتل، قتل، لیکن ماموں کی نگاہ میں ان کا یہ مشورہ ان حضرات کی عادت و اصول کے خلاف تھا جو شاہی درباروں میں کلمۃ الحق کہنے کے عادی ہوتے ہیں۔ جو مَن یقرض اللہ قرضاً حسناً کے مسلک پر چلتے ہیں اور جانتے ہیں کہ انسان کو اس کے اعمال کا بدلہ زمانہ خود دے لیتا ہے۔

اب خلیفۃ المسلمین ماموں نے احمد بن خالد کی طرف دیکھ کر فرمایا:۔

احمد! تم کیا کہتے ہو؟

احمد بڑا ہوشیار، تجربہ کار تھا، وہ خلفاء کے اشارات اور انکی دلی مقاصد کو کنایات سے سمجھ لینے میں خاص کمال رکھتا تھا، اور دربار ماموتی میں اسے بڑا مرتبہ و اعزاز حاصل تھا وہ سمجھ گیا کہ خلیفہ کا مدعا عفو ہے مگر وہ چاہتا ہے کہ کوئی اور بھی ہمنوائی کرے، لہذا اس نے فوراً کہا:۔

یا امیرالمومنین! اگر آپ قتل کی سزا دیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ایسی بہت مثالیں ملتی ہیں کہ ابراہیم جیسے ملزم کے ساتھ آپ جیسے بادشاہوں نے یہی سلوک کیا ہے، اور اگر آپ معاف کر دیں تو میں کوئی ایسی نظیر نہیں پاتا کہ ایسے مجرم کے ساتھ کسی بادشاہ نے یہ کام کیا ہو۔

مامون نے سر جھکا لیا، وہ تھوڑی دیر تک یوں ہی سرنگوں رہا۔ پھر سر اٹھا کر یہ کہا ۔

میری ہی قوم نے اے امیمہ میرے بھائی کو قتل کیا ہے۔ اب اگر میں انہیں اپنے تیر کا نشانہ بناؤں تو یہ تیر مجھی کو لگے گا (کیونکہ اپنے کسی عزیز کو ہلاک کرنا گویا خود اپنے کو ہلاک کرنا ہے)

ابراہیم کہتے ہیں۔ جب میں نے یہ رنگ مجلس اور خلیفہ کا یہ حال دیکھا تو اپنے چہرہ سے نقاب الٹ دیا اور بڑی بلند آواز سے (اللہ اکبر) کا نعرہ لگایا۔ اور میری آواز تکبیر پر تمام حاضرین دربار نے بھی بآواز تکبیر بلند کیا، اور میں نے زوردار آواز میں کہا: خدا امیر المومنین کو بعافیت رکھے اور جزائے خیر دے

مامون: اے چچا! اب آپ کسی بات کا خوف واندیشہ نہ کیجئے۔

ابراہیم: یا امیر المومنین! میرا گناہ اتنا بڑا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا، اور حضور کا عفو و کرم بھی اتنا زبردست ہے کہ میری قوت گویائی اس کے اظہار سے عاجز ہے۔ میں شکرگزار و معترف احسان ہوں۔

ابراہیم نے پھر چند شعر پڑھے جنکا مطلب یہ تھا کہ جس خدائے پاک نے مکارم اخلاق پیدا کئے اُس نے انہیں صلب آدم میں امام ہفتم (مامون جو خاندان عباسیہ کا ساتواں خلیفہ ہے) کے لئے ودیعت کیا تھا۔ اے خلیفۃ المسلمین! تیرے رعب و داب سے لوگوں کے دل معمور ہیں مگر تو اُن کی حفاظت و نگہداشت کرتا ہے۔ میں نے تیری نافرمانی نہیں کی بلکہ اور سرکش و باغی مجھے بڑھاوے دیتے اور ابھارتے تھے، اب تو نے عفو کیا اور ایسا عفو کہ جسکی نظیر نہیں اور عفو بھی کس کے ساتھ، نہ جس کا کوئی سفارشی تھا اور نہ معذرت خواہ تو نے میرے بال بچوں پر رحم کیا اور میری والدہ کی گریہ زاری پر ترس کھایا جو نہایت درد و کرب سے رو رہی تھی۔ معاف کیا۔

مامون :- چچا! اب آپ بالکل نہ گھبرائیے، میں نے آپکا قصور معاف کیا، اور جو کچھ آپ کا مال و اسباب ضبط کیا گیا ہے سب میں واپس دیتا ہوں۔ اور اجازت دیتا ہوں کہ جب تک آپ چاہیں میرے ساتھ رہیں، پھر مامون نے کہا کہ آپ نے تو میرے تمام غصے اور جوش انتقام کو اپنی لطف معذرت سے فرو کر دیا، لہذا میں نے آپ کا قصور معاف کیا۔ اور آپ کے ان بری سفارش کرنے والوں کی تلخ سفارش کا مزہ نہ چکھایا، یہ کہہ کر سجدہ میں گیا اور بڑی دیر تک پڑا رہا۔ پھر اٹھ کر بولا

چچا جان آپ بھی سمجھے کہ میں نے یہ سجدہ کیوں ادا کیا ؟
ابراہیم :- غالباً یہ سجدۂ شکر ہے کہ خدائے پاک نے آپ کو اپنے دشمن دولت وحکومت پر فتح ی اور کامیابی و غالب کیا۔

مامون :- نہیں بلکہ میں ہرگز نہ چاہتا تھا کہ قصور معاف کروں مگر خدائے پاک کا سجدۂ شکر اس لئے ادا کیا کہ میرے دل میں یہ جذبہ رحم پیدا ہوا کہ میں خطا معاف کر دوں اور جو کدورت آپکی جانب سے دل میں پیدا ہوگئی ہے اُسے دور کروں، اب یہ بتائیے کہ اس عرصہ میں آپ پر کیا گزری۔

ابراہیم نے اپنا تمام ماجرا شروع سے آخر تک سُنایا، حجام کا سلوک، فوجی افسر کی جھڑپ پھر اُسکی بیوی کی رحمدلی، اور انتہائی شرافت، پھر آزاد کردہ لونڈی کی عیاری، اور اپنی گرفتاری غرض سب واقعات مفصل بیان کئے، مامون الرشید نے حکم دیا کہ اسی وقت یہ لوگ حاضر کئے جائیں، دربار خلافت کی حکم کی تعمیل میں لوگ دوڑے۔ وہ آزاد کردہ لونڈی گھر میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی کہ میری گرفتاری کا صلہ آتا ہوگا، مگر جب وہ دربار خلافت میں پیش کی گئی تو مامون الرشید نے اس سے پوچھا کہ تو نے اپنے آقا کے ساتھ جو کچھ سلوک کیا ہے۔ اسپر تجھے کس امر نے آمادہ کیا تھا ؟

لونڈی - مال و دولت کے لالچ نے۔

مامون - تیرا کوئی لڑکا یا شوہر ہے۔؟

لونڈی - کوئی نہیں۔

مامون - اسے دو سو دُرّے لگاؤ، اور حبس دوام کی سزا دو۔

پھر فوجی افسر کی طرف مخاطب ہوکر :- تو فوجی خدمت کے قابل نہیں بلکہ حجام ہونے کے قابل ہے، لہذا جو سامان حجام کے لئے ضروری ہے۔ اسکے حوالہ کیا گیا، اور حکم دیا کہ یتامیٰ کی سنگیاں لگانے کی خدمت پر مامور کیا جاتا ہے اور حجامی کی تعلیم دی جائے، پھر اسکی بیوی کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آکر اپنے شاہی حرم خانے میں ایک معزز خدمت پر مامور کر دیا کہ یہ نہایت شریف و عاقلہ عورت ہے مہمات امور کی صلاحیت رکھتی ہے پھر حجام سے مخاطب ہو کر فرمایا، تمہاری جانب سے حقیقی شرافت و عالی ظرفی ظاہر ہوئی ہے، تم نے بڑے ایثار سے کام لیا ہے، ایک لاکھ اشرفی کی پروانہ کی اور اپنے فرماں روائے سابق کی عزت و حرمت

سب کو قربان کردیا، تم فوجی افسر ہونے کی قابلیت رکھتے ہو، پھر حکم دیا کہ فوجی افسر کا مکان اور تمام سامان اسکو دیدیا جائے - اسکے بعد اسے ایک خلعت فاخرہ اور بہت کچھ نقد صلہ و انعام عطا کیا اور ایک ہزار دینار سالانہ اُس کا وظیفہ مقرر کردیا،

حسیاتِ سُہا

محوی صدیقی

حضرتِ سہا فی الحقیقت سپہرِ نظم و نثر کے ایک تابندہ سہا ہیں صنفِ شاعری میں آپ کی جدت طراز ترکیبیں، اور اُن دلکش ترکیبوں کے ساتھ رفعتِ تخیل قوت سامعہ کو بیچین کردیتا ہے، نثر میں بھی آپ کو ممتاز مخصوصیت حاصل ہے سخن فہمی اور معلومات کے لئے آپ کی شرح دیوان غالب (مطالب الغالب) قابل دید ہے جس سے آپ کی نہ صرف اداے مطالب کی قادر الکلامی کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے بلکہ اُس سے نزاکتِ تخیل ذوقِ تفکر اہل بصیرت کی قوت متفکرہ سے خراج تحسین لئے بغیر نہیں رہیگی۔

مجھکو جو شرف نیازمندی ذات گرامی سے حاصل ہے امید ہے کہ "محسن الملک" آپکے افکار زریں سے وقتاً فوقتاً شرف یاب رہے گا :-

جھگڑے ہیں زندگی کے سب، آ اور نہیں مٹا بھی جا
آج تو مرگ ناگہاں، غم سے ہمیں چھڑا بھی جا

جذبِ دروں قلب کو، بے ادب جنوں تو کر
اپنے بھی دل کی کہہ گذر، اور اُسے آزما بھی جا

دل سے فرازِ عرش تک آہ کی راہ راست ہے
درد بھی ایک راز ہے، دل ہی میں کہہ چھپا بھی جا

عیش کی راحتیں نہیں، کرب کی کروٹیں سہی
عمر رواں کے ناز ہیں، چند گھڑی اٹھا بھی جا

میری تباہیوں کا کیا، عشوہ طرازیاں تو ہیں
تجھکو وفا سے کیا غرض، تو تو نظر چرا بھی جا

خوف مزاج یار کا، شوق سے کیوں فزوں رہے
کیا پس و پیش ہے سہا بڑھ کے گلے لگا بھی جا

سُہا

سانحۂ ملیہ

دنیا کے اس دورِ ظلمہ میں جب کہ تمرد وعصیاں کی شقاوت انگیزیاں انتہائی نقطہ عروج پر پہونچ چکی ہیں اور شیطانی قوتوں سے انسانی زندگی کا ہر ہر نفس زخمی و مجروح نظر آرہا ہے، کرۂ ارضی پر بندگانِ خدا کے لئے امن و اطمینان کی سانسیں وبال کردی گئی ہیں، کسقدر مبارک ہیں وہ ہستیاں جن کے دلوں میں انسانی عظمت کا احساس اور خوف الٰہی کی لرزش پائی جاسکے اور کمزور و ناتواں مخلوق کی فریاد و پکار، رحم و ہمدردی کی خفیف سی بھی تڑپ پیدا کرسکے۔ اور پھر کسقدر الم انگیز و جاں گداز ہیں وہ لمحے جب کہ بیکس و ناچار جماعتیں اپنے محسن و ہمدرد کی شفقتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم و مایوس ہونے پر مجبور ہورہی ہوں، اور حوادث و آفات کا طوفان اپنی پوری ہولناکیوں کیساتھ گرد و پیش محیط ہو۔ پس اہل بھوپال کے لئے بھی ۲۴ مارچ ۱۹۳۶ء کی شب انتہائی جگر خراش و درد انگیز شب تھی، جب فرمانروائے بھوپال کا جگرپارہ (محسن الملک جنرل نواب حاجی حافظ محمد عبید اللہ خاں مرحوم) اور انکا ہر دلعزیز ہمدرد و قابل احترام محسن، کشاکش حیات کی الجھنوں سے تنگ آکے پورے چھ ماہ کی طویل و المناک علالت کے بعد دائمی آسودگی کی خاطر غریب و دردمند رعایا کو الوداع کہتا ہوا اس خراب آباد سے رخصت ہوگیا۔ اور تاج بھوپال کا یہ درخشاں گوہر ہمیشہ کے لئے سپرد خاک کردیا گیا۔ آہ! انا للہ وانا الیہ راجعون۔

رعایائے بھوپال کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً محسن الملک کی بےوقت وفات سے جسقدر صدمہ پہونچا ہے اس کا اظہار امکان سے باہر ہے۔ اور طویل عرصہ تک اس صدمے کی تلافی ناممکن و محال ہے۔ مرحوم اُن برگزیدہ اخلاق و خصائل کے مظہر تھے جو آجکل یکسر مفقود و نایاب ہیں، آپ کی زندگی علمی و عملی دونوں اعتبار سے ایک نادر نمونہ تھی، مرحوم کی تعلیم و تربیت کسی جدید تعلیم گاہ کی منت کش نہ تھی بلکہ قدیم مشرقی طریقہ پر ہوئی تھی، لیکن کتب بینی و حصولِ معلومات کی دلچسپی کے سبب سے اسقدر باخبر اور واقف تھے کہ آجکل کے جدید تعلیم یافتہ

اشخاص بھی بدقت ہو سکتے ہیں، عربی، فارسی، انگریزی میں آپکو خاص دستگاہ تھی دربی نکات تحریر تقریر کر سکتے تھے۔ مسلمانوں میں تجارتی ذوق کم رہگیا ہے مگر آپ کو تجارت سے بڑی انتہا دلچسپی تھی اور مختلف تجارتی کاروبار پھیلے ہوئے تھے، یہ تمام اثرات سیاحت یورپ کا نتیجہ تھے جو وہاں کی عملی زندگی و بیداری نے پیدا کر دیے تھے۔ مرحوم کی زندگی کا سب سے روشن حصہ پبلک زندگی کا حصہ تھا جس نے آپ کے بہت سے پوشیدہ صفات اور خصوصیات کو روشن کر دیا اور بھوپال کی تمام رعایا جسے آپ کی ہمدردی کی بے انتہا ضرورت تھی دفعتہً آپ کی طرف متوجہ ہوگئی۔ آپ نے عامہ خلائق کی بہبودی، اسلامی اخوت کے احساس کا سب سے پہلے جو ثبوت دیا وہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے لئے ڈیڑھ لاکھ کی گراں قدر رقم کا عطیہ تھا۔ اس عطیہ کے بعد رعایائے بھوپال کی تعلیم کے لئے ساڑھے چار لاکھ کا مستقل سرمایہ وقف فرمایا جسکی سالانہ آمدنی ۲۸۵۰۰ ہوتی ہے۔ اس عطیہ کا یہ اثر ہوا کہ بھوپال کی جامد فضا میں ایک غیر معمولی بیداری کی لہر پیدا ہوگئی اور تقریباً ایک ماہ تک سپاس گزاری و تشکر کے لئے بھوپال کی مختلف جماعتوں سے وفود و سپاس نامے پیش ہوتے رہے۔ رعایائے بھوپال کے ساتھ آپ کی ہمدردیاں الفاظ و اقوال تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ عملاً بھی آپ نے انتہائی سرگرمی کا اظہار کیا اور آئینی جدوجہد کے ساتھ رعایائے بھوپال کے علمی صنعتی، تجارتی، اصلاح و ترقی کی طرف بھی خاص توجہ فرمائی، اور بہ کمال عجلت بھوپال کے سربرآوردہ حضرات کی عبید اللہ خاں اسکالرشپ کے نام سے ایک کمیٹی مرتب کر کے اُسی وقف کردہ سرمایہ سے تقسیم وظائف کے تمام اختیارات کمیٹی کو عطا فرمائے، چنانچہ یہ اُسی کمیٹی کا نتیجہ ہے کہ آج بھوپالی طلبہ نہ صرف ہندوستانی تعلیم گاہوں میں بلکہ یورپ، مصر، امریکہ میں بھی مصروف تحصیل و تعلیم نظر آرہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مرحوم کی ذات گرامی نہ صرف رعایائے بھوپال بلکہ تمام اسلامی ہند کے لئے ایک بیش بہا نعمت تھی جسے موت کی چیرہ دستیوں نے ہمیشہ کے لئے چھین لیا اور شاید اب مدت دراز تک اس نقصان کا بدل نہ ہو سکے۔ چونکہ محسن الملک کی زندگی پر تفصیلی نظر ڈالنے کے لئے ایک طویل مضمون بھی ناکافی ہے اس لئے ہم محدود سطروں میں گفتگو کرنے سے قاصر ہیں اور اس مختصر تحریر میں ضروری مگر سرسری اشارات پر اکتفا کرنے کیلئے مجبور ہیں، انشاء اللہ آیندہ کسی صحبت میں تفصیلی بحث کی کوشش کریں گے، اللہ تعالے

غریقِ رحمت فرمائے، اور صاحبزادگان والاشان کو جذبات و احساسات پدری عطا فرمائے

(آمین)

سعید رزمی

انوارِ صدق

سمجھ لے دیکھ کر خود نبضِ بسمل دیکھنے والے
دکھائیں کیا تجھے بیتابیٔ دل دیکھنے والے

ہوا ہے خاک اگر، بنجا غبارِ پردۂ لیلےٰ
بگولے کی طرح اُٹھ اُٹھ کے محمل دیکھنے والے

ہنسی سمجھے نہ تھے قلبِ مضطرب پر ہاتھ کا رکھنا
تڑپ کر رو دیے بیتابیِ دل دیکھنے والے

کمانِ غمزہ میں تیرِ نگہ زہ کر چکا کوئی
نوید اے جنبشِ مژگانِ قاتل دیکھنے والے

نہ چھوٹ جائے کہیں رنگِ حنا دستِ حنائی سے
کفِ افسوس ملکر خوں بہادل دیکھنے والے

سوالِ وصل کا بس بس جواب اتنا ہی کافی ہے
ادا سے مسکرا دے روئے سائل دیکھنے والے

نگاہِ ناز کو آخر ادھر سے کیوں تغافل ہے
جگر کی بھی خبر لے او مرادِ دل دیکھنے والے

خدا شاہد یہ تیری بیکسی ہے قابلِ عبرت
فلک کو یاس سے منزل بہ منزل دیکھنے والے

بتانِ شوخ کو دل دیکھنے کا صدق دعویٰ ہے
مرے اشعار تو دیکھیں مرادِ دل دیکھنے والے

صدق جائسی

حقائق و اوہام

حضرت مولنا نیاز فتحپوری کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ، اکثر آپ سے واقف اور آپ کی انشا پردازی کا معترف ہے۔ رسالۂ "نگار" جو موصوف کی ادارت میں بھوپال سے شائع ہو رہا ہے آپ کے مساعی اور قابلیت کا بہترین نمونہ ہے۔ مندرجہ ذیل مضمون موصوف کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے، امید کہ "محسن الملک" ہمیشہ مولنا کی نظر نوازش اثر کا حامل رہے گا:۔
ایڈیٹر

حقائق سے مراد وہ امور ہیں جو حس و عقل کی شہادت کے ساتھ وقوع میں آتے ہیں، اور اس میں حقائق طبیعی، حقائق اجتماعی، حقایق سیاسی، اور حقایق دینی وغیرہ سب شامل ہیں۔ اوہام سے مراد وہ امور ہیں جن کی ایک شکل تو ہے، لیکن اسکی کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ ہمارے خیال و وہم کا نتیجہ ہے۔

حقایق کے بہت سے درجے ہیں جن میں سے ایک درجہ وہ ہے جسے ہم یقینی کہتے ہیں یعنی جو براہین محسوسہ سے ثابت ہے، جیسے نوامیس طبیعت، طلوع و غروب وغیرہ اور مسائل ریاضی وغیرہ۔ دوسرا درجہ اُن احکام عقلیہ کا ہے جو متواتر روایات اور مسلسل تجربات کے بعد حاصل ہوتے ہیں اور ان میں حقایق ادبی، تاریخی اور اجتماعی شامل ہیں۔ مثلاً اگر ہم یہ کہیں کہ "اجسام حرارت سے پھیلتے ہیں اور برودت سے سکڑتے ہیں، یا یہ کہ پانی مرکب ہے، آکسیجن و ہائیڈروجن سے یا یہ کہ ایک مثلث کے تین زاویے، اور دو زاویہ قائم سے بڑے ہوتے ہیں" تو یہ حقائق یقینی شمار کئے جائیں گے اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ "انسان حیوان ناطق ہے، یا یہ کہ فلاں واقعہ فلاں تاریخ کو ظاہر ہوا یا یہ کہ تربیت سے عقل انسانی روشن ہو جاتی ہے" تو یہ حقایق اجتماعی یا سیاسی سمجھے جائیں گے۔

جس طرح حقایق کے مختلف درجے ہیں، اسیطرح اوہام کی بھی بہت سی قسمیں ہیں، ان میں سے ایک قسم تو وہ ہے جو عقل وعلم کے مخالف ہے جیسے بھوت پریت کا اعتقاد یا مخاطبت روح کا یقین کہ یہ سب خرافات میں داخل ہیں، دوسری قسم اوہام کی وہ ہے جن کو حقایق، اجتماعی وسیاسی کے سلسلہ میں ضروری سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ ان کی حقیقت کچھ نہیں ہے، مثلاً ایک شخص کی شادی ہوتی ہے جسکی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ زوجین میں اتحاد قلبی پیدا ہو جائے اور اسکو عقد سے ثابت کر دیا جائے، لیکن اب محفل شادی مرتب کرنا، شامیانے نصب کرنا، روشنیاں کرنا، باجے بجانا، دعوتیں کرنا، یہ سب اوہام ہیں۔ اسیطرح عبادت کی حقیقت یہ ہے کہ خدا کی وجود کا یقین کیا جائے اور اوامر ونواہی کا خیال رکھا جائے، لیکن اس سلسلہ میں مجالس وعظ منعقد کرنا، محفل میلاد قائم کرنا، یا اَور مذہبی اجتماعات کو ترتیب دینا اوہام میں داخل ہے، ایک بادشاہ کسی شخص کو کسی صوبہ کا گورنر بنا کر بھیجتا ہے جس میں حقیقی امر صرف فرمان شاہی ہے جو اس صوبہ کے رہنے والوں کے سامنے پڑھا جائے گا، لیکن دربار کا انعقاد، مخصوص لباسوں میں لوگوں کا جمع ہونا، فوج کا اجتماع اور بہت سی رسمیں، یہ سب داخل اوہام ہیں، اور اصل مسئلہ گورنری سے انھیں کوئی واسطہ نہیں ہے۔

یہ درست ہے کہ نفس عقل صرف حقایق ہی کو قبول کرتی ہے اور اسلئے یہ محل تعجب ہے کہ اوہام کیونکر رائج ہو گئے، لیکن اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ فطرۃ انسانی اوہام کی طرف مائل ہے اور ان میں وہ ایک لذت وانبساط محسوس کرتی ہے، دوسرا سبب یہ ہے کہ کسی وقت بعض حقائق کو ثابت کرنے کے لئے ضرورتاً مراسم کو روا رکھا گیا اور پھر بعد کو ہم ان کے عادی ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان کو بھی حقایق میں داخل کر لیا۔

مثالاً اسی گورنر یا عامل کی تقرری کے مسئلہ کو لیجئے کہ ابتدائی عہد حکومت میں اہل عرب کی عادت تھی کہ خلیفہ جب کسی شخص کو کہیں کا عامل مقرر کرتا تھا تو زبانی یا مختصر تحریر کے ذریعہ سے اس کی اجازت دیدیتا تھا اور قوم اس تحریر کو دیکھ کر بغیر کسی عذر کے اسے اپنا عامل تسلیم کر لیتی تھی۔ لیکن جب حکومت میں ضعف پیدا ہو گیا اور عاملوں نے مظالم شروع کر دیے تو پھر شرائط ولایت کی صراحت اور نفاذ امر کے لئے فوج وغیرہ کے نمائش کی ضرورت لاحق ہوئی، لیکن اسکے بعد یہ ایک رسم ہو گئی اور بلا ضرورت بھی نمود ونمائش کے

مراسم ادا کرنا عادت قرار پا گیا۔ اسیطرح بادشاہ یا امیر کا خیل وحشم کے ساتھ نکلنا، قصور سلطانی پر دربانوں کا کھڑا رہنا، درباروں کا منعقد ہونا، اور اس سے نیچے اتر کر بزم شادی کا انعقاد، محفل ماتم کا برپا ہونا وغیرہ وغیرہ سب اوہام ہیں، یہاں تک کہ ہماری گفتگو، ہمارا کھانا پینا، ہمارا اٹھنا بیٹھنا سب انہیں اوہام سے گھرا ہوا ہے جنکو ہمنے اپنی عادت بنالیا ہے۔

لیکن یہ صحیح ہے کہ اوہام کی پرستش میں تمام قومیں یکساں نہیں ہیں۔ بعض قومیں حقایق کی طرف زیادہ مائل ہیں اور بعض اوہام کی طرف مثلاً انگریز کہ وہ زیادہ تر حقایق کو دیکھتے ہیں اور اوہام کی طرف کم اعتنا کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک انگریز کا مشہور قصہ ہے کہ اُس نے قاہرہ میں ایک خچر کرایہ پر لیا اور اسپر سوار ہو کر عباسیہ کی طرف چلا، خچر والا مخمور تھا اس لئے وہ خچر ہانکتا جاتا تھا اور اُسکے سوار کو گالیاں دیتا جاتا تھا، وہ سمجھتا تھا کہ انگریز عربی نہیں جانتا اس لئے نہایت آزادی سے اسے برا بھلا کہہ رہا تھا اتفاق سے رستہ میں ایک اور انگریز ملگیا جسنے اس سے پوچھا کہ تم عربی جانتے ہو؟ اسنے جواب دیا کہ "ہاں" وہ بولا کہ پھر کیا بات ہے کہ خچر والا تمہیں گالیاں دے رہا ہے اور تم سُن رہے ہو"۔ اُسنے کہا کہ "کیا اس کا گالیاں دینا میرے عباسیہ تک پہونچنے میں عارج ہو سکتا ہے" وہ بولا کہ "نہیں" اسنے کہا کہ "تو پھر کیا حرج ہے اسے گالیاں بکنے دو، میرا مقصود تو صرف عباسیہ تک پہونچنا ہے، پھر جسطرح میں گالیوں کے ساتھ یہاں پہونچگیا ہوں، اسیطرح وہاں بھی پہونچ جاؤں گا۔

ہرچند یہ ایک لطیفہ ہے اور خصوصیت کے ساتھ ایک باشندہ انگلستان کا حال اس سے معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقتاً سارا یورپ وامریکہ اس باب میں مشرق سے افضل وممتاز ہے کیونکہ مشرق میں تو تعلیم یافتہ حضرات بھی جاہلانہ اوہام میں گرفتار ہیں، اور یہاں کی دنیا صرف رسم و رواج کی دنیا ہے۔

پھر جس طرح مختلف قوموں کی حالت حقایق اوہام کے نقطۂ نظر سے متفاوت ہے، اسیطرح ایک ہی قوم کے اندر مختلف زمانوں میں وہم پرستی کے مختلف مناظر نظر آتے ہیں تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک قوم میں جب تک کہ وحشت و بدویت پائی جاتی ہے اُسکے اندر اوہام کم پائے جاتے ہیں مگر جوں جوں وہ ترقی کرتی جاتی ہے، اسی لحاظ سے ان میں اوہام رسم و رواج بڑھتے چلے جاتے ہیں، مثلاً آپ اہل عرب کو دیکھئے ایام جاہلیت اور ابتداے حضارت میں انکے

خطبات اور اُنکی تحریریں بہت مختصر ہوتی تھیں، یہاں تک کہ وہ خلیفۂ وقت سے بھی اس کا نام لیکر خطاب کیا کرتے تھے اور اپنے مدعا کو نہایت سادہ الفاظ میں کہدیا کرتے تھے۔ اسیطرح خلفاء و امراء بھی اپنے مکاتبات میں صرف اصل مقصود کو ظاہر کرتے تھے اور حشو و زوائد کا کہیں ذکر نہ ہوتا تھا، لیکن جب خصائص و مدنیت بڑھی تو ان کی عبارتیں طویل ہونے لگیں، ان کی تقریریں پرشوکت الفاظ کا مجموعہ بن گئیں اور مدعا نہایت پیچدار طریقہ سے ظاہر کیا جانے لگا، صدر اسلام میں جب خلیفہ اپنے کسی عامل کو کوئی تحریر بھیجتا تو وہ اس سے زائد نہیں ہوتی تھی کہ :-

"من عبد اللہ فلاں امیر المومنین الیٰ فلاں عاملہ علیٰ مصر۔ اما بعد......" لیکن ایک زمانہ وہ آیا کہ جب سلطان سلیمان قانونی نے فرانس کے بادشاہ کو خط لکھا تو تقریباً پورا صفحہ صرف اپنی اور اپنے خاندان کی تعریف سے بھرا ہوا تھا۔

اسی طرح جب خلیفہ اپنے کسی عامل کو مقرر کرتا تھا تو صرف اس کا نام معمولی طریقہ پر تحریروں میں یوں درج کر دیتا تھا کہ "قد ولیتک العمل الفلانی" لیکن بعد کو عامل کے نام کے ساتھ القاب و آداب کا طویل طرہ اضافہ کیا جانے لگا کہ "وزیری سمیر المعالی مدیر امور الانام بالفکر الثالث والرای الصائب" وغیرہ وغیرہ۔

دنیائے سیاست میں اوہام و حقائق کے وجود کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ سیادت حقیقی اور سیادت ظاہری کے لئے جداگانہ دو لفظ ہی الگ ہو گئے۔ (ساورنٹی) اور (سُزرینٹی)۔ اسی پر تمام احوال اجتماع کو قیاس کر لینا چاہیئے کہ وہ ابتدائے عہد حکومت میں حقیقت سے زیادہ قریب تھے اور جب حکومت زوال پذیر ہوئی تو اوہام کی طرف ان کا میلان زیادہ ہو گیا۔ اسلئے اگر تم کسی قوم کو دیکھو کہ اسکے اندر سادگی اور حقیقت پسندی پائی جاتی ہے تو سمجھ لو کہ وہ ابھی تک حالت عروج میں ہے اور اگر تم اسکے اندر فضول مراسم اور بیکار تکلفات کو بڑھتے ہوئے پاؤ تو یقین کر لو کہ اس کے اختتام کا زمانہ قریب آگیا ہے اور اسکے لئے ترقی کا سد باب ہو گیا ہے *

نیاز فتحپوری

کلامِ ذکیؔ

حضرتِ ذکیؔ بھوپال کے اُن افراد میں سے ہیں جنہیں فطرت نے خاص ذوق ادب ودیعت فرمایا ہے۔

حضرت ذکیؔ اور مولنا شفقؔ جن کی غزل صفحہ ۳۴ پر درج ہے' ایک ہی آفتاب کی دو روشن شعاعیں" یعنے حضرت سحرؔ مرحوم بھوپالی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں ہمیں امید ہے کہ "محسن الملک" آپ کی بیش بہا ادبیات سے ہمیشہ ممتاز رہے گا۔ ایڈیٹر

صاف دل پھر اُسمیں جلوہ حسن کا پیدا کرے
پاک باطن آینہ میں آئینا پیدا کرے

خاک ہو اور خاک بھی اہلِ نظر کی خاکِ پا
یوں کرے پیدا جو شوقِ کیمیا پیدا کرے

وصل کا ارمان بیجا، ہجر کی کاہش غلط
درد، ایسے درد سے کوسوں جدا پیدا کرے

ہے کھُلا بابِ اجابت صورتِ آغوشِ شوق
ہاں دُعا کے واسطے دستِ دُعا پیدا کرے

بندگی میں بندگی کا حق ادا ہوتا نہیں
مجھ سا بندہ بھی نہ دنیا میں خدا پیدا کرے

وہ مسافر بحرِ ہستی کا ہوں میں حسرت نصیب
جسکی کشتی میں تلاطم ناخدا پیدا کرے

جسکو منزل پر پہونچنے سے بھٹکنا ہو پسند
سیدھے سادھے راستے میں راستا پیدا کرے

درحقیقت تھی اناالحق میں حقیقت کی جھلک
ذوق جو پیدا کرے بے انتہا پیدا کرے

مجھ کو ناسمجھی کی باتوں نے ذکیؔ سمجھا دیا
دل سمجھ کے رنگ میں ڈوبا ہوا پیدا کرے

ذکیؔ وارثی

مریم

افسانۂ ذیل مشہور انگریزی ناولسٹ سر ولیم اسکاٹ کے معرکتہ الآرا تاریخی، رومان (ایبٹ) کے اقتباسات سے مرتب کیا گیا ہے، جسمیں ملکۂ مریم کی قلعۂ لاک لیون میں نظربندی، وہاں سے رہائی اور جنگ لینگ سائڈ کے بعد اسکاٹ لینڈ سے فراری کے حالات نہایت مؤثر پیرایہ میں درج کئے گئے ہیں، یہاں یہ ظاہر کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت (سنہ ۶۷-۶۸ء) ملکۂ موصوفہ کی رعایا کی ایک کثیر اکثریت اُس سے برگشتہ ہو چکی تھی اس برگشتگی کا کچھ تو یہ سبب تھا کہ وہ کیتھولک مذہب کی نہایت مخلص پیرو تھی لیکن خاص وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنے شوہر ڈارن لے، کے قتل کے دو تین مہینہ بعد ہی با تھ ویل سے جو اس قتل کا خاص محرک تھا عقد کرلیا تھا۔ اس بنا پر اکثر لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ ملکہ بھی اس سازش میں شریک تھی چنانچہ روسار اسکاٹ لینڈ کی ایک طاقتور جماعت ملکہ کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی، اور باتھ ویل کو کاربری ہل پر شکست فاش دیکر ترک وطن پر مجبور کیا، ملکہ بھی اس جرم کی پاداش میں قلعہ لاک لیول میں نظربند کردیگئی اور کچھ روز بعد تخت و تاج سے دست بردار ہونے اور اپنے ناجائز بھائی ارل آف میری کو نائب السلطنت تسلیم کرنے پر مجبور کیگئی، چنانچہ یہ وہ وقت ہے جب کہ لارڈ لینسڈے اور سر رابرٹ میلوائل چند ہمراہیوں کے ساتھ ملکہ کو تخت سے دستبردار ہونے پر مجبور کرنے کے لئے جا رہے ہیں۔

(۱)

اُس قدیم قلعہ کو دیکھتے ہی جو جھیل کے وسط میں ایک جزیرہ پر واقع ہے، پیش خدمت کی آنکھوں میں قلعہ ایوبنیل کا جہاں اسنے ایک عرصہ تک پرورش پائی تھی نقشہ پھر گیا۔ لیکن یہ جھیل مقابلتہً ذرا وسیع اور اُس جزیرہ کے علاوہ جسپر کہ قلعہ مذکور ستادہ تھا اور بھی چھوٹے چھوٹے جزیروں سے آراستہ تھے

اسکے علاوہ یہ حصار قلعہ ایوئیل کی طرح ہر چہار جانب پہاڑی چوٹیوں سے محصور ہونے کے بجائے جانب جنوب سلسلۂ لامنڈ کی ایک بلند گھاٹی اور دوسری سمت کینراس کے کشادہ وزرخیز میدان سے گھرا ہوا تھا، رولینڈ گریم نے اس محصور آب قلعہ کو جو زمانۂ حال کی طرح اس وقت بھی ایک وسیع قید خانہ ایک کشادہ صحن دو گول برج اور بعض دوسری معمولی عمارات کو اپنے سنگین آغوش میں لئے ہوئے تھا، نہایت خائف نظروں سے دیکھا، چاروں طرف ہُو کا عالم تھا اور اُن چند پُرانے درختوں کے علاوہ جو اس ہیبت ناک منظر کی تکلیف دہ تنہائی سے پریشان ہوکر یکجا جمع ہو گئے تھے، اور کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی وہ اس ویران و دور افتادہ عمارت پر نظر جمائے اُس محصور ملکہ کی قابل رحم حالت پر، جسے قسمت نے اُس تاریک زندان میں عمر کا باقی حصہ کاٹنے پر مجبور کر دیا تھا، نیز اپنی حالتِ زار پر افسوس کر رہا تھا، اپنی حالت کا احساس ہوتے ہی رولینڈ کو خیال ہوا کہ شاید وہ ایسے ستارہ کے زیر اثر پیدا ہوا ہے جس کا عورتوں اور جھیلوں سے حاکمانہ تعلق ہے، کیونکہ نہ تو اول الذکر ہی کی ملازمت سے اوسے سبکدوشی حاصل ہوتی تھی، اور نہ آخر الذکر کی رہائش ہی سے اُسے چھٹکارا ملتا تھا۔

اب یہ مختصر جماعت جھیل کے کنارے پہونچ چکی تھی اور ایک شخص نے آگے بڑھ کر لارڈ لینڈ سے کا نشان دکھلایا، لارڈ موصوف نے خود بھی نہایت زور سے اپنا بگل بجایا، جسکی سمع خراش آواز نہایت سرعت سے تمام فضا میں پھیل گئی، قلعہ سے بھی ان کے جواب میں جھنڈی دکھائی گئی، اور دو ایک آدمی ایک کشتی جو جزیرہ کے قریب ہی لگی ہوئی تھی کھولنے میں مصروف نظر آئے۔

لارڈ لینڈ سے کا ایک ہمراہی ۔ کشتی کے یہاں تک پہونچنے میں کچھ نہ کچھ وقت ضرور صرف ہوگا، اسلئے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم لوگ شہر میں چلکر........ حضور میں حاضر ہونے سے پہلے ذرا اپنی حالت درست کرلیں۔

لینڈ سے ۔ سر رابرٹ ملوائل، جو آپ کا مزاج چاہے کیجئے، ہاں مجھے نہ تو ان فضولیات کا دماغ ہی ہے نہ فرصت، اس عورت کی وجہ سے مجھے بار ہا گھوڑے دوڑانا پڑے ہیں لہذا اُسے میرے اس بوسیدہ کوٹ اور گرد آلود ویسکوٹ پر جنہیں اس وقت میں زیب تن کئے ہوئے ہوں اور جو اُسکی وجہ سے تمام اسکاٹ لینڈ کی وردی ہوگئی ہے اظہار ناپسندیدگی کا کوئی حق نہیں ہے۔

رابرٹ ۔ آپ کو اس قدر سخت الفاظ استعمال نہ کرنا چاہیئے، اگر اُن سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے تو وہ اس کا خمیازہ بھی اٹھا رہی ہیں۔ اسکے علاوہ ایسی نازک حالت میں جب کہ دنیوی اقتدار و حکومت اُن کے ہاتوں سے نکالی جا رہی ہے کسی شخص کو اس ظاہری عقیدت اور فرماں برداری کے اظہار سے جو ایک خاتون کے شایان شان اور ایک ملکہ کے پیدائشی حقوق ہیں محروم نہ کرنا چاہیئے۔

لینڈسے ۔ سر رابرٹ! میں آپ سے پھر کہتا ہوں کہ آپ جو مناسب سمجھیں وہ کریں، ہاں اپنے متعلق میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری عمر اب اس قابل نہیں رہی کہ اپنے آپ کو مقتدر خواتین کے خلوتگہ ناز کی زینت تصور کروں۔

رابرٹ ۔ اُس ویران و بھیانک برج پر نظر ڈالتے ہوئے ۔ جناب عالی "خلوتگہ ناز" کیا اس سامنے والے "تاریک و بوسیدہ قلعہ کا کہ جو ایک مقید ملکہ کا جیل خانہ ہے۔ جناب نے یہ عمدہ نام تجویز فرمایا ہے۔

لینڈسے ۔ آپ جو مناسب سمجھیں وہ نام رکھ لیں، ہاں میں اتنا جانتا ہوں کہ اگر نائب السلطنت کی یہ خواہش ہوتی کہ ایسا قاصد روانہ کیا جائے جو ایک مقید ملکہ سے گفت و شنید کر سکے تو اُن کے دربار میں ایسے نو عمر عاشق مزاجوں کی کمی نہ تھی جو اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دیکتے اور اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے نہایت جانبازانہ اور سرفروشانہ تقریریں کرتے، لیکن جب انہوں نے اس منہ پھٹ بڈھے لینڈسے کو اس خدمت پر مامور فرمایا ہے تو اُسکے یہ معنی ہیں کہ انہیں خود اس بات کا علم ہے کہ میں اس خطاکار عورت سے اُسی انداز سے گفتگو کرونگا، جو اسکی گذشتہ بے عنوانیوں اور موجودہ صورت حالات کے لحاظ سے لازمی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے خود یہ خدمت اپنے سر نہیں لی ہے بلکہ زبردستی میرے سر ڈالی گئی ہے لہذا اسکی انجامدہی میں صرف اس قدر تکلف اور ظاہر داری سے کام لیا جائے گا جو ایسی خدمت انجام دینے کے لئے ناگزیر ہو یہ کہہ کر لینڈسے گھوڑے سے کود پڑا اور سواری کا قبا اپنے گرد لپیٹ کر کشتی کے انتظار میں جو اب قلعہ سے کنارے کی طرف آ رہی تھی، گھاس پر لیٹ گیا۔ رابرٹ بھی جو گھوڑے سے

اتر چکا تھا بغلوں میں ہاتھہ دیے لب آب ادہر ادہر ٹہلنے لگا، اسکی آنکھیں اکثر بیساختہ قلعہ کی طرف اُٹھہ جاتی تہیں اور چہرہ سے اسکے دلی جذبات کا پتہ چلتا تھا، باقی سب لوگ اپنے اپنے گھوڑوں پر بت کی طرح جمے ہوے تھے، اور ان کے جسموں کو اون نیزوں کیطرح جو سر اٹھائے کہڑے تھے ذرا بھی جنبش نہیں ہوتی تہی۔

جیسے ہی کشتی اُس معمولی گھاٹ کے قریب جسکے پاس یہ لوگ ٹہیرے تھے، پہونچی، لینڈسے فوراً اُٹھہ بیٹھا اور کشتی بان سے کہنے لگا کہ ہمارے اُن ہمراہیوں کے لئے کوئی بڑی کشتی کیوں نہیں لایا۔

کشتی بان ۔حضور عالی! میرے آقا کا حکم ہے کہ چار آدمیوں سے زیادہ قلعہ میں نہ لائے جائیں۔

لینڈسے ۔تیری آقا بہت ہی عقلمند عورت معلوم ہوتی ہے جسے مجہپر بھی بغاوت کا شک ہے لیکن یہ تو بتا کہ اگر ہمارا ایسا خیال ہو تو تجھے اور تیرے ساتہیوں کو غرقاب کرنے کے بعد اپنے ہمراہیوں کو بٹھا کر قلعہ میں داخل ہونے سے کونسی بات مانع ہوسکتی ہے، کشتی بان نے یہ الفاظ سنتے ہی کنارے سے علحدہ رہنے اور فوراً واپس ہونے کا اشارہ کیا۔

لینڈسے ۔کیوں بے گدھے، کیا تو اس سے یہ سمجھا کہ ہم تجھہ احمق کو کوئی ضرر پہونچانا چاہتے ہیں اچھا سُن، تین خدمت گاروں کے بغیر ہم ہرگز نہیں چل سکتے اور سر رابرٹ بھی اپنے ساتھہ ایک ملازم ضرور لیں گے، اب بھی اگر ہمکو لیچلنے میں تجھے اعتراض ہے تو اسکا خمیازہ تجھے اٹھانا پڑے گا، چل آ۔کیونکہ ہم نہایت اہم معاملات طے کرنے آئے ہیں۔ کشتی بان نے بڑے استقلال کے ساتھہ لیکن مودبانہ الفاظ میں عرض کیا کہ اسکو نہایت صریح حکم دیا گیا ہے کہ چار آدمیوں سے زیادہ نہ لائے لیکن اسنے کہا کہ وہ واپس جاکر حکم پر نظر ثانی کی درخواست کرنیکے لئے تیار ہے۔

سر رابرٹ نے کچھہ دیر اپنے خودسر ہمراہی کو عارضی طور پر اپنے ملازمین کی تعداد کم کرنے پر رضامند ہونے کی ناکام کوشش کے بعد کہا، اچھا بھائی کیونکہ اسکے سوا چارہ کار ہی نہیں لہذا تم قلعہ واپس جاؤ اور لارڈ لینڈسے اور اُن کے ہمراہیوں کے لیجانے کی اجازت حاصل کرکے جلد واپس آؤ۔

لینڈسے - اچھا کم ازکم اس ملازم کو جو تیرے آقا کے میہمان کے لئے بطورپیش خدمت بھیجا گیا ہے، اپنے ساتھ لیتا جا (رولینڈ سے مخاطب ہو کر) جلد گھوڑے سے اُتر کر کشتی پر سوار ہو جا۔

رولینڈ - اپنے گھوڑے کا کیا کروں کیونکہ اپنے آقا کو مجھے اسکے متعلق جواب دینا ہوگا۔

لینڈسے - ہم تجھے اس ذمہ داری سے آزاد کرتے ہیں، تجھے آیندہ دس سال تک گھوڑے۔زین لگام کا کوئی کام نہ پڑے گا۔ہاں اگر تو چاہے تو باگ دوڑ اپنے ساتھ لیتا جا، یہ ضرور تیرے کچھ نہ کچھ کام آئیگی۔

رولینڈ - اگر میں یہ جانتا تو ....

رابرٹ - بات کاٹ کر۔ جھوٹ موٹ جھگڑے سے سوا اس کے کہ نہیں کچھ نقصان پہونچے اور کوئی فائدہ نہیں۔رولینڈ نے ان الفاظ کی حقیقت کو محسوس کرتے ہوے باوجودیکہ وہ لینڈسے کے برتاؤ اور گفتگو سے خوش نہ تھا یہی مناسب سمجھا کہ بلا کسی مزید احتجاج کی ضرورت کے سامنے سر تسلیم جھکاتے ہوے کشتی پر سوار ہو جائے، ملاحوں نے پتوار چلانا شروع کیا گھاٹ اور سواروں کی جماعت جو اُسکے قریب مقیم تھے جوں جوں اسکی نظر سے دور ہوتی گئی اسی مناسبت سے قلعہ اور جزیرہ قریب آتے جاتے تھے، تھوڑی ہی دیر میں کشتی ایک گھاٹ پر جسپر ایک پرانا گھنا درخت سایہ فگن تھا، جا لگی کشتی بان اور رولینڈ کنارے پر کود پڑے اور ملاح پتواروں پر سہارا دیکر مزید احکام کی تعمیل کا انتظار کرنے لگے۔

(باقی باقی)

کلام ناصر

افسانہ ہاے عہد کہن یاد ہیں مجھے
زنداں میں نغمہ ہاے چمن یاد ہیں مجھے

بھولا نہیں ہوں امن اسیری کی لذتیں
آغوش ہاے طوق و رسن یاد ہیں سب مجھے

میں اور فریب نزہت صبح دیار غیر
نظارہ ہاے شام وطن یاد ہیں سب مجھے

وہ ابر و برق و باد کی گلشن نوازیاں
طوفان ہاے صحن چمن یاد ہیں سب مجھے

اک عمر ہو گئی ہے کہ ہوں خانماں خراب
ناصر! سلوک اہل وطن یاد ہیں سب مجھے

ناصر اٹاوی

بختیار خلجی

بختیار خلجی پر یہ مورخانہ مضمون بلاشبہ اردو زبان میں اپنے موضوع کا پہلا مضمون ہے یہ قابل قدر مضمون علیگڑھ میگزین کے انگریزی ایڈیشن میں گزشتہ سال کسی نمبر میں شائع ہوا تھا جو مسلم یونیورسٹی کے ایک فاضل استاد (پروفیسر تاریخ مولوی محمد حبیب صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہے) جناب حبیب صاحب جیسا کہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے زبردست عالم ہیں، یہ مضمون آپ کی مورخانہ قابلیت کا ایک نمونہ ہے، اسکو ہمارے دوست مولوی حسن احمل صاحب (ڈماوی) نے اردو کا جامہ پہنایا ہے جو اس سال بی۔اے۔ کے امتحان میں کامیاب ہوے ہیں۔ ہم نہایت شکریہ کے ساتھ اسکو "محسن الملک" میں جگہ دیتے ہیں اور متوقع ہیں کہ محسن الملک ہمیشہ جناب احمل کی نظر نوازشات کا حامل رہے گا :۔

تاریخ ہندوستان کی تیرہویں اور اٹھارہویں صدی سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں وہ تمام اصول بگڑ گئے تھے جنپر قومی زندگی کا انحصار تھا، اس کا نتیجہ ملک کی سیاسی حالت میں فتور اور بلکم ذات کا شخصی فروغ ہوا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسے ہی زمانہ میں بختیار یا امیر علی جیسی ہستیاں پیدا ہوئیں اور انکو نمایاں فروغ حاصل ہوا۔

ملک اختیار الدین بختیار خلجی کی شخصیت، تاریخی نقطہ نظر سے اُن اوسط درجہ کے بادشاہوں میں سب سے زیادہ دلفریب ہے جن کا ذکر محمود غزنی کے انتقال اور علاؤالدین خلجی کے تخت نشین ہونیکے درمیانی زمانہ میں آتا ہے۔ اس کے حالات زندگی درد انگیز اور موثر ہیں، اپنی انتہائی بہادری اور جوش کے اعتبار سے نیز اس لحاظ سے کہ اس میں حکومت کی قابلیت مطلقاً نہ تھی، وہ اس دور کا اچھا نمونہ پیش کرتا ہے جسمیں ترقی کے خیالات کا کہیں پتہ نہ تھا وہ اور اُس کے تمام ہمعصر محض تلوار کے مرد تھے۔ انہوں نے کسی قسم کے قوانین ملک کے لئے وضع نہیں کئے، وہ ایک مستقل نظام حکومت کو غیر ضروری سمجھتے تھے کوئی محکمہ یا رسم اُنکی یادگار باقی نہ رہی کہ آیندہ نسلیں انہیں اچھے یا بُرے نام سے یاد کرتیں۔ اُنکی ہستیاں قابل احترام تھیں، اُس زبردست اور نہ ہارنے والی ہمت کی وجہ سے جس کا پورا پورا ثبوت

انھوں نے اپنے غیر معمولی مقاصد اور خواہشات کے پورا کرنے میں دیا۔ اس مستقل مزاجی یا بے دردی کی بدولت جس سے وہ مقتولین کی نعشوں پر چڑھنے اور چلنے میں تکلف کرتے تھے نیز اپنے غیر حقیقی کارناموں اور ساتھ ہی غایت درجہ کی ناکامی کی وجہ سے اُن کے کارہائے نمایاں بھی گویا نقش برآب تھے۔ آیندہ نسلیں ان سے بالکل بے بہرہ ہیں اور ان سے کوئی مفید سبق حاصل نہیں کر سکیں۔

بختیار خلجی سلطنت غور میں صوبۂ گرمسیر کے ایک اوسط درجہ کے خاندان کا فرد تھا، ایک مورخ لکھتا ہے کہ "وہ تیز طبع، باحوصلہ، نڈر، بہادر، عقلمند، تجربہ کار تھا، اور قدرت نے قسمت آزمائی کے لیے اسے پیدا کیا تھا، اور واقعی اسکے علاوہ وہ کچھہ اور ہوا بھی نہیں، قاعدہ ہے کہ عروج حاصل ہونے سے قبل آدمی کو مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، چنانچہ بختیار کو بھی ایسی مشکلات کو زیر کرنا پڑا۔ وہ سلطان معز الدین غوری کی فوج میں بھرتی ہوگیا تھا مگر وزیر جنگ نے بربنائے نالائقی نکالدیا، اسکے بعد اس نے دہلی کی فوج میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر وہاں بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ کسی امیر کی ملازمت اختیار کرنا گو کسرِ شان تھا مگر بختیار نے مجبوراً اُسے برداشت کیا، اور ہزبر الدین حسن حاکم بدایوں کے یہاں عارضی طریقہ پر ملازم ہوگیا پھر وہاں سے علٰحدہ ہوکر ملک حسام الدین گورنر اودھ کے ہاں چلاگیا اور اب وہ ترقی کی سیڑھیاں جلد جلد طے کرنے لگا اعلیٰ قسم کے اسلحہ اور گھوڑے اُس کے پاس تھے، اور سینہ میں ایک مضبوط دل تھا اور دل میں ایک ترقی کرنے کی نہ دبنے والی خواہش، ادھر ادھر نظر دوڑانے سے اسکو اپنے صلح پسند صوبۂ بہار کے پڑوسیوں میں اپنی امیدوں اور خواہشات کے پورا کرنے کا موقع ملگیا، اور صوبۂ بہار پر جتنے حملے اُس نے کیے سب بہت پُرزور و کامیاب تھے اُس کی شہرت چار دانگ ہند میں پھیل گئی اور جوق جوق سپاہی اُسکے فاتحانہ جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے۔ اب اسکی شخصیت ہندوستان میں ایسی نہ تھی جسے آسانی سے نظر انداز کیا جاسکے۔ اضلاع کمپالہ اور پٹیالہ اسکو حکومت کے لئے دیے گئے اور قطب الدین ایبک نے اس بہادر سپہ سالار کو جسے اُسکے وزیر جنگ نے سواروں میں بھی بھرتی کرنے سے انکار کردیا تھا، ایک خلعت فاخرہ عطا کیا۔

غالباً اپنے زمانۂ ترقی کے دوسرے یا تیسرے سال میں بختیار نے اُس حیرت انگیز حملہ سے جسمیں اُس نے بہار کے ایک دار العلوم پر قبضہ کیا تھا، دوست دشمن، سب کو متحیر کردیا۔ اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو واقعہ یہ بتاتا ہے کہ بختیار اور اُسکے دو سو بہادر ایک عمارت کے اندر گھس پڑے

جو بظاہر قلعہ معلوم ہوتا تھا، مگر جب وہاں کے لوگوں کو قتل کر چکے تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی، کیونکہ مقتولین صرف سن رسیدہ برہمن تھے، جنکے سر منڈے ہوئے تھے، قلعہ میں اگر کوئی خزانہ تھا تو کتابوں کا ایک عظیم الشان ذخیرہ، جنکو سمجھنے اور سمجھانے والا اب کوئی باقی نہ رہا تھا، منہاج السراج مصنف طبقات ناصری نے اس مہلک حادثہ سے متاثر ہوئے بغیر اور اس واقعہ کی اہمیت کا احساس نہ کر سکے لکھا ہے کہ کُل قلعہ ایک مدرسہ تھا، یہ فتح ابھی تازہ ہی تھی کہ بختیار قطب الدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔

اتنی نفرت بہت کم چیزوں سے ہوتی ہے جتنی کسی تیز طبع اور بہادر ساتھی سے، لہذا دربار دھلی کے امرا اس نئے رقیب کو بہ نظر حقارت دیکھنے لگے، صورت حال لطف سے خالی نہ تھی، فاتح بہار میں نہ تو صلاحیت مزاج تھی اور نہ وہ تربیت یافتہ اور شائستہ تھا، اوسکے ہاتھ نیم وحشی بندر کے مانند بڑے لمبے لمبے اور قوی تھے، خدا کی قدرت کہ جو شخص ۳ سال پہلے ایک معمولی سوار ہونے کی کوشش کر رہا تھا وہ اب امرا کے اعلیٰ طبقہ میں شمار کیا جاتا تھا، ایک مرتبہ قطب الدین نے قصر سفید میں باعام منعقد کیا، تو بختیار کے دشمن موقع پاکر ایک مست ہاتھی لے آئے اور کہا کہ تمام ہندوستان میں کوئی جانور ایسا نہیں جو اس کا مقابلہ کر سکے۔ قطب الدین نے بختیار کی طرف دیکھا، اس وقت اگر کوئی اور ہوتا تو عقلمندانہ طریقہ پر کوئی بات کہکر ٹال دیتا مگر بختیار سے زیادہ مست کون ہو سکتا تھا، وہ صحن میں گیا اور اپنی تلوار سے اسقدر شدید ضرب ہاتھی کی پیشانی پر لگائی کہ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا، یہ جواب تھا جو اُسنے دیا۔ اُسکے دشمنوں کی ندامت قابل دید ہوگی جب کہ اسکی تعریف میں چاروں طرف سے شور بلند ہوا ہوگا۔ قطب الدین نے بہت کچھ زر و جواہر اُسکو دیا لیکن اُس نے وہ تمام دولت اپنے ہمراہیوں میں تقسیم کر دی، گو وہ شائستہ اور مہذب نہ تھا مگر شجاعت و بہادری کے ساتھ سخاوت اور دریا دلی میں کسی سے کم نہ تھا، قطب الدین کے قابو میں وہ آنے والا نہ تھا، قطب الدین نے ایک فرمان اسکو دیا جسمیں حکومت بنگالہ اُسکو دیگئی تھی اور وہ بنگالہ روانہ کر دیا گیا۔

اس عطیہ سے نہ قطب الدین کی گرہ سے کچھ گیا نہ بختیار کو کچھ ملا اسلئے کہ بنگال دوسروں کے قبضہ میں تھا اور قطب الدین کو اُسکے دینے کا کوئی حق نہ تھا، ہاں اگر بختیار اسکو فتح کر لے تو وہ یقیناً اُسکا ہو جائے گا، اس بیکار فرمان کو لیکر اور عدم کو وجود میں لانے کا تہیہ کر کے وہ روانہ ہو گیا۔

بنگال میں راے لکشمن اسی برس سے حکومت کر رہا تھا اور ہندو اسکو اپنا خلیفہ تصور کرتے تھے دہلی کے متقی اور پرہیزگار قاضی صاحب اسکے متعلق لکھتے ہیں کہ معتبر اشخاص کا بیان ہے کہ رای لکشمن نے آجتک کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کی، خدا تعالیٰ اس کا کفر اسکے عدل کے عوض معاف کر دے جو شخص بھی اس کے پاس کوئی غرض لیکر جاتا تھا خالی ہاتھ نہ پھرتا تھا۔ راے لکشمن کے دنیا بھر میں صرف دو دشمن تھے، ایک بختیار، دوسرا ستارے، ستاروں نے پیدائش کے پہلے ہی سے اسپر حملے کرنا شروع کر دیے تھے، جب راے لکشمن کے باپ نے اس دار فانی کو خیرباد کہا اسوقت وہ بطن مادری میں پرورش پا رہا تھا، لہذا تاج سلطنت بطن مادری پر رکھا گیا اور تمام امرائنے باقاعدہ اظہار اطاعت وفرماں برداری کیا، جب پیدائش کا وقت قریب ہوا تو نجومیوں اور برہمنوں نے اس وقت کو منحوس بتایا اور کہا کہ وہ اگر اس وقت پیدا ہوا تو کبھی بادشاہ نہ ہو سکے گا، لیکن ایک بے نظیر ہندو ماں کے سامنے نجومیوں اور ستاروں کی کچھ پیش نہ گئی ملکہ نے حکم دیا کہ مجھے پاؤں باندھکر الٹا لٹکا دیا جاے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب وہ منحوس ساعت گزر گئی تو ملکہ اتاری گئی، راے لکشمن فوراً ہی پیدا ہوا لیکن ملکہ اس سخت تکلیف کے باعث جاں بر نہ ہو سکی۔

اسی برس تک نجومی اور ستارے سب خاموش رہے، مگر بختیار کے صوبۂ بہار کی درسگاہ فتح کر لینے کے بعد بختیاریوں نے پھر حملے شروع کئے نجومیوں نے راے سے عرض کیا کہ ہماری مقدس کتاب میں لکھا ہے کہ ترک اس سلطنت کو فتح کرینگے اور وہ وقت بدقریب آگیا ہے، اس سال انہوں نے صوبۂ بہار فتح کیا ہی، اگلے سال وہ بنگالہ پر ضرور قابض ہو جائیں گے۔ راے نے اس بناپر کہ یہ متقدمیں کی پیشین گوئی تھی اسپر یقین نہ کیا اور زندگی کی اس پرخطر منزل پر بھی اس نے منکر ہونا قبول کیا، حالانکہ ذراسی رشوت سے مقصد حاصل ہو جاتا اور ستارے اسکے موافق ہو جاتے۔

راے نے برہمنوں سے دریافت کیا کہ تمہاری کتابیں فاتح کا حلیہ کیا بتاتی ہیں، وہ بختیار کے حلیہ سے واقف تھے لہذا انہوں نے بتا دیا کہ جب وہ شخص بالکل سیدھا کھڑا ہوتا ہے تو اس کی انگلیوں کے سرے گھٹنوں سے نیچے پہونچتے ہیں، راے نے اپنے جاسوسوں کے ذریعہ سے اسکی تصدیق کرائی، بختیار جنگ کی تیاریاں کر رہا تھا مگر راے نے محض برہمنوں کی پیشین گوئی پر بنگالہ سے چلا جانا پسند نہ کیا، ہندو مذہب کے محافظین اور سرپرست اس کشمکش و پیچ میں تھے کہ راے کا ساتھ دیکر

حملہ آور کو شکست دینا چاہئے یا نہیں، راے کا ساتھ اور حملہ آور کو شکست دینا گویا خود اپنی پیشین گوئی کو غلط ثابت کرنا تھا اس لئے اپنی پیشین گوئی کو ثابت کرنے کے لئے انہوں نے خوفناک افواہیں مشہور کیں اور دارالخلافہ ندیاد کو انکی کل جماعت نے ترک کر دیا، مہاجنوں اور سوداگروں نے ان کی تقلید کی اور صوبہ جات کے قصبوں میں جاکر آباد ہو گئے۔ مگر راے ان باتوں سے متاثر نہ ہوا اور استقلال کے ساتھ حملے کا انتظار کرنے لگا۔

ایک دن بختیار مع اٹھارہ سواروں کے ندیاد میں داخل ہو گیا اور کسی نے مزاحمت نہ کی، اسلئے کہ اس میں کوئی ظاہراشان نہ تھی، اور اگر کسی نے پوچھا بھی تو کہدیا گیا کہ راے کی فوج میں چند گھوڑے فروخت کرنا ہے۔ وہ باآسانی بازار سے نکل گیا اور کسی نے یہ بھی نہ دیکھا کہ اسکے ہاتھ غیر معمولی طریقہ پر لمبے ہیں۔ محل کے دروازہ پر پہونچکر اس نے تلوار میان سے نکال لی اور محافظین کو قتل کیا۔ اس وقت راے طلائی و نقرئی ظروف میں کھانا کھا رہا تھا کہ دروازہ پر شور سنائی دیا، تھوڑے ہی عرصہ میں تمام شہر میں ہل چل مچ گئی۔ قبل اسکے کہ وہ یہ تحقیق کر سکے کہ کیا واقعہ ہوا، بختیار محل میں گھس آیا، اور قتل و خون شروع ہو گیا، راے اس خلاف امید اور اچانک حملہ سے حیران ہو کر چور دروازہ سے ایک کشتی میں سوار ہو کر دریا کو عبور کر گیا، یہ اسکی غلطی تھی، شہر کے لوگوں نے محل کا محاصرہ کر لیا تھا اسکو ان کا ساتھ دینا چاہئے تھا۔ بختیار مردانہ وار محل میں رہا اور محاصرین کا مقابلہ کرتا رہا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد بختیار کی اور فوج آگئی، شہر پر قبضہ کر لیا، اور گرد و نواح کے مقامات پر حکومت قائم ہو گئی۔

راے مشرقی بنگالہ میں چلا گیا اور اپنی وسیع سلطنت کے اس حصہ میں حکومت کرتا رہا، بختیار اس فتح سے سیر ہونے والا کب تھا، حکومت اور رعایا پروری سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ ان لالچی لوگوں کی طرح تھا جو ہر وقت کسی نہ کسی شے کو اپنے قبضے میں لانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ قسمت دل آویز فریبوں سے اسے تباہی اور بربادی کے عمیق غار کی طرف لے جا رہی تھی۔

بنگالہ کے شمال میں کوہ ہمالیہ کی دوسری جانب ملک تبت ہے، بختیار نے اسکو فتح کرنے کا عزم بالجزم کر لیا۔ اس مہم پر جانا ایک مجنونانہ حرکت نہیں تو کیا تھی، لیکن تازہ فتوحات نے اسکو ازخود رفتہ کر دیا تھا وہ بغیر نتائج کو سوچے اور اپنی طاقت کا اندازہ کئے ہوئے روانہ ہو گیا۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ تبت اور صوبہ لکھنوتی کے مابین پہاڑیوں میں تین قومیں آباد ہیں، کچھ، پنچھ، اور ستھارن ان کے چہرے

ترکوں سے ملتے ہیں، وہ مختلف زبانیں بولتے ہیں، جو ہندوستان وتبت کی زبانوں کے درمیان
کی زبان کہی جاسکتی ہے، فرقہ تچہ کے ایک نومسلم سردار کی رہنمائی میں بختیار دس ہزار سوار لیکر
ان نامعلوم لوگوں اور بنی نوع انسان کے ان فرقوں کو جو ان سے بھی آگے آباد تھے فتح کرنے کیلئے
شمال کی جانب بہت سی منزلیں طے کرکے وہ ایک شہر مار دہم نوب پر پہونچا جو دریای برہمپتر
کے کنارے واقع ہے، یہاں سے مشرق کی جانب دس روز کی مسافت طے کرنے کے بعد اسے ایک
پُل ملا، جس سے وہ مع فوج کے دریا کو عبور کرکے دوسری جانب پہونچگیا، اور اس پل کی حفاظت
کیلئے ایک خلجی اور ایک ترک کی امیر کو چھوڑگیا۔ یہاں رائے کامروپ کے فرستادہ قاصد اسکو ملے، جنہوں نے
رائے کی جانب سے یہ درخواست پیش کی کہ حملۂ تبت کو دوسری سال پر ملتوی کردیا جائے اُس وقت
وہ خود معہ اپنی تمام افواج کے مسلمانوں کی مدد کرے گا، مگر بختیار اس التجا کو خاطر میں نہ لاکر بڑھا
چلا گیا، دیوکوٹ اور بچگوں کے درمیان میں وہ اپنے ایک قدیم ملازم کا میہمان ہوا جو بنگال میں
تبت سے گھوڑے فروخت ہونے کے لئے بھیجا کرتا تھا، اس سے جو خبریں ملکی حالت کے متعلق
معلوم ہوئیں وہ بہت حوصلہ افزا تھیں، اس کے بیان سے معلوم ہوا کہ آگے پندرہ منزل تک
راستہ ناہموار پہاڑی ہے مگر اس کے بعد ہموار ہوگیا ہے، ملک بہت خوشحال اور آباد ہے وہاں کے
لوگ منگول اور ترکی نسل سے ہیں۔ راستہ میں جب پہلے ہی گاؤں سے مقابلہ ہوا تو بختیار پر دشمن کے
جوہر کھل گئے صبح سے شام تک جنگ جاری رہی اور مسلمانوں کو نقصان عظیم کے بعد پیچھے ہٹنا پڑا
رات کو قیدیوں سے استفسار پر معلوم ہوا کہ پانچ فرسنگ کے فاصلہ پر ایک مقام کرم تین ہے
جہاں تین سو پچاس ہزار بدھ مذہب کے ترک رہتے ہیں، ان کے اسلحہ تیر وکمان ہیں جب سے
انہوں نے مسلمانوں کے حملے کی خبریں پائی ہیں، اسیوقت سے مدد بہم پہونچانے کے لئے قاصدوں کو
روانہ کردیا ہے، بہت غور وخوض کے بعد بختیار نے واپسی کا فیصلہ کیا اور اسکے سوا چارہ ہی کیا تھا،
دشمن نے تمام ملک اُجاڑ کر دیا تھا اور یہاں تک نوبت پہونچ گئی تھی کہ پندرہ روز تک مسلمان فوج کو
ایک گھاس کا تنکا اور سیر بھر دانہ تک میسر نہوا، برہمپتر کے پُل پر پہونچ کر اُسے معلوم ہوا کہ وہ مسمار
کردیا گیا ہے، وہ دونوں امراء جو مقرر کئے گئے تھے آپس میں لڑ بیٹھے اور چھوڑ کر چلے گئے، ان کے
جانے کے بعد کامروپ نے پل کو مسمار کرادیا، آخر کار بختیار نے ایک مضبوط مندر میں پناہ لی جسمیں

چاندی اور سونے کے بت کثرت سے تھے، کامروپ نے اس مندر کا محاصرہ کر لیا اور گرد و نواح کے ہندؤں کو بلا کر چاروں طرف بانسوں کا کٹھرا بنا دیا، اس خوف سے کہ کہیں چوہوں کی طرح پنجروں میں گرفتار نہ ہو جائیں، مسلمان دیوانہ وار باہر نکل پڑے اور محاصرین کے صفوں کو چیرتے پھاڑتے دریا کے کنارے پہونچ گئے، ہندؤں نے تعاقب کیا، ایک سپاہی نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈالدیا اور بہت دور تک پیرتا ہوا چلا گیا، اسپر مسلمان لشکر نے ایک خوشی کا نعرہ لگایا اور یہ خیال کرکے کہ دریا پایاب ہے سب نے گھوڑے ڈالدیے مگر دریا پایاب نہ تھا اور ہندوں نے اس کنارے پر قبضہ کرکے واپس آنے سے روکدیا تقریباً سو آدمی اُس کنارے پر پہونچ سکے، باقی سب غرقاب ہو گئے، دیوکوٹ واپس آکر بختیار اپنی ناکامی کے صدمہ سے بیمار ہو گیا۔ وہ کبھی گھر سے باہر نہ نکلتا تھا اسلئے کہ وہ سوچتا تھا کہ اسنے اپنی عزت اور فوج کو خاک میں ملا دیا، اسے بڑی ندامت ہوتی تھی جب وہ اپنے سپاہیوں کی بیواؤں اور بچوں کو دیکھتا تھا وہ اسکو گالیاں دیتے تھے۔ وہ کبھی اصول سے نہ لڑا، اور ہمیشہ اُس نے ذاتی فائدہ ملحوظ رکھا اب اُس کے تمام حوصلے اور امیدیں پست ہو گئے اور وہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو کر کچھ روز کے بعد مرگیا۔ یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ علی مردان خاں خلجی اسکے بستر کے قریب گیا تھا، حالانکہ اسکے پاس جانے کی تین روز قبل سے کسی کو اجازت نہ تھی، اور اسکو قتل کر دیا۔

حسن احمل بی-اے

رنگِ شفق

شباب آتے ہی شوخی پر حیا کا پڑ گیا پردہ
وہی تو ہے ترا کل تک کسی سے بھی نہ تھا پردہ

نمایاں شانِ قدرت سے نہاں رنگِ حقیقت ہے
نئی بے پردگی ہے آپکی سب سے نیا پردہ

بجا ہے حسرتِ دیدار پر اب فاتحہ پڑھنا
نگاہِ شوق کا روکے ہوئے ہے راستہ پردہ

شکستہ دل کی آہیں کیوں نہ ناسازِ طرب ہوتیں
صدا اونچی نہیں دیتا کبھی اُترا ہوا پردہ

منور ہو گئے جب دیدۂ دل نورِ وحدت سے
تو میرے اور اُن کے درمیاں سے اُٹھ گیا پردہ

مرا دستِ جنوں اب جامۂ ہستی سے اُلجھا ہے
خموش اے ناصحِ مشفق کجا دامن، کجا پردہ

پناہِ دامنِ رحمت ہے، اور ساری خدائی ہے
وہی پردہ میں ہے جس کا شفق رکھلے خدا پردہ

عورت

عورت ! ایک گلِ شاداب، اور شمیمِ جاں فزا ہے، یہ ایک نغمۂ شیریں مفرحِ روح ہی، اس کے آواز دلکش میں سرور و بہجت کی ترنم ریزیاں ہوتی ہیں، اسکے نرگسِ شہلا میں ابتہاج و شادمانی کی باؤ احمر پائی جاتی ہے، اسی خوش رنگ فانوس سے کاشانۂ تمنا میں نور بیزیاں رہتی ہیں اسیکے بشاشت آفریں انداز مرد کے دورانِ حیات کو شگفتہ رکھتے ہیں۔

معاشرت کی دلفریب بنیادیں اسی کے نازک ہاتھوں نے کھودی ہیں، اور تمدن کے مرقع میں اسی کی نازک انگلیوں نے رنگ بھرے ہیں۔

لیکن بعض حضرات ! اسی نکہت بہار کو بے وفا، بے حس، پیکرِ تخریب معاشرت، اور خدا جانے کیا کیا کہتے اور سمجھتے ہیں !!

کیا یہ افکار صحیح ہیں ؟ کیا یہ فیصلہ منصفانہ ہیں ؟ آؤ آج ہم چند مناظر کی فضا میں ان صداؤں کی آواز بازگشت کو معدوم کردیں۔

ہم اس وقت حضرت مسیح کی ولادت سے پیشتر کارو ڈا میں ہیں جہاں حکیم سنیکا کی ولادت، اُسکے خاندان میں عشرت ریزیاں، اور لطف انگیزیاں پیدا کر رہی تھی۔

تھوڑے عرصہ میں ہم اسکو پایۂ تخت روم میں دیکھتے ہیں جہاں وہ شاہزادہ نیرو کو سبق دیرہا ہے، ۵۴ء میں شاہ کلاڈیس فوت ہوتا ہے، اور شہزادۂ یزد تختِ سلطنت پر جلوہ گر ہوتا ہے اور سنیکا وزارت کے ممتاز عہدہ تک پہونچ جاتا ہے۔ لیکن انقلابِ دہر کی ستم رانیاں اسکی قسمت پر ضرب لگاتی ہیں، اُسکے لئے سازشوں کے جال بچھائے جاتے ہیں اور بغاوت کے الزام میں اسکو سزائے موت کا حکم سنا دیا جاتا ہی۔

مستقل مزاج سنیکا جلاد کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتا ہے اسکی رگیں کاٹ دی جاتی ہیں اور خون کا فوارہ حسرت و یاس کے نقوش زمین پر کھینچنے لگتا ہی،

اُسکی رفیق زندگی "پلینا" کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہو جاتی ہے، اپنے شوہر کے دائمی مفارقت کا تخیل، اُسکے دماغی سکون کا تختہ الٹ دیتا ہے، اس کے کلیجہ میں حسرت و یاس کی پھانسیں چبھ جاتی ہیں، اور وہ بھی مونس زندگی کے ساتھ جانے کے لئے اپنے ہاتھوں کی رگیں کھلوا دیتی ہے، خون جاری ہو جاتا ہے، اور وہ بیہوش ہو کر گر جاتی ہے !!

"پیٹس" کے ہاتھ میں ایک خونفشاں خنجر دیکر تخت حکومت کی طرف سے یہ جابرانہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے سینہ میں بھونک لے۔

اُسکی رفیق زندگی "ایریا" کو یہ خوفناک اطلاع ملتی ہے، اُسکے کلیجہ میں نیر لگتا ہوا اُس پیکر وفا کے دل و دماغ میں طوفان اضطراب اُٹھتا ہے اور یہ فوراً اس غرض سے روانہ ہو جاتی ہے کہ اپنے حبیب کا آخری نظارہ کرلے اور جس طرح وہ مونس حیات رہی ہے مسافرت کی حالت میں بھی رفیق سفر رہے۔

اُس کے عزیز و اقارب اس خوفناک عزم کو دیکھ کر روکتے ہیں، اس کا داماد کہتا ہے کہ اگر مجھے بارگاہ سلطانی سے سزا موت کا حکم دیا جاوے تو کیا آپ اپنے جگر گوشہ دختر کی خودکشی جائز سمجھینگی؟ وہ شہید محبت جواب دیتی ہے کہ بیشک اگر اس کا دور حیات تمہاری مہربانیوں کا رہین منت رہا ہے تو اس کا یہ اولیں فرض ہونا چاہئے۔

جب اُسکے مضبوط ارادہ میں لغزش نہیں ملتی تو بیدردی کے ساتھ کمرہ میں بند کردی جاتی ہے وہ اس عمل سے بے چین ہو جاتی ہے، دیوانہ وار اپنے نازک سر کو دیوار کے پتھروں سے ٹکراتی ہے اور شیون و فریاد کے ساتھ کہتی ہے کہ "اے جفا کارو کمرہ کھول دو، یاد رکھو کہ تم مجھے کو عزت کی موت سے روک سکتے ہو، مگر ذلت کی موت سے ہرگز نہیں روک سکتے، تھوڑی دیر میں میرا سر پاش پاش ہوگا، اور میری روح ان سنگلاخ دیواروں کو توڑتی ہوئی اپنے رفیق زندگی سے جا ملیگی۔

مجبوراً کمرہ کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے اور وہ مبہوت اُس مقام پر پہونچ جاتی ہے جہاں کہ اس کا محبوب شوہر اپنے ہاتھ میں خنجر لئے ہوئے کھڑا ہوتا ہے، اور جان عزیز اسکے جنبش دست کو روک رہی ہوتی ہے۔ "ایریا" اپنے پیارے شوہر کے ہاتھ سے خنجر چھین لیکر نہایت استقلال سے اپنے

سینہ میں مار لیتی ہے اور وہی خونچکاں خنجر اپنے عزیز شوہر کے ہاتھ میں دیکر اسکی زبان سے یہ آخری الفاظ سنائی دیتے ہیں کہ "پیارے شوہر اس میں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی"

لچھمن جی کا جیش سیلاب کی طرح آگے بڑھتا ہے، راون کی طرف سے اس کا بیٹا میگنا اپنے لشکر جرار کی کمان کرتا ہوا مقابلہ میں صف آرا ہوتا ہے، ہنگامہ رستخیز سے دشت وجبل گونج اٹھتے ہیں اور کرۂ ارضی لرز جاتا ہے، بالآخر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میگنا لچھمن جی کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے، اسکی غمخوار زندگی "بر میلا" کو جب یہ اطلاع ملتی ہے تو اس کا جگر اس سانحہ سے شق ہو جاتا ہے، اسکے نازک اور خوبصورت ہاتھ بجائے مشاطہ گری کے اپنے لانبے اور سیاہ بالوں کے نوچنے میں مصروف ہو جاتے ہیں، آیندہ زندگی کی امیدوں اور تمناؤں کا ہجوم دیکھکر اس کا مجروح دل تڑپنے لگتا ہے، اس کے سینہ سے ایک آہ نکلتی ہے، آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں اور حسرت ویاس کا تلاطم اس قدر ہوتا ہے کہ وہ بیہوش ہو جاتی ہے۔

چند گھنٹوں میں مرگھٹ کے اندر ایک ہوش ربا نظارہ پیش ہوتا ہے، میگنا کی خوں آغشتہ نعش چتا میں لاکر رکھدی جاتی ہے، اور وہ پروانۂ محبت جسے ہم بیہوش چھوڑ آئے تھے چتا میں داخل ہوتی ہے اور اپنے شوہر کا سر زانو پر رکھ لیتی ہے، اس جگر پاش منظر سے فضا شیون وفریاد سے بھر جاتی ہے حسرت ویاس ماتم کرنے لگتی ہیں اور بیکسی اپنا سر پیٹنے لگتی ہے۔

چتا میں آگ دی جاتی ہے، شعلہ بھی اس صدمۂ جانگسل سے کانپتا ہوا اٹھتا ہے، اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ شاداب گلدستہ تودۂ خاکستر ہو جاتا ہے، اسی لمحہ میں محبت کی دیوی اپنے ساتھ (اُن سیکڑوں پاک روحوں کو جو سرزمین ہند میں اپنے پیارے شوہروں کی موت پر ستی ہو چکی ہیں) لئے ہوئے آسمان سے اُترتی ہے اور اسکی وفا کیش روح پر شہرت کے پھول برساتی ہے۔ اور محبت و وفا کے گیت گاتی ہوئی اسے اپنے ہمراہ آسمان پر لے اُڑتی ہے۔

سولھویں سترھویں کے وسط صدی میں "ڈاکٹر برنی ار" فرانس سے ہندوستان آتا ہے، وہ احمد آباد سے آگرہ جا رہا ہے رستہ میں ایک مقام پر اس کا قافلہ ٹھیرتا ہے، اور اسکو معلوم ہوتا ہے کہ ایک پیکر محبت اپنے شوہر کے ساتھ ستی ہونے والی ہے، یہ خود اُس مقام پر پہونچتا ہے اور دیکھتا ہے

کہ ایک لاش کے پاس اُسکی رفیق زندگی بیٹھی ہوئی ہو، اُس کے چہرہ پر بشاشت کی سرخی پھیلی ہوئی ہے اور وفورِ شوق میں چتا کی آگ کا انتظار کر رہی ہے۔

اوسکی پانچ خادمائیں بھی چتا کے آس پاس ذوقِ طرب میں رقص کناں ہیں، حتیٰ کہ چتا میں آگ دیدی جاتی ہے اور جب اُس خاتون کے کپڑوں میں آگ پہونچتی جاتی ہے تو وہ پانچوں ہمدرد عورتیں بھی شعلہ فشاں آگ میں کود پڑتی ہیں اور ایک دردناک تخیل سے ہر تیر کا دماغ گھر جاتا ہے۔

صنفِ نازک کے آتشکدہ جگر میں جب کہ صداقتِ محبت کے یہ شعلے دہکتے ہوں جنکی رگوں میں وفا کا خون اس طرح گردش کرتا ہو کیا پھر بھی اس طبقہ پر بیوفائی کے الزامات درست ہو سکتے ہیں! اگر تم محبت وطن، ایثار، سیاسیات کے متعلق بھی اُن کے کارنامے دیکھنا چاہتے ہو تو آؤ وہ بھی تمہیں دکھا دیں۔

حضرت عمرؓ کا دورِ خلافت ہے، قادسیہ کی ہولناک جنگ سعد کے زیر کمان ہے، غنیم کا لشکر جرار سامنے پڑا ہے، اور زمانہ فیصلۂ جنگ کا انتظار کر رہا ہے۔ خنساؔ، جو عرب کی مشہور شاعرہ تھی اصنافِ سخن کے علاوہ اُس کا قلب جذبۂ محبت وطن سے لبریز تھا۔

جب لڑائی کے شعلے اُٹھنے لگے، اُس کا دل بیچین ہو گیا، اور اپنے نوجوان بیٹوں سے جو اُسکے عصائے پیری اور کفیل زندگی تھے، کہنے لگی۔

پیارے بیٹو! تم اپنے ملک کو دوبھر نہ تھے، نہ تم پر قحط پڑا تھا، خدا کی قسم جس طرح تم ایک ماں کی اولاد ہو، اسی طرح ایک باپ کی بھی ہو، میں نے تمہارے باپ سے بد دیانتی نہیں کی، جاؤ، اور آخر دم تک لڑو۔

اس سحر آفریں مخاطبت نے اُنکو تڑپا دیا، اسلحہ زیبِ جسم کئے، غمزدہ بوڑھی ماں کے کانپتے ہوئے ہاتھوں نے بلائیں لیں اور خدا حافظ کہا، اور وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر دشمن کے قلب لشکر میں ٹوٹ پڑے۔

روس نے جاپان پر چڑھائی کر دی ہے ، اسکے بحری جہاز تاراج کے لئے بڑھ رہے ہیں ، اور بڑے دہانوں کی توپیں خوفناک گولی برسا رہی ہیں ۔

جاپان کو اپنی بساط اور حریف کی زبردست طاقت کا احساس ہے ۔

ایک ساٹھ برس کی بڑھیا کے دل میں حفاظت وطن کے نقوش مرتسم ہیں ، وہ روس کے بحری بیڑے کے تباہ کن حالات سنتی ہے اور اپنے اکلوتے نوجوان بیٹے کو بلا کر کہتی ہے ۔

"بیٹا ! اگر میرے تم پر کچھ حقوق ہیں تو آج میں اُن کا معاوضہ چاہتی ہوں ، روسی بیڑہ کی چیرہ دستیوں نے میرے قلب میں زخم ڈال دیے ہیں ، تم فوج میں بھرتی ہو اور اپنے ایک اور خون کو سمندر سے حریف کے عساکر جیوش کو غرقاب کر دو !

وُہ متاثر ہو کر وزیر حرب سے فوج میں بھرتی ہونے کی درخواست کرتا ہے ، اور جب وزیر حرب کو معلوم ہوتا ہے کہ ضعیفہ ماں کا بجز اسکے کوئی کفیل نہیں ہے تو اسکی درخواست مسترد کر دیتا ہے ، جب شیدا وطن کے کانوں تک یہ واقعہ پہونچتا ہے ، بیقرار ہو جاتی ہے ، اور فوراً ریوالور اُٹھا کر اُس کا منھ اپنے سینہ کی طرف کر کے فیر کر دیتی ہے ، اور آخری سانس کے ساتھ جو آواز حزیں نکلتی ہے وہ اس جملہ کو ادا کرتی ہے ۔ کہ "بیٹا ! لو کفالت ہٹ گئی ، اب جاؤ ، اور وطن پر قربان ہو جاؤ !

۱۷۶۸ء میں شالوت کی ولادت ہوتی ہے ، جب وہ تیرہ برس کی ہوتی ہے تو اسکے چہرہ پر اتقاوتورع کا نور برستا ہے ، اُس کے خیالات روحانی ارتقا کی طرف مائل ہوتے ہیں اور وہ ایک گرجا میں جاکر راہبانہ زندگی کے برکات حاصل کرنے میں مصروف ہو جاتی ہے ، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ فرانس کے مطلع پر استبدادیت کا غلیظ ابر چھایا ہوا تھا اور انقلاب پسند طبقہ کے صرصر افکار اسکو منتشر کرنے میں جد و جہد کر رہے تھے ۔

سب سے پہلے پادریوں کے اقتدار پر ضرب پڑتی ہے اور گرجاؤں کے امتیازات معدوم ہوتے ہیں اور یہی انقلاب شالوت کو گرجا سے باہر لاتا ہے ، ماحول کے واقعات سے محبت وطن کی چنگاریاں اسکے سینہ میں شعلہ فشانیاں کرنے لگتی ہیں ، اسی دور میں صہبائے حریت کے جرعہ نوش دو پارٹیوں

منقسم ہو جاتے ہیں، ایک پارٹی کو شکست ملتی ہے اور اُس پارٹی کے افراد سراسیمہ و مضطر کارنج میں پہونچتے ہیں مخالف پارٹی جسکا لیڈر میسوموروتھا اُس کے سفاکانہ مظالم کوچہ و برزن میں بیان ہوتے ہیں اور اُسکو خائن ملک اور دشمن حریت بتاکر طبائع عامہ میں جوش پیدا کیا جاتا ہے۔

ان واقعات کو سنکر شالوت کا دل و دماغ بے قابو ہو جاتا ہے اس کی آنکھوں سے جذبۂ انتقام کے شعلے نکلنے لگتے ہیں، اور وہ شیدائے وطن یہ عزم بالجزم کرلیتی ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اُسکی جابرانہ ہستی کے نقوش کو فنا کردے۔

شالوت اسی خیال کے زیر اثر روانہ ہو جاتی ہے اور بہزار دشواری میسوموروتک پہونچ جاتی ہے اور فوراً برق خاطف کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتی ہے اور اپنی قبا سے زہر آلود چھری نکال کر اُسکے جسم کے ٹکڑے اوڑا دیتی ہے۔

جب وہ گرفتار ہو کر عدالت میں آتی ہے اور اُس کا بیان لیا جاتا ہے وہ نہایت مستقل مزاجی سے کہتی ہے کہ حاشا مجھے مقتول سے ذاتی عداوت نہ تھی لیکن جذبۂ وطن کا مقدس فرض مجھے مجبور کررہا تھا کہ میں اسکی شمع حیات کو بجھا دوں اور ملک کو ہولناک مصائب سے نجات دلادوں میں اپنے فعل کے نتیجہ سے بے خبر نہ تھی لیکن بقول کارلائل یاد رکھو کہ عیب گناہ میں ہے نہ کہ پھانسی پانیمیں آج میری زندگی کا یہ یوم سعید ہے، میرا قلب مسرت و شادمانی سے لبریز ہے، مجکو ارتکاب جرم سے اقبال ہے، میں نے اسکو اسلئے ہلاک کیا ہے کہ لاکھوں ہنیوں کو اُسکی چیرہ دستیوں اور مظالم سے نجات دلاؤں۔ اسی اثنا میں وہ دیکھتی ہے کہ مصور اسکی تصویر لے رہا ہے وہ اسکی طرف رخ کرکے کھڑی ہو جاتی ہے، اور اپنے سیاہ بالوں کی ایک لٹ کاٹ کر اُسکے حوالہ کرتی ہے، جلاد اشارہ کرتا ہے اور ہنستی ہوئی مقتل میں جاکر قوم اور ملک پر قربان ہوجاتی ہے اور آج دنیا اُس کا وہی فوٹو ورسیلز کے میوزیم میں دیکھ کر اُس شیفتہ حریت کی روح پر تحسین و آفریں کے پھول برساتی ہے +

ماہر، بھوپالی

ایثار کا بہترین نمونہ

آفتاب لب بام ہے، اور گوشۂ مغرب سے سیاہ اور ارغوانی بادل اپنی آغوش میں اُسکو لینے کے لئے بڑھ رہے ہیں اسی حالت میں زبیر ایک وسیع ریگستان طے کر رہا ہے اور اسکی یہ کوشش ہے کہ جسطرح شام ہونے سے پہلے ساحل پر پہونچ جاے - یہاں آفتاب غروب ہو گیا اور اسکے تھوڑی ہی دیر بعد زبیر بھی منزل مقصود پر پہونچ گیا - دریا کے کنارے ایک نازنین کی پیک نظر امواج بحر کی شوخیاں دیکھ رہی تھی کہ یکایک ایک آہٹ نے اُسکو اپنی طرف مخاطب کر لیا اور اپنے جلوہ افروز ارمان وتمنا کو دیکھکر کہنے لگی پیارے زبیر خیر ہے بہت دیر لگائی -

زبیر - ہاں مجھے کسیقدر دیر ہو گئی ہے جسکی میں معافی چاہتا ہوں -

حسنہ - نہیں نہیں، معافی کی کیا بات ہے، جو کچھ وقفہ ہوا ہے وہ عمداً نہیں بلکہ مجبوراً ہوا ہوگا -

زبیر - ہاں میں آجکل سخت الجھنوں میں گرفتار ہوں، آؤ مجھے آج تمسے ایک خاص معاملہ میں گفتگو کر کے اپنی اُس قسمت کا جواب تک ایک کامیاب قسمت ہے فیصلہ کرنا ہے - یہ کہکر دونو ایک ریت کے ہموار ٹیلہ پر بیٹھ گئے -

اسوقت چاند اُفقِ مشرق سے نمودار ہو گیا ہے اور حسنہ کے آفتابی چہرہ کے مقابل اکتساب نور کرتے ہوے جلد جلد ارتقاے منازل میں آرہا ہے اور حسنہ خاموش ہمہ تن گوش بنی ہوئی محبت بھری نگاہوں سے زبیر کی طرف دیکھ رہی ہے -

زبیر - حسنہ میں آجکل ناقابل برداشت تکلیف میں مبتلا ہوں -

حسنہ - کیا تمکو میری ذات سے کوئی صدمہ پہونچا -

زبیر - خدا نہ کرے کہ تمسے کوئی صدمہ پہونچے اور اگر بالفرض محال تمسے کوئی تکلیف پہونچے بھی تو وہ میرے لئے حقیقی راحت ہے -

حسنہ - پھر -

زبیر - تمہارے والد سے مجھے بے انتہا تکالیف پہونچ رہی ہیں -

حسنہ - کیوں -

زبیر - حسنہ تم جانتی ہو کہ میں ایک شریف النسل ترک ہوں اور میرے سینہ میں کسی طاقت سے سوائے

تمہاری محبت کے نہ دبنے والا دل بھی ہے

حسنہ میں تمہاری گفتگو بالکل نہیں سمجھی ذرا صاف صاف کہو۔

زبیر۔ حسنہ تمہارے والد میری تمام امیدوں تمام تمناؤں اور تمام ارمانوں کو نہایت بیدردی سے نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں، یعنی وہ اپنے عہد سے جو میرے اور اُن کے مابین تمہارے متعلق تھا اور میں اپنی زندگی اُس ساعتِ سعید کے انتظار میں مسرت سے گذار رہا تھا "محض اس وجہ سے کہ ہماری فوج کا جنرل تمہارا خواہاں ہے، پھر گئے۔

حسنہ پھر اس سے تم کیوں پریشان ہو، میں تم سے محبت کرتی ہوں، تم مطمئن رہو میں کوشش کرونگی کہ وہ اپنے قدیم عہد پر قائم رہیں۔

زبیر لیکن تمہاری کوشش غالباً ناکامیاب ہوگی۔

حسنہ۔ وجہ

زبیر۔ اسلئے کہ وہ ایک مستقل مزاج آدمی ہیں۔

حسنہ۔ لیکن جس حالت میں انکا استقلال تمہارے معاملہ میں غیر مستقل کہا جاتا ہے، اسیطرح عزم جدید جو اُن کے دل میں پیدا ہوا ہے میری کوششوں سے بدل جائے گا۔

زبیر۔ خدا تمہیں کامیاب کرے لیکن اگر تم اپنے والد کے ارادہ کو نہ بدل سکیں تو۔

حسنہ مجبوری۔

زبیر۔ ہیں تو کیا پھر تم اپنے والد کے ارادہ کے تابع ہو کر رہو گی۔

حسنہ مشیت!!

زبیر حسنہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو، تمہارے الفاظ میرے دل پر بجلیاں گرا رہے ہیں تمہارے شفاف حسن کی ضیا بیزی میری آنکھوں کے لئے بھیانک تاریکی بنی جا رہی ہے، کیا میں یہ سمجھ لوں کہ تمہاری محبت ایک فریب تھا، کیا یہ میں یقین کرلوں کہ تم جو چند منٹ پہلے مجھسے اظہار محبت کر رہی تھیں، وہ دھوکہ ہی دھوکہ تھا۔

حسنہ تم جو چاہو سمجھو یہ تمہارا فعل ہے لیکن میں اپنے ارادہ یعنی تمہاری الفت میں مضبوط ہوں اور جو نقوش تمہاری محبت کے میرے دل پر ثبت ہو چکے ہیں اُن کو کوئی طاقت نہیں ہٹا سکتی۔

زبیر - کیا تم یہ سچ کہہ رہی ہو؟

حسنہ - ہاں سچ کہہ رہی ہوں، اور سچ ایمان کے ساتھ ہے، اور ایمان جان کے -

زبیر - اچھا تو سنو! اور جو کچھ میں کہوں اسپر عمل کرکے اپنی سچائی کا ثبوت دو -

حسنہ - فرمایئے -

زبیر - ابھی عقد نکاح -

حسنہ - لیکن اسکے لئے والد کی رضامندی درکار ہے -

زبیر - مگر تمھارے والد کبھی اسپر رضامند نہوں گے، اس لئے کہ وہ کبھی اپنا عہد ایک غریب کے لئے ایک امیر سے نہ توڑیں گے

حسنہ - میں کوشش کروں گی کہ وہ رضامند ہو جائیں -

زبیر - تمہاری کوشش ناکامیاب ہوگی -

حسنہ - تو پھر میں بھی مجبور ہوں -

زبیر - حسنہ حسنہ! میں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ تمہاری محبت ایک فریبی طلسم تھا جس میں پھنس گیا ہو گیا تھا - جاؤ اور اپنی صورت جو کچھ دیر پہلے میری باصرہ نوازی کے لئے چاند سے زیادہ خوبصورت تھی، کبھی نہ دکھاؤ - بس جاؤ، میں بھی تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوا -

حسنہ محو حیرت رہگئی، زبیر کے جانے کے بعد حسنہ بھی یہ سوچتی ہوئی اپنے گھر روانہ ہوئی، کیا زبیر مجھ سے ہمیشہ کے لئے کشیدہ ہو کر چلا گیا، کیا وہ اب میرے پاس کبھی نہ آئیگا - کیا میں جاؤں اور اُسے منالاؤں، کیا وہ جو کچھ کہتا تھا اوسپر اپنے باپ سے بغیر پوچھے ہوئے عمل کروں، ضرور کروں، مجھے ضرور ایسا کرنا چاہیئے، مگر ہاں اے حسنہ تیرے خیالات حکم خدا و رسول کے خلاف باپ سے برگشتگی سکھا رہے ہیں، ایک محبت کیسی اگر ہزار محبتیں ہوں تو اُن کو بھی احکام خداوندی کے مقابلہ میں ٹھکرا دے - لیکن زبیر کو یہ ضرور بتا دے کہ حسنہ اپنے ارادہ میں مضبوط اور اپنی محبت میں صادق ہے، غرض کہ حسنہ ایک لاتناہی سلسلۂ خیال اپنے دل میں لئے ہوئے مکان پہونچی - حسنہ کو مکان پہونچے ہوئے ابھی تھوڑا ہی وقفہ ہوا تھا کہ ایک بوڑھا ترک قدمبوس چغے کے دامن ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے

گھر میں داخل ہوا۔ حسنہ نے باادب اسکو سلام کیا اور خاموش کھڑی رہی۔

زید۔ حسنہ آج تم مضمحل سی ہو۔

حسنہ۔ نہیں میں خوش ہوں، اور خصوصاً اُس وقت سے جب سے آپ کو دیکھا ہے۔

زید۔ حسنہ! تم کو مسرور ہونا چاہیئے میں نے تم کو ایک شریف، باعزت، دولتمند، ہمقوم سے منسوب کرنے کا عزم مصمم کر لیا ہے، تمہاری اس میں کیا رائے ہے۔

حسنہ۔ محجوبانہ لہجہ میں، میں آپ کی خادمہ ہوں اور آپ کی رائے کی حامی "لیکن"

زید۔ لیکن کیا؟

حسنہ۔ کچھ نہیں ایک عرض۔

زید۔ کیا عرض۔

حسنہ۔ مذہب اسلام میں خلاف معاہدگی جائز نہیں۔

زید۔ کیسا معاہدہ؟ اور کس سے معاہدہ؟

حسنہ۔ زبیر سے۔

زید۔ میں نے کوئی معاہدہ نہیں کیا، اور اگر کیا تو کس کے سامنے؟

حسنہ۔ خدا کے، اور میرے۔

زید۔ حسنہ! اسکو زبان پر نہ لاؤ ورنہ لوگ مجھے مطعون کرینگے۔

حسنہ۔ پیارے باپ آپ مجھے بے ایمانی اور جھوٹ کی تلقین فرماتے ہیں۔

زید۔ نہیں میں تجھے بے ایمانی نہیں سکھاتا بلکہ تھوڑی سی وعدہ خلافی کے ساتھ تیری زندگی کے مستقبل کو درخشاں بنانا چاہتا ہوں۔

حسنہ۔ میں اپنی زندگی کی اُس درخشانی سے جس سے آپ وعدہ خلاف مشہور ہوں تاریکی کو زیادہ پسند کرتی ہوں۔

زید۔ لیکن اب میں اپنے وعدہ سے کبھی نہیں پھر سکتا اس لئے کہ خالد سے مستحکم اقرار کر چکا ہوں،

حسنہ۔ میں یہ نہیں کہتی کہ آپ وعدہ سے پھریں، بلکہ خالد سے امر واقعہ کا اظہار کر دیں کہ میں اپنے وعدہ پر قائم ہوں مگر حسنہ منظور نہیں کرتی۔

زبیر ۔ اسکے اظہار میں میری تحقیر ہے ۔
حسنہ ۔ مگر تحقیر بدعہدی سے کم ہے ۔
زبیر ۔ میں جو کچھ ارادہ کر چکا ہوں وہ پورا ہوگا ، تجھے اس معاملہ میں اظہار کی ضرورت نہیں ۔
حسنہ ۔ میرا اصرار صرف اس وجہ سے تھا کہ آپ کو بدعہدی کے بدنما دھبے سے بچالوں ، ماننا اور نہ ماننا آپ کے اختیار میں ہے ۔ یہ کہہ کر حسنہ خاموش ہوگئی اور زبیر پھر باہر چلا گیا ۔

رات زیادہ گزر چکی ہے اور زبیر حسنہ سے رخصت ہو کر اور ایک طوفان اضطراب اپنے سینہ میں لئے ہوئے ایک سمت کو چلا جا رہا ہے ، وہ کہیں کہیں تکان کی وجہ سے آرام وسکون کا ارادہ کرتا ہے لیکن وہ اضطراری کیفیت جو یاس وحسرت غم وغصہ نے اس میں پیدا کر دی ہے کسی جگہ دم بھر نہیں ٹھہرنے دیتی ۔ یہاں تک کہ وہ آخری حصۂ شب میں اُس ساحل پر پہونچا جہاں اسے پہونچنا تھا ، تھوڑے ہی انتظار کے بعد صبح کے آثار نمودار ہوئے ، اُسوقت دریا کی موجیں ہلکی ہلکی ہوا کے ساتھ ایک اضطرابی کیفیت میں تھیں ، اور سفید ابر کے ٹکڑے حسن آسمانی میں چار چاند لگائے ہوئے تھے ۔ آفتاب کی زریں شعاعیں فضا کو زرکار بنا رہی تھیں ، صدہا قسم کے طائر ساحل پر گزر رہے تھے ، لیکن یہ تمام دل فریب مناظر زبیر کی نگاہوں میں ہیچ تھے اسلئے کہ اس وقت اُس کے اوپر ایک ایسی محویت طاری تھی جس نے تمام قوتیں اُس سے چھین لی تھیں ، یہ حالت تھی جو زبیر پر طاری تھی اور وہ خاموشی کے ساتھ ریت کے ایک ڈھیر سے پیٹھ کو سہارا دیئے بیٹھا تھا ، یکایک اسکی نظر ایک سمت اٹھی اور اسنے دیکھا کہ خالد اور زید اسی طرف آرہے ہیں ، خالد کو دیکھ کر زبیر کے جسم میں سنسنی ، خون میں حدت ، اور نبض میں عشر پیدا ہوگئی اُسکی قہر آلود نگاہوں نے چاہا کہ وہ خالد اور زید کی طرف اٹھیں لیکن فوراً ہی زبیر نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے فرمانبردارانہ طریقہ پر جو ترکوں کی میراث ہے خالد کو سلام کیا ۔

خالد ۔ ارے زبیر ! تم یہاں کہاں ؟
زبیر ۔ قسمت کی برگشتگی اور زید کی وعدہ خلافی سے ۔
خالد ۔ زید نے تمسے کیا وعدہ کیا تھا جو ایفا نہیں کیا ؟

زبیر - ان ہی سے پوچھئے -

زید - میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا -

خالد - زبیر زید تو کسی وعدہ کا کے کرنے کا اقرار نہیں کرتے، تم ہی بتاؤ کہ انہوں نے کیا وعدہ کیا تھا

زبیر - وہی وعدہ جو آجکل آپ سے کیا ہے -

خالد - کیا حسنہ کے متعلق .... زبیر - بیشک - خالد - پھر وہ وعدہ انہوں نے پورا کیوں نہیں کیا؟ -

زبیر - محض اس وجہ سے کہ آپ حسنہ کے خواہاں ہیں - خالد - زید - زبیر کیا کہہ رہے ہیں - زید - غلط ہے

زبیر - اس کا جواب حسنہ سے لیا جائے - خالد نے خادم کو اشارہ کیا وہ نہایت تیزی کے ساتھ گیا اور حسنہ کو لیکر حاضر ہوا -

خالد حسنہ کیا تم کو معلوم ہے کہ تمہارے والد نے زبیر سے تمہارے متعلق کچھ وعدہ کیا تھا حسنہ - ہاں، مجھے علم ہے، لیکن خدا جانے وہ کن وجوہ سے اپنے وعدہ سے پھر گئے - اور میں ہرگز نہیں چاہتی کہ میرے باپ اپنے معاہدے سے پھر کر خدا کے گناہگار اور مخلوق میں وعدہ خلاف مشہور ہوں - زید نے ندامت سے سر جھکا لیا اور خالد نے اُسیوقت باوجودیکہ حسنہ کی محبت اُس کے دل میں سمندر کی طرح موجزن تھی، زبیر اور حسنہ کا عقد شرعی کر دیا -

اللہ اللہ! یہ تھا مسلمانان سلف کا ایثار اور انکی راستبازی

افکار حامد

ایڈیٹر

میری بربادی کا آخر کس کے سر الزام ہے — کیا نگاہِ ناز یہ بھی گردشِ ایام ہے
بعد یک عمر اسیری کھل گیا دنیا کا راز — دام وقفِ صید ہے اور صید صرفِ دام ہے
خود ہی تو انصاف کر دل میں کہ تیری ذات سے — مجھکو کیا ایذا ہے اور دشمن کو کیا آرام ہے
ذرہ ذرہ وادیِ ایمن سے سبقت لیگیا — اہتمام جلوہ فرمائی کا فیضِ عام ہے
ہم تو کچھ ہو ہی گئے بے اختیارِ شوقِ دل — ورنہ امید وفا تم سے خیالِ خام ہے
دورباش اے عقل! ہاں ہشیار باش اے بیخودی — بزمِ حسنِ خودنما میں آج اذنِ عام ہے
شوق سے حامد مجھے وہ بیخودی منظور ہے — جو کسی کے دیکھنے کا لازمی انجام ہے

ایڈیٹر

شہر پامپیائی کا دور آخریں

مصنفہ لارڈ لٹن (ایک مسلسل ناول) مترجمہ برکت علی

اس سے قبل کہ پا مپیائی کا ترجمہ شائع کیا جاوے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پامپیائی کے مختصر حالات ہم اپنے ناظرین کی خدمت میں پیش کردیں۔

پامپیائی اٹلی کا ایک قدیم شہر ہے جو خلیج نیپل پر واقع ہے ۶۰۰ سال قبل مسیح اسکی بناء ہوئی تھی، اسکے منظر کی دلکشی نے رفتہ رفتہ اسکو روم کے عیش پسند لوگوں کا مرکز بنا دیا، اور کچھ عرصہ کے بعد یہ ایک خوشنما شہر دارالسلطنت کا ہو گیا ۶۳ء میں زلزلے اور کوہ وزووسیس کی آتش فشانی کی بلا اس پر نازل ہوئی اور کل شہر کا شہر برباد ہو گیا، تمام آبادی میں سے صرف ایک حبشی بچا تھا جو ایک روز پہلے جیل میں بھیجدیا گیا تھا، ۱۷۴۸ء میں اس شہر کا سراغ لگا، شہر کا دور تقریباً دو میل ہے اور ایک دیوار سے گھرا ہوا ہے۔

بہت سے امرا کے مکانات اور کئی تھیٹر، اور جو پیٹر، وینس، ہرکیوس کے مندر برآمد ہوئے ہیں ہرکیوس کی نسبت خیال ہے کہ وہ اس شہر کا بانی تھا، بہت سی عمارتیں ایسی نکلی ہیں جنکو خیال ہوتا ہے کہ گریس کے معماروں نے بنایا ہے۔ جو اشیاء آثار قدیمہ کی وہاں پائی گئی ہیں وہ نیپل میں جمع کی گئی ہیں

باب اوّل

شہر پامپیا میں جہاں آفتاب اپنا جلوہ دکھاتا تھا، ایک پُرلطف موسم بہار کی سہ پہر تھی کشادہ اور وسیع سڑکوں میں سے ایک پر جو رنگ برنگ کے عیش طلب مجمعوں سے بارونق ہو رہی تھی ایک پستہ قامت نوجوان جو اپنے امیرانہ اور فیشن ایبل لباس سے ایک جنٹلمین اور چھیل چھبیلا معلوم ہوتا تھا، سیر گشت کر رہا تھا، کلوڈیس اس کا نام تھا، چونکہ زیادہ رات تک اپنے ایک دوست کے مکان پر چوسر کھیلتا رہا تھا اس وقت وہ بیفکری و اطمینان سے چہل قدمی کرتے ہوئے اپنی خوش قسمتی پر غور کر رہا تھا، پانسہ اسکے حق میں رہا تھا اور اُسنے ایک کثیر رقم اپنے بدنصیب ساتھیوں سے جیتی تھی۔ نظر اُٹھاتے ہی اس کا ایک متعارف اُس کے سامنے تھا

جو ثقہ صورت اور متوسط العمر آدمی تھا، اخاہ! ڈامُوٹ خوب ملے۔ اوسنے کہا کیا آج کا کھانا تم گلاڈس کے ہمراہ کھاؤگے۔ آہ پیارے کلوڈیس۔ نہیں ڈامُوڈ نے جواب میں کہا۔ اوس ارزل الناس نے مجھے مدعو نہیں کیا ہے۔

کلوڈیس۔ لوگوں کا مقولہ ہے کہ پاپیائی میں اوسکے یہاں کا کھانا سب سے زیادہ نفیس ہوتا ہے،

ڈامُوڈ۔ ہاں واقعی بہت اچھا ہوتا ہے، مگر مجھکو کبھی کافی طور پر شراب ہاں بسر نہیں آئی

کلوڈیس۔ اُس کا یہ عذر ہے کہ شراب اُسکو دوسرے روز صبح تک لایعقل کر دیتی ہے،

ڈامُوڈ نے اپنی پیشانی کو بلند کرکے کہا کہ ایک دوسری وجہ اور بھی اسکی خست کی ہے کہ باوجود اس قدر شیخی مارنے کے اور اسراف کے وہ فی نفسہ ایسا رئیس بھی نہیں ہے جیسا کہ میرے خیال میں بنتا ہے۔

لیکن جبتک اس کے پاس روپیہ ہے اُس کے ساتھ کھانے رہنے کی وجہ معقول ہے۔

کلوڈیس اور دوسرے سال ڈامُوڈ ہم کوئی دوسرا گلاکس تلاش کرلیں گے۔

ڈامُوڈ۔ میں نے سنا ہے کہ وہ چوسر کا بھی بہت شائق ہے

کلوڈیس۔ وہ ہر عیش وعشرت کا شائق ہے اور جب اُسکو کھانا کھلانے میں مسرت ہوتی ہے تو ہم سب بھی اس کے دلدادہ ہیں۔

ڈامُوڈ۔ بہت خوب، مگر یہ تو کہو کہ تمنے کبھی میرے ہاں کی شراب بھی چکھی ہے۔

کلوڈیس۔ مجھے یاد نہیں پڑتا۔

ڈامُوڈ۔ اچھا تو کسی دن میرے ہاں کھانا کھاؤ۔ میں اپنے دوست مجسٹریٹ پانسا کو بھی تم سے تعارف کرانے کو مدعو کرلوں گا۔

کلوڈیس۔ اجی میری خاطر کسی دوسرے کو مدعو کرنے کی کیوں تکلیف اٹھاؤ، میں تو تھوڑے ہی میں مطمئن ہو جاتا ہوں، دن ڈھلتا جاتا ہے اور مجھے حمام جانا ہے، تم کدھر جارہے ہو۔

ڈامُوڈ۔ میں ایک سرکاری کام کو جارہا ہوں، پھر آئی سیس کے مندر جاؤں گا، لو خدا حافظ

کلوڈیس، جب آہستہ آہستہ چلدیا تو دبی آواز میں کہنے لگا۔ شیخی باز، کمینہ، وہ سمجھتا ہے کہ اسکی دعوت اور اسکے ہاں کی شراب اوسکی کمینگی کو ڈھانپ لیگی، یہ اور بات ہے کہ

جب ہم جوئے میں اس کا روپیہ اینٹھتے ہیں تو اُس وقت ہم اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اس کا باپ ایک آزاد کردہ غلام تھا۔ یہ امیر عوام الناس، ہم مُسرف امرار کے لئے ایک موٹی مرغی کی طرح ہیں، یہ کہتا ہوا کلوڈیس ایک گنجان آباد بازار میں داخل ہوا، جہاں رونق زندہ دلی، اور چہل پہل کے وہ سامان مہیا تھے جو آج نیپل کے بازاروں میں پائے جاتے ہیں، سواری کے رتھ اور اُن کے گھنٹوں کی جھنکار سہانی معلوم ہوتی تھی، کلوڈیس مسکراہٹ کے ساتھ سر کے اشارے سے رتھ کے معزز سواروں سے علیک سلیک کرتا جاتا تھا۔

پاپیا کے بیکار لوگوں میں کلوڈیس کا حلقۂ ملاقات سب سے زیادہ وسیع تھا، اتنے میں ایک شاندار رتھ گذرا جسمیں اعلیٰ نسل کے گھوڑے جتے ہوئے تھے، رتھ میں سے ایک نوجوان نے نہایت خوشگوار لہجے میں پکارا، اخاہ! کلوڈیس آؤ، گذشتہ خوش قسمتی کے بعد آپ کا مزاج کیسا رہا۔

کلوڈیس۔ میرے عزیز گلاوکس، مجھے یہ دیکھکر بڑی مسرت ہوئی ہو کہ تمہارے نقصان نے تم پر کوئی بُرا اثر نہیں ڈالا تمہارے چہرے سے تو ایسی خوشی ٹپک رہی ہے کہ دیکھنے والا یہ گمان کر سکتا ہے کہ درصل جوئے میں آپ جیتے اور میں ہارا۔

گلاوکس۔ بھائی روپیہ پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے، ان چند دہات کے سکّوں کی کیا حقیقت ہے کہ ان کا ہارنا اور جیتنا ہمکو مغموم بنا سکے۔ "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"۔ یاد بھی ہے کہ آج کا کھانا تمہیں میرے یہاں کھانا ہے۔

کلوڈیس بھلا گلاوکس کا اذن دعوت بھی کوئی بھول سکتا ہے۔

گلاوکس ۔ اب کدھر جا رہے ہو۔

کلوڈیس ۔ میرا حمام جانے کا ارادہ تھا مگر ابھی تو گھنٹہ بھر وقت باقی ہی۔

گلاوکس ۔ اچھا تو میں رتھ کو یہیں سے واپس کرتا ہوں اور تمہارے ساتھ چلتا ہوں، یہ کہکر گلاوکس رتھ سے اُترا اور گھوڑوں کو پیار سے چمکار کر اپنے دوست کے ساتھ ہولیا۔ اسوقت یہ دونوں دوست شہر کے ایسے حصہ میں تھے جہاں نہایت آراستہ و پیراستہ دکانیں تھیں اور جنکی اندرونی بناوٹ خوبصورت نقش ونگار سے مزین تھی، ہر طرف دلبستگی کے سامان

موجود تھے، چمکدار فوارے گرم ہوا میں ٹھنڈا ٹھنڈا پانی اُڑا رہے تھے، خوش لباس خوش وضع لوگوں کے جھنڈ کے جھنڈ اِدھر اُدھر چہلقدمی کر رہے تھے، خوش مذاق، شوقین مزاج جنہیں تفریح کے سوا کوئی کام نہ تھا دکانوں کے سامنے کھڑے تھے، غلام سروں پر طباق اُٹھائے آجا رہے تھے دیہاتی لڑکیاں خوش رنگ پھول اور خوش ذائقہ پھل بیچتی پھرتی تھیں، ارغوانی شامیانے کے سایہ میں کرسیاں بچھی تھیں جو تھکے ہوؤں کو سستانے اور بیکار لوگوں کو لیٹنے کے لئے للچاتی تھیں۔

یہ تمام سامان ایسے تھے جن سے گلاوکس متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، اس کے آبا و اجداد یونانی تھے اور عیش پسند، ایتھنز کے رہنے والے یہ دونوں چلتے پھرتے چوک میں پہونچے جہاں آدمیوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی اور ایک جوان دوشیزہ وہاں کھڑی تھی، اُس کے دائیں بازو پر ایک پھولوں کی ٹوکری لٹک رہی تھی اور بائیں ہاتھ میں ایک ستار لئے تھی ستار کے مدھم سروں میں وہ ایک نیم جنگلی گنواری راگ گا رہی تھی۔ گانے بجانے کے ہر وقفہ میں وہ پھولوں کی ٹوکری کو حاضرین کے سامنے پھول خریدنے کے لئے چکر دیتی تھی اور لوگ ٹوکری میں پیسے ڈال رہے تھے، کچھ تو اسکے گانے کی داد میں اور کچھ اسکی حالت پر ترس کھا کر، کیونکہ لڑکی نابینا تھی۔

گلاوکس - ہیں یہ تو بیچاری ندیا ہے، میں پاپیائی جب سے واپس آیا ہوں میں نے اسے آج ہی دیکھا ہے۔

کلوڈیس - خاموش رہو، آؤ اس کا گانا سنیں، کیا پیارا گلا ہے۔ گلاوکس خاموش کھڑا سنتا رہا اور جب گانا ختم ہوچکا تو بھیڑ کو چیر کر وہ آگے بڑھا اور پیسوں کی ایک مٹھی ٹوکری میں ڈال کر کہنے لگا پیاری ندیا تیری آواز نہایت ہی دلفریب ہے۔ لا یہ گلدستہ میں لوں گا۔ آواز پہچانکر وہ محروم لڑکی آگے بڑھی اور پھر یکایک جھجک کر بولی، اچھا آپ واپس تشریف لے آئے اور پھر بہت ہی دھیمی آواز میں اپنے آپ ہی کو مخاطب کرکے کہا، گلاوکس واپس آگیا ہے

گلاوکس - ہاں بچی چند دن ہوئے ہیں پا پیائی واپس آگیا ہوں، اور میرے باغچہ کو حسب معمول تمہاری دیکھ بھال کی ضرورت ہے - مجھے یقین ہے کہ کل تم ضرور آ ؤ گی - میرے گھر کے استعمال کے لئے جتنے ہاروں کی ضرورت ہوگی وہ ندیا کے ہاتھوں کے سوا کسی دوسرے ہاتھوں سے نہیں گوندھے جائیں گے - ندیا خوش ہو کر مسکرائی لیکن اسنے کچھ جواب نہیں دیا اور گلاوکس گلدستہ خرید کر چلدیا، کلوڈلیس نے کہا کیا بچی تمہاری لاڈلی ہے -

گلاوکس - ہاں - کیا اس کا گانا دلکش نہیں ہے - میں اس بیکس غلام بچی پر ترس کھاتا ہوں علاوہ ازیں وہ یونان کی رہنے والی ہے - وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ایک جوان نقاب پوش عورت غلاموں کو ہمراہ لئے حمام جاتی ہوئی نہیں نظر آئی -

کلوڈیس - حسین جولیا، تسلیمات، جولیا نے کسی قدر نقاب کا گوشہ اٹھا، جسکے نیچے ایک خوبصورت رومی چہرہ اور چمکیلی سیاہ آنکھیں نظر آئیں -

جولیا - او - گلاوکس بھی تشریف فرما ہیں، کیا گزشتہ سال کے دوست آپ نے فراموش کر دئے -

گلاوکس - خوبصورت جولیا کو کون بھول سکتا ہے، گلاوکس کے پاس اچھے الفاظ کی کیا کمی تھی، اور جب مخاطب ایسا حسین ہو تو اچھے الفاظ کی کمی کس کو رہتی ہے -

جولیا - آپ دونوں صاحباں سے ابّا جان کے محل پر جلد ملاقات ہوگی، یہ الفاظ اُس نے کلوڈلیس کو مخاطب کر کے کہے، اور نقاب چھوڑ اگر تم تھم کر اسکی آخری نگاہ گلاوکس پر تھی اور یہ نگاہ پیار اور شکوے سے بھری ہوئی تھی - دونو دوست آگے بڑھے اور گلاوکس نے کہا جولیا بیشک خوبصورت ہے -

کلوڈیس - گزشتہ سال اگر تم اسکو دیکھتے تو اس سے زیادہ پرجوش الفاظ کہتے، اور اگر سچ پوچھو تو سب ہی عورتیں دل سے ایسی ہی ہیں، میں تو اُسے خوش قسمت سمجھتا ہوں جو خوبصورت چہرہ معہ زر رومال بیاہے - گلاوکس - ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو رہا - اب دونو شہر کے

کم آباد حصے میں پہونچ گئے تھے اور چونکہ حمام کے وقت میں دیر تھی اسلئے وہ سمندر کی طرف چل دیئے، اور سمندر کے کنارے الگ تھلگ ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔

جھیل کا نیلگوں پانی ان کے سامنے ایسا ہی بارونق تھا جیسے کہ شہر کے بازار، تجارتی جہاز لنگر ڈالے پڑے تھے، امراء کے سیر و تفریح کی کشتیاں بغیر کسی مقصد اور بلا کسی ارادہ کے ادھر ادھر پھر رہی تھیں۔ ماہی گیروں کے چھوٹے چھوٹے ڈونگے تیزی سے آگے پیچھے آ جا رہے تھے۔ دور، پرے، بیڑہ جہازات کے بلند مستول نظر آ رہے تھے جو اطالیہ کے سب سے بڑے جہاز راں یینی کے زیر کمان تھے۔ ان کی نظروں کے سامنے تو یہ نظارہ تھا مگر ان کے دلی خیالات کہیں اور تھے، کلوڈیس سورج کی کرنوں سے آنکھوں کو ہاتھ سے بچائے ہوئے گذشتہ ہفتہ کی کمائی کا حساب لگا رہا تھا، اور یونانی اپنے آباؤ اجداد کی سرزمین یہاں کے ہنر اور وہاں کی خوشیوں پر خیال کر رہا تھا، آخر یونانی نے اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہا، کلوڈیس سچ سچ بتاؤ تم نے کبھی محبت کا مزہ بھی چکھا ہے۔

کلوڈیس - ہاں اکثر اوقات۔

کلاوکس - اکثر اوقات محبت کرنے والا تو سچا عاشق نہیں ہو سکتا۔ سچی محبت تو زندگی میں ایک ہی بار آتی ہے۔

کلوڈیس - تو کیا تم کسی زلف گرہ گیر کے قیدی ہو؟ تم اس خبط کے مریض تو نہیں ہو جو ہمیں کھانا بھلا دیتا ہے، تفریح و فرائض فراموش کرا دیتا ہے، اور عشقیہ شعر کہلواتا ہے، مجھے تم پر کبھی یہ گمان نہیں گذرا تم تو بڑی ہوشیاری سے اس شعلہ کو چھپائے ہوئے ہو۔

گلاوکس نے مسکراتے ہوئے کہا، او ہیں اس قدر تو گہرے عشق میں نہیں ڈوبا، اور در اصل ابھی میں عاشق بھی نہیں ہوا، لیکن یہ ضرور ہے کہ میں عاشق ہو سکتا ہوں۔ اگر میری خواہش کے موافق کوئی بت نظر آ جائے۔

کلوڈیس - اچھا میں بتاؤں تمہارا مطلوب نظر کون ہے؟ ڈائمومڈ کی چھوکری تو نہیں، اور وہ ہے بھی لٹو اور اس بات کو کسی سے چھپاتی بھی نہیں، اس کے علاوہ حسین بھی ہے اور مالدار بھی۔ تم بڑے ناشکرے ہو، اچھا تم ہی بتاؤ وہ کون خوش نصیب معشوقہ ہے جو تمہاری نظر

نکلاوکس۔ میں بتاتا ہوں کئی مہینے ہوے جب میں نیپل میں تھا، نیپل تم جانتے ہو، عشق و محبت کی کان ہے، ایک روز میں عبادت کے لئے ایک مندر میں گیا۔ مندر خالی تھا اور میں اکیلا وہاں کھڑا تھا اور اتیھنز کے خیالات میرے دماغ میں ہجوم کئے ہوے تھے، میں نے دُعا کی اور دعا میں رویا۔ اس حالت میں ایک آہ کی آواز میرے کانوں میں آئی اور میں چونک پڑا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، میرے پیچھے ایک عورت تھی اس کا نقاب ہٹا ہوا تھا اور وہ بھی پوجا میں مشغول تھی، میں نے ایسا حسین اور معصوم چہرہ کبھی نہیں دیکھا، اُسکی خوبصورت آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ میں نے خیال کیا کہ یہ بھی اتیھنز کی رہنی والی ہے اور اتیھنز کے لئے جو میں نے دعا کی ہے تو ہمدردی کے جذبات سے اس کا دل میرے دل سے متاثر ہوا ہے۔ میں لڑکھڑائی ہوئی زبان سے اس سے ہمکلام ہوا، اے حسینہ کیا تو بھی اتیھنز کی رہنے والی ہے، میری آواز سے وہ شرمائی اور نقاب نصف چہرہ تک کھینچ لیا، اور کہا، میرے بزرگوں کی ہڈیاں اتیھنز میں مدفون ہیں۔ میں نیپل میں پیدا ہوئی ہوں لیکن میری رگوں میں اتیھنز کا لہو ہے، یہ سنکر میں نے کہا تو آؤ ہم تم دونوں ملکر قربانی چڑھائیں، اتنے میں مندر کا پجاری آگیا اور ہم نے پہلو بہ پہلو کھڑے ہوکر قربانی کی دعائیں پڑھیں، ہم اکھٹے اپنے دیوتا کے سامنے سرنگوں ہوے، اور اکھٹے ہی مذبح پر ہار چڑہاے اس کا شریک ہونا میرے لئے ایک عجیب اور پاکیزہ ہیجان کا باعث ہوا دور دراز ملکوں کے رہنے والے، ایک دوسرے سے بالکل اجنبی، ہم اکھٹے اور تنہا دونوں اپنے قومی دیوتا کے مندر میں پہلو بہ پہلو کھڑے تھے، یہ بالکل قدرتی بات تھی کہ میرا دل، اپنی ہموطن عورت کی طرف کھچا جاتا تھا، مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں اسے برسوں سے جانتا ہوں، ہماری مشترکہ اور متفقہ دُعاؤں نے یہ اعجاز دکھایا کہ گویا ہم ایک پُرانی ملاقات کی تجدید کر رہے ہیں۔ چپ چاپ ہم مندر سے نکلے اور میں اُس سے اُس کے مکان کا پتہ، اور ملاقات کے لئے پوچھنے ہی کو تھا کہ اتنے میں ایک نوجوان لڑکا جو خط و خال سے اُس کا بھائی معلوم ہوتا تھا، بڑھا اور اُس کا ہاتھ پکڑ لیا، وہ پھری اور مجھے خدا حافظ کہا، بھیڑ نے ہم کو ایک دوسرے سے علیٰحدہ کر دیا، اور اُسے پھر دیکھنا مجھے نصیب نہ ہوا۔ گھر پہونچکر مجھے ایسے خطوط ملے، جنکے باعث

مجھے فوراً ایتھنز واپس جانا پڑا، کیونکہ میرے عزیز و اقارب میری وراثت پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، وراثت کے جھگڑے سے فارغ ہو کر میں نیپل واپس آیا اور تمام شہر میں اپنی اُس ہموطن عورت کو تلاش کیا لیکن کچھ پتہ چلا۔ اس امید پر کہ لہو و لعب کی زندگی میرے دل سے اُسکے خیال کو محو کر دیگی - میں پا پیائی آ گیا یہ ہی میری سرگزشت - مجھے صرف ایک یاد ہے اور وہ ستاتی ہے - گلاؤکس مشکل سے یہ قصہ ختم کرنے پایا تھا کہ ایک آہستہ اور متحمل قدموں کی چاپ ادھر آتی سنائی دی، جہاں یہ دونوں بیٹھے تھے، انہوں نے جھٹ پھر کر دیکھا اور آنے والے کو دونوں نے پہچان لیا - آنے والا آدمی عمر کا تقریباً ۴۵ سالہ اور جسم کا لمبا اور بھاری مضبوط اور توانا، اسکے سانولے نقش مصری الاصل ہونے کا پتہ دیتے تھے - اسکی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، اسکی سنجیدہ اور نیم مغموم طبیعت کی گواہ تھیں، اسکی چال ڈھال معززانہ تھی اسکی ڈھیلی ڈھالی پوشاک اور صوفیانہ رنگ، غیر ملکی تراش اور اسپر چہرہ کی متانت، رعب دار قد و قامت اسکو اور بھی معزز بناتی تھی دو نوجوانوں نے نئے آنے والے کو سلام کیا، لیکن سلام کرتے ہی انہوں نے اپنی انگلیوں سے وہ اشارات کئے جو خطرے سے بچنے کے لئے کئے جاتے ہیں، کیونکہ، آربیسس مصری - آئی سس کا پروہت، بدنظری یا مذام تھا، اسکی نسبت یہ عام خیال تھا کہ جو اسکی طرف دیکھتا ہے اسپر کوئی نہ کوئی آفت نازل ہوتی ہے اسنے مسکراتے ہوئے کہا، وہ نظارے حقیقت میں دلفریب ہیں جو خوش باش اور ہر دلعزیز کلوڈیس اور گلاؤکس کو اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں -

یونانی - کیا قدرت بذات خود دلکش نہیں -

مصری - عیش پسندوں کے لئے تو نہیں -

یونانی - سخت لیکن غیر دانشمندانہ جواب "خوشی مخالف موازنہ سے بڑھتی ہے، چہل پہل کے بعد تنہائی اچھی معلوم ہوتی ہے، اور تنہائی کے بعد ہم پھر چہل پہل سے خوشی حاصل کرتے ہیں -

مصری - خیر ممکن ہے کہ تم ٹھیک ہو جو اسپر عمل کرتے ہو کہ " ساغر چلے جب تک بس چلے، پھول جلدی کملا جاتا ہے اور اُسکی خوشبو غائب ہو جاتی ہے، اور گلاؤکس بات تو یہ ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے ملک سے دور دیار غیر میں، غیر ملکیوں کی حیثیت سے پڑے ہیں، ہمارے لئے

رہ ہی کیا گیا ہے خوشی یا رنج، تمہارے لئے خوشی اور میرے لئے شاید رنج - یونانی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ افسوس بھری آواز سے بولا، آہ ایتھنز کا تذکرہ نہ چھیڑو، ہمارے باپ دادا کا نام نہ لو اُن کو بھول جاؤ -

مصری - تم کہنے کو تو یہ الفاظ کہہ رہے ہو، مگر تمہارا دل تمہیں ملامت کر رہا ہے - آج رات جب تم عیش میں مشغول ہوگے تو تم اس وقت کے کہے ہوئے الفاظ پر تاسف کروگے، خدا حافظ - یہ کہہ کر وہ اپنی ڈھیلی ڈھالی پوشاک کو سنبھالتا ہوا چلدیا -

گلاوکس - اب جب کہ وہ چلا گیا، میری جان میں جان آئی - اس پر خوشی و راحت کا اثر نہ ہو، اور دنیا کے عیش سے واقف ہو تو ہو، مگر دنیا تو اس کے متعلق کچھ اور ہی قسم کے فسانے بیان کرتی ہے -

کلوڈیس - ہاں لوگ کہتے ہیں کہ اس کے حجرے میں مصر کے قدیم فلسفہ کے علاوہ اور مضامین پر بھی بحث ہوا کرتی ہے، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ امیر ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ اسے ہم اپنی ٹولی میں شامل کرلیں اور چوسر کی چاٹ لگائیں جس کی خوشی سب خوشیوں سے اعلیٰ ہے - اس کے جواب میں گلاوکس مسکرا دیا، اور چونکہ اب دن ڈھل چکا تھا، ہر دو دوست اُٹھے اور آہستہ آہستہ شہر کی طرف چلدیے +

(باقی آئندہ)

برکت علی

کلام عالی

نظر بازوں کو ٹھہر کر ذرا جلوہ دکھا دینا — چراغِ طور اک لحظہ جلانا پھر بجھا دینا
مرے بعد آنے والے اے جنوں منزل نئی پائیں — گزر جاؤں میں جس صحرا سے وہ نقشہ مٹا دینا
ظاہر قیس کیوں ہمشکل لیلیٰ بن نہیں جاتا — جنوں کا کام ہے اک دوسری صورت بنا دینا
ہوائے مرگ یاسی کچھ ایسی واں پہ چلتی ہے — کہ شمعِ قبرِ عاشق کو جلانا ہے بجھا دینا
میں پس ماندہ ہوں اور دعویٰ ہے جانبازی کا مقتل میں — مجھے دو گام سب سے اے قضا آگے بڑھا دینا

عالی

۷۸۶

جلد ۱
شمارہ ۲

محسن الملک

قیمت سالانہ عہ ششماہی ۱؎
قیمت فی پرچہ ۸؍

مرتبہ حامد بھوپالی

بابت ماہ اکتوبر ۱۹۲۴ء

فہرست مضامین

اشارات - ایڈیٹر ۲
غم جانکاہ - ایڈیٹر ۳
جذبات مضطر - حضرت مضطر خیرآبادی ۵
نالۂ غم - ایڈیٹر ۶
قطعہ - مولوی محمد اکرم ۸
فلسفۂ محبت ، حضرت شاہزادہ قدسی - ۹
چین کا تمدن - ابوالمحاسن مولینا محمود علی خان ۱۶
غزل - ایڈیٹر ۲۴
حب الوطنی - مولینا ماہر - ۲۵
نوائے رزمی - مولینا سعید رزمی ۳۰
ایک التجا - حضرت مولینا نیاز فتحپوری ۳۱
غزل - مسٹر اعزاز الدین خاں ام - اے - ایل - ٹی بھوپالی ۳۲
نکات حکمت - مولینا ابوالقدس توحیدی - ۳۳
تجلیات سہا - حضرت سہا - (علیگ) ۳۵
سیہ کار مصلح - مسٹر مظفر علیخاں (علیگ) ۳۶
غم عجیب - مولوی قمر الحسن ۴۲
حیات محوی - مولینا محوی لکھنوی ۴۳
ناکام تمنا - مولینا سعیدی - بی - اے - علیگ - ۴۴
اسٹینلی - مسٹر انیس انصاری (علیگ) ۴۷
کلام بزم - حضرت بزم - اکبرآبادی ۴۹
عجمی دلہن در عربی نوشاہ - مولوی عبدالرزاق مصنف البرامکہ ۵۰
سحر سحر - حضرت سحر مرحوم ۵۵
شورش غم - مولینا شفق - ۵۶
کلام ذکی - حضرت ذکی وارثی ۵۸
تارا (فسانہ) - ایڈیٹر ۵۹
دنیائے اسلام - مولینا برکت علی ۶۴
کلام شہید - حضرت شہید مرحوم ۷۰
صدق و مومن - حضرت صدق جائسی ۷۱
مریم (ناول) - ترجمہ (ترجمان) ۷۲
پامپیا - (ناول) ترجمہ - برکت علی - ۷۵

(کتبہ نصیر الدین گلزار رقم)

اشارات

۱- خدا کا شکر ہے کہ "محسن الملک" کا دوسرا نمبر ہدیۂ ناظرین ہو رہا ہے۔

۲- ہمیں خدائے تبارک و تعالیٰ سے امید ہے کہ ہم "محسن الملک" کو جس معیار پر لانا چاہتے ہیں من جانب اللہ ہماری امداد ہوگی، اور "محسن الملک" بہت جلد ہندوستان کے ممتاز رسائل میں نظر آئے گا۔

۳- ہمنے ایک ادبی خدمت اپنے ذمہ لی ہے، اسلئے اُن حضرات کا جو ان خدمات میں سرگرم کار رہتے ہیں، اولیں فرض ہے کہ اپنے مفید مشورہ سے ہمیں ممنون فرمائیں

۴- ہم خصوصیت کے ساتھ، جناب محوی لکھنوی، مولانا سعید رزمی، اور حضرت صدق جائسی کے مشکور ہیں، جو رسالہ ہذا کو کامیاب بنانے میں سعیٔ خاص سے کام لے رہے ہیں

۵- ہم اُن احباب و حضرات کے بھی شکر گذار ہیں جو رسالہ کی سرپرستی اور اپنے مشورہ سے ہمکو ممتاز فرمارہے ہیں۔

۶- ہم ناظرین کو یقین دلاتے ہیں کہ "محسن الملک" کا ہر آیندہ نمبر انشاء اللہ گزشتہ نمبر سے بہتر صورت میں پیش ہوگا، جبتک کہ ہمارا مطمح نظر پورا نہ ہو جائے۔

۷- بھوپال کے قلب شکن سانحات نے ہمیں از خود رفتہ بنا دیا ہے، نواب عالیجاہ ولیعہد مرحوم و مغفور اور نواب محسن الملک فردوس مکان، کی بیوقت وفات نے، ہمکو جو کچھ صدمات پہونچائے ہیں اُن کا اظہار ناممکن ہے "خدا تعالیٰ پس ماندگان کو صبر عطا فرمائے۔

۸- حضرت مضطر خیرآبادی کے جذبات صادقہ واد سے مستغنی ہیں، موصوف کو مرحوم سے خاص تعلق تھا اور ملازمان مرحوم میں ایک امتیازی خصوصیت رکھتے ہیں، امید ہے کہ محسن الملک ہمیشہ آپکے افکار زریں سے ممتاز رہے گا۔

ایڈیٹر

غمِ جانکاہ

ہردم زمانہ داغ دگرگونہ می دھد
یک داغ نیک ناشدہ داغ دگر شود

۲۴ مارچ کو جس سانحۂ عظیم نے آنکھوں کو اشکبار اور دلوں کو گھائل کر دیا تھا، آہ! ابھی آنسو نہ تھمے تھے، زخمِ جگر بھی مندمل نہ ہوے تھے کہ ۳ ستمبر ۱۹۲۴ء کو پھر قیامت خیز حادثہ ہوگیا، جسنے آنکھوں کو خونچکاں اور قلب و دماغ کو پاش پاش کردیا۔

آہ! جنرل نواب **عبیداللہ خاں** بہادر کی رحلت کا حشر آشوب نظارہ ابھی محو نہیں ہوا تھا کہ سرعالیجاہ **نواب محمد نصراللہ خاں** بہادر ولی عہد بھوپال کی وفاتِ حسرت آیات نے اعصابِ دماغی میں طوفانِ قیامت پیدا کر دیا اور صبر و شکیبائی کا گریبان چاک چاک کر ڈالا۔

ایسے قیامت خیز حادثات کی مثالیں دنیا میں بہت کم ہونگی کہ چھ ماہ کے اندر سطوت و شوکت کے دو آفتاب غروب ہوگئے ہوں اور تاجِ حکومت کے دو درخشندہ موتی ٹوٹ گئے ہوں۔

پھر بھوپال کی فضا میں غم و اندوہ کی ظلمت چھاگئی ہے اور ہر شخص کرنل نواب محمد نصراللہ خاں کی بیوقت وفات پر وقفِ ماتم ہے۔

حضور سرکار عالیہ کے مجروح سینہ میں نواب ولیعہد کی رحلت کا جگر پاش صدمہ جو پہونچا ہے خدا ہی جانتا ہے کہ اس عالمِ ضعیفی میں فرزند اکبر کے اس داغِ مفارقت نے قلب و جگر کے گوشہ گوشہ میں اضطراب و ہیجان کا کیا طوفانِ عظیم پیدا کر دیا ہوگا۔

دشمن کو بھی خدا نہ دکھائے پسر کا داغ
نورِ نظر کو کھوتا ہے نورِ بصر کا داغ

آہ! مغفور کی عمر کا پچاسواں سال تھا کہ مشیت کا حکم پہونچ گیا، اور ایک ماہ چند روز کی علالت سخت (امراض گردہ وغیرہ) میں مبتلا رہ کر داعیِ اجل کو لبیک کہا، اور اپنے ہمراہ سیکڑوں ارمان و امیدوں کو لے گئے (ع) اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

طلسم کائنات میں یہ جگرِ دوز واقعات درسِ عبرت ہیں، کل تک جن تمناؤں کا ہجوم تھا جن نظاروں کو آنکھیں ڈھونڈھتی تھیں ان پر پردہ پڑ گیا۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ

نواب ولی عہد مرحوم و مغفور کی ہستی اہلِ بھوپال کے لئے ابرِ رحمت تھی وہ پُر آشوب زمانہ جبکہ پلیگ نے بھوپال میں ایک ہولناک نظارہ پیش کر رکھا تھا ہمنے بارہا دیکھا ہے کہ وہ محترم ہستی اپنے قلب کے گوشوں میں اضطراب اور بے چینی کی تپش لئے ہوئے گھر یباں میں گھبرایا کرتی تھی، اور بنی نوع کے ساتھ جس قدر ہمدردی اور عطوفت ہو سکتی تھی اُس کا اظہار اس ذات گرامی سے ہوا کرتا تھا۔

مرحوم و مغفور کے خصائل پسندیدہ میں مروت نے ممتاز جگہ لی تھی، آپ کو عفو و درگزر میں ہارون الرشید کی طرح ذوقِ لطیف ملتا تھا۔

آپ نے اپنی زندگی میں کبھی کسی ملازم کو برطرف نہیں کیا، اور اتفاقاً کبھی کوئی شخص علیحدہ ہوا بھی ہے تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اسکو گھر سے بُلا کر آغوشِ عطوفت میں لیا ہو۔

قدرت نے ان کو فطرتِ سلیم عطا فرمائی تھی، وہ وقار و تمکنت کے مجسم نمونہ تھے، آپنے جیسا کہ جسم ظاہری متین و خوبصورت پایا تھا ویسا ہی علم و اخلاق معنوی بھی، آپ اطاعت و فرمانبرداری والدین اور محبت و شفقتِ براداراں کا بہترین نمونہ تھے، وابستگان دامنِ دولت کو تلطف و اکرام خسروانہ کی آبشار ہمیشہ سیراب رکھتی تھی، آپ سیاسی و ملکی معاملات میں نہایت عمیق و مضبوط رائے رکھتے تھے علیا حضرت دام ملکہا نے اسٹیٹ کونسل کی وائس پریسیڈنٹ کا جلیل القدر عہدہ آپکو تفویض فرمایا تھا افسوس کہ مُلک آپ کے قیمتی تجربے، وسیع معلومات، اور فطری فیوض و برکات سے ہمیشہ کیلئے محروم ہو گیا۔

شبستان اقبال میں تین اولادیں چھوڑی ہیں۔

نوابزادہ محمد حبیب اللہ خاں صاحب بہادر آپ کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ اور نوابزادہ محمد رفیق اللہ خاں صاحب بہادر چھوٹے۔ آپ کی ایک صاحبزادی بھی ہیں۔

خدائے تعالیٰ پسماندگان کو صبر، صاحبزادگان والاشان کو با اقبال، اور مرحوم کو غریقِ رحمت فرمائے (آمین)

ایڈیٹر

٥

جذباتِ مضطر

یہ سب کے کاندھوں پہ کسکی میت زمیں میں گڑنیکو جا رہی ہے — کہ جسکی حسرت پہ آسماں کی گھٹا بھی آنسو بہا رہی ہے

صدائے تخصیص دے رہا ہے یہ کس کا اقبال پیچھے پیچھے — یہ کسکی حشمت ہے آگے آگے جو کوسِ رحلت بجا رہی ہے

یہ کسنے چھوڑا ہے باغِ دنیا یہ کون جاتا ہے مُلکِ عقبیٰ — یہ آج کیا ہے خدا کی رحمت جو پیشوائی کو آ رہی ہے

یہ پھول کسکا چلا عدم کو کہ جتنے پتے ہیں سرنگوں ہیں — شمیم گلیاں بسا رہی ہے نسیم کاندھا لگا رہی ہے

قریب آئے تو میں یہ دیکھوں کہ کون جاتا ہے مُنہ چھپائے — کہ جسکے لاشے کے ساتھ خلقت لہو کے آنسو بہا رہی ہے

یہ کہکے آگے بڑھا تو دیکھا کہ اک خدائی ہے وقفِ ماتم — نشانِ بخشش ہے آگے آگے سواری آقا کی جا رہی ہے

یہ شیر کس کا اُٹھا جہاں سے کہ جانور بھی ہیں وقفِ زاری — پہاڑ رہ رہ کے گونجتے ہیں ہوا میں آواز آ رہی ہے

ہزار افسوس آشیانہ بنا تھا جس شاخ پر ہمارا — وہ شاخ دستِ اجل سے کٹکر زمیں میں گڑنیکو جا رہی ہے

یہ کیسا تیرِ الم لگا ہے کہ جس سے سینہ ہے پارہ پارہ — یہ کیسی غم کی چُھری گری ہے کہ دل کے ٹکڑے اُڑا رہی ہے

حضورِ سرکارِ عالیہ سے ہوا ہمیشہ کو کون رخصت — کہ جسکے ماتم میں مامتا بھی قلق کے نعرے لگا رہی ہے

یہ کسنے چھوڑا حبیب اپنا یہ کسنے چھوڑا رفیق اپنا — کہ آج دونوں کی بیٹھنے کو صفِ یتیمی بچھا رہی ہے

وہ صوتِ ماتم جو کوہِ شملہ پہ اس سے کچھ قبل گونج اٹھی تھی — اب آج کوہِ حبیب منزل سے وہ ہی آواز آ رہی ہے

حریمِ عشرت کے ساکنوں پر یہ کیسے دو دو پہاڑ ٹوٹے — خدا کی قدرت کو کوئی دیکھے یہ کیسے ماتم دکھا رہی ہے

ہماری سرکار کے چمن میں خزاں کو اللہ اب نہ لائے — یہ جتنے گُل ہیں سلامت انہیں کی باقی فضا رہی ہے

خموش ہو جا زبانِ مُضطر بیاں کریگی یہ غم کہاں تک
مقامِ عبرت ہے باغِ دنیا کب اسکی یکساں ہوا رہی ہے

مضطر خیرآبادی

نالۂ دل

یکایک ہم غریبوں پر یہ کیسا انقلاب آیا
جسے صدیوں نہ آنا تھا وہ کیوں اتنا شتاب آیا
ہماری کن خطاؤں پر الٰہی یہ عتاب آیا
کہ تاریکی کے پردے میں ہمارا آفتاب آیا

غروب مہر عالمتاب بھی حامل قیامت ہے
زباں پر آ نہیں سکتی ہے جو کچھ دل کی حالت ہے

ابھی کا واقعہ ہے جو ہر اک مصروف ماتم تھا
وفات یک بیک سے مضطرب عالم کا عالم تھا
یہ صدمہ اے فلک ہم بیکسوں کے دل کو کیا کم تھا
کہ اُسکے ساتھ ہی پھر قسمتوں میں دوسرا غم تھا

ستم ڈھائے ہیں اس درجہ حوادث ہائے عالم نے
کہ اپنی جان دینے کا تہیہ کر لیا ہم نے

عبداللہ خاں کی موت پر ہر شخص روتا ہے
ہر اک چھوٹا بڑا اشکوں سے دامن کو بھگوتا ہے
نہ دن کو چین آتا ہے نہ شب کو کوئی سوتا ہے
جدھر دیکھو ادھر بس اک انہیں کا ذکر ہوتا ہے

نہ کیونکر کوہِ غم ٹوٹے بھلا اُس قوم کے دل پر
کہ جسکی کشتیِ امید ڈوبے آکے ساحل پر

تجھے بھی کچھ خبر ہے او ہمارے قائد اعظم
کہ تیری موت نے کیا کچھ ہمارا کر دیا عالم
سکوں کس طرح پائے ہم غریبوں کا دلِ پُر غم
کہ اب مونس رہا کوئی نہ باقی ہے کوئی ہمدم

یہ اتنی جلد تو نے کس لئے ہم سب سے منہ موڑا
ہمارے رشتۂ امیدِ مستقبل کو کیوں توڑا

ترے بے وقت مرنے نے ہمیں ڈو مارا ہے
کہ کوئی آسرا ہے اور نہ اب کوئی سہارا ہے
شکستہ کشتیاں ہیں اور کوسوں پر کنارا ہے
نہ چپ رہنے کا موقع ہے نہ کچھ کہنے کا یارا ہے

خدا کے واسطے اس وقت کچھ امداد ہو جائے
ذرا سی دیر ہی ہم بیکسوں کی یاد ہو جائے ''

ترے جذبات و احساسات تھے ایسے شریفانہ — کہ جن کا معترف ہے آج اپنا اور بیگانہ
چراغِ گل شدہ پر بھی تو دنیا بھر ہے پروانہ — دلوں میں تیری الفت ہی لبوں پر تیرا افسانہ

جسے دیکھو وہ حسرت سے تجھی کو یاد کرتا ہے
اسی پہلو سے تسکینِ دلِ ناشاد کرتا ہے

ضعیفوں کی مدد کے واسطے تیری جوانی تھی — جوانوں پر تری موجِ سخاوت کی روانی تھی
ترے قصے میں پوشیدہ ہماری سب کہانی تھی — ہماری زندگی کا راز تیری زندگانی تھی

غرض ہم سب ہوائے دامنِ شفقت میں پلتے تھے
نسیمِ لطف کے جھونکے برابر ہم پہ چلتے تھے

ترا الطاف اپنوں اور غیروں سب پہ یکساں تھا — ترے اخلاق کا مداح ہر ملت کا انساں تھا
ہماری ظلمتوں کے واسطے مہرِ درخشاں تھا — غرض سر تا قدم تو صنعتِ صناعِ دوراں تھا

مگر دورِ مسرت میں یہ کیسی ساعتیں آئیں
کہ اک حسرت بھری دنیا کے سر پر آفتیں آئیں

ہمیں تجھ سے محبت تھی، تجھے ہم سے محبت تھی — ہمارا حال جو کچھ تھا وہی تیری بھی حالت تھی
مقدر سا مقدر تھا ترا، قسمت سی قسمت تھی — کہ یاں آغوشِ مادر، اور وہاں آغوشِ رحمت تھی

اگر دنیا سے جاتا ہے، تو جا، اللہ کو سونپا
خدا کے لاڈلے، حضرت رسول اللہ کو سونپا

ایڈیٹر

قطعۂ تاریخ

محسن الملک عبید اللہ خاں کز وصفِ او
بر زباں اکنوں نمانَد جز بہ خیر الواصلین
آہ! از دنیا گزشت و شکر کش اعمال او
بقعۂ نامید ہم پہلوے راس المتقین
گفت رضواں وقتِ عرشش سوے جنّت النعیم
حسبِ فرمانِ الٰہی "اُدخُلوھا خالدین"
۱۳۰ھ ۴۲

محمد مکرم

کام کوئی مجھے باقی نہیں مرنے کے سوا
کچھ بھی کرنا نہیں اب کچھ بھی نہ کرنے کے سوا
موت سے ڈرتے ہیں اب پہلے یہ تعلیم نہ تھی
کچھ نہیں آتا تھا اللہ سے ڈرنے کے سوا
(اکبر)

کلام الملوک ملوک الکلام، غنی غزل

اعلیحضرت قدر قدرت حضور پرنور ہز ہائنیس نواب میر علی نواز خاں صاحب بہادر، والی خیرپور سندھ، المتخلص بہ ناز

حضور ہز ہائنیس نواب میر علی نواز خاں صاحب بہادر کی ذات ستودہ صفات، ایک ایسی باخیر ہستی ہے جسکے چشمۂ سخا و کرم سے ہزارہا بندگان خدا سیراب ہو رہے ہیں، اور چار دانگ ہند میں ممدوح کی شہرت بقائے دوام کا تاج زیب سر کر چکی ہے، جود و سخا کی یہ حالت ہے کہ کوئی متنفس آستانۂ عالی سے محروم واپس نہیں آتا۔ آپ مروت و اخلاق کا بہترین نمونہ ہیں۔ ہم ممدوح کو اس وقت دنیائے ادب کے ایک تاجدار کی شان میں دیکھ رہے ہیں۔ حضور والا کو ادبیات سے اس قدر دلچسپی ہے کہ جسکی مثال مشکل پائی جائیگی ممدوح کا رنگ تغزل کچھ ایسا بہتر رنگ ہے کہ سامعہ وجد کرنے لگتا ہے اور باصرہ غرق حیرت ہو جاتا ہے۔

حضور انور کی غزلیات جسقدر بھی ہماری نظر سے گذری ہیں ان میں کچھ ایسے جذبات پائے گئے ہیں کہ طبیعت بیچین ہو گئی ہے اور بلحاظ فن بھی ان غزلیات کو ایسا ہی جامع پایا ہے ہم اسوقت ممدوح کی مندرجہ ذیل غزل سے "محسن الملک" کو زینت دیتے ہیں۔ ایڈیٹر

غزل

ذکرِ کلیم و برقِ طور چھپ کے نہ تو سنا کہ یوں
پردہ اُلٹ کے آج تو سامنے آہی جا کہ یوں

کھچتی ہے تیغ کس طرح کھینچ کے مجھ بتا کہ یوں
کٹتی ہے عمر کسطرح کاٹ کے سر دکھا کہ یوں

بزم عدو و چمن سہی میں بھی سمجھ گیا کہ یوں
گل تو ہزار کھلتے ہیں یہ نہ مگر کھلا کہ یوں

عرض کی، پردہ چاہیئے غیروں کے روبرو تو کچھ
دیکھنا شوخی مجھ سے ہی منہ کو چھپا لیا کہ یوں

ہاں تمھیں مجھ سے کیا غرض، مجھ ہی کو واسطہ نہی
ناز نہ ہو، ادا تو ہو، یوں ہوا مدعا کہ یوں

قصد تھا کوئے یار میں اڑ کے پہنچنا چاہیئے
شکل کو میری دیکھکر رنگِ رُخ اڑ گیا کہ یوں

ایک وفا پرست ہے ایک جفا شعار ہے
دل کا ہے مُدعا کہ یہ، اُنکا ہے اِدعا کہ یوں

دیر بھی ہے حرم بھی ہے سجدہ کروں میں کسطرف
حکم بتوں کا ہے اِدھر، فرض رہِ خدا کہ یوں

میں نے کہا کہ اب تو آپ ظلم سے ہاتھ اُٹھایئے
تیغ اُٹھا کے ہاتھ سے، بولا وہ بے وفا کہ یوں

پوچھا جو میں نے بھول کر حشر اُٹھے گا کس طرح
پہلو سے اُٹھ کے یک بیک مجکو بتا دیا کہ یوں

مرنا تھا تم پہ مر گئے، موت نہ آئی، آیا دل
ہمکو تو اپنے کام سے کام تھا یوں ہوا کہ یوں

پوچھا جو اہل کعبہ نے دیر میں کس طرح کٹی
شرم گناہ نے مرے سر کو جھکا دیا کہ یوں

ہجر نے موت کی پسند میں نے تمہارے جور و ظلم
تم ہی پہ منصفی رہی ہوتی ہے یوں وفا کہ یوں

فرق تو اعتبار میں ناز ترے کہیں نہ تھا
اُن سے بگڑ گئی ہے کیوں بات تو کچھ بتا کہ یوں

۹

فلسفۂ محبت

اور سببِ تخلیقِ کائنات

جب کچھ نہ تھا صرف ایک نورِ فضائے بے نشاں میں جلوہ فگن تھا جو خود اپنے جمالِ بے مثال میں محو و مستغرق تھا، اسی عالمِ استغراق و محویت میں خیال پیدا ہوا "کاش ہمارے حُسن کی بہار دیکھنے والا کوئی ہو" وہ نور فضائے بے نشاں میں ایک گلِ خوش رنگ بنکر باآب و تاب نمودار ہوا جسکی خوشبوئیں ہر طرف پھیلنے لگیں، گل نے ہر طرف اپنی رنگ و بوکی بہار کا لطف اُٹھانے والا کسی کو نہ دیکھ کر جنبش کی ایک طائرِ صد رنگ فضائے بے نشاں میں نمودار ہو کر گردِ گل طواف کرنے لگا۔ یہ ایک نورانی روح تھی جو گل سے پیدا ہوئی، گویا یہ گل کا ایک حکم یا امر تھا، جو لبشکل طائر نمایاں ہوا۔

خوشبوئیں فضائے بے نشاں میں ہر طرف پھیل رہی تھیں، جو طائر میں بس گئیں، طائر مست ہو گیا اور حالتِ بے خودی میں بجوشِ محبت سے مدہوش ہو کر اپنی منقار کو ورقِ گل پر جھکا دیا گویا سرِ تسلیم خم کر کے اقرارِ اطاعت کیا، اس فعلِ مجنونانہ و حرکتِ گستاخانہ سے غیور و صاحبِ جلال گل نے اپنی خوشبوؤں کو جو فضائے بے نشاں میں پھیلی ہوئی تھیں حکم دیا کہ اس طائر کو زندانِ ہجر و مفارقت میں مقید و محبوس کر دیں، حکم کی دیر تھی کہ تعمیل ہو گئی۔

بظاہر تو یہ سزائے گستاخی تھی لیکن حقیقت میں امتحانِ محبت مقصود تھا۔

(۲)

طائر جو جمالِ گل کا ایک سچا عاشق بلکہ حقیقتاً گل ہی کا ایک جزو تھا، قیدِ مفارقت میں رہنے لگا، مگر لب پر گل کے نامِ پاک کے سوا کوئی اور کلام نہ تھا، بے شمار اسمائے صفاتی اپنے معشوق کی تعریف میں طائر نے موزوں کئے، جذباتِ صادق کے سبب ہر اسم میں بے شمار تاثیرات اور ہر تاثیر میں بے شمار اسرار ہوتے تھے، جس سے طرح طرح کی عجائب و غرائب اور قسم قسم کی خلقت ہویدا ہونے لگی۔ اور ان گنت پرندے دو دو اور چار چار پر والے پیدا ہونے شروع ہو گئے جنکو عرفِ عام میں موکل، ملائکہ اور فرشتوں کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

حقیقت کائنات

معشوقِ پاک نے اپنے دستِ قدرت سے ایک پُتلا اپنی پسندیدہ شکل و صوّرت کا بنایا جسمیں ہر قسم کی طاقتیں تاثیریں، اسرار، اور جذبات بھر دیئے، "قلب" پتلے میں ایک خوشنما عجائب خانہ بنایا جسمیں بے شمار حجرے اور ہر حجرہ میں بے شمار عجائبات رکھے، وسط میں ایک عالیشان حجرہ کو جو بہت آراستہ تھا اور جسمیں ہر طرف بیشمار پردے پڑے تھے، خود اپنا مسکن قرار دیکر جلوہ افزائی فرمائی، اور اپنے عاشقِ صادق "طائر" کو جو فضاے بے نشاں میں ابھی محض ایک روحِ نورانی تھا، اس پتلے میں طلب فرمایا، چونکہ گُلِ پاک نے اپنے عاشق طائر کو بوقت طلبی دم کہکر مخاطب فرمایا تھا بحکم- آ- وہ طائر اس پتلے میں فوراً در آیا اور بتاثیر خطاب لفظِ- دم- خون بنکر گردِ گُل طواف کرنے لگا- پتلے میں خون کی گردش سے ایک حرکت پیدا ہوئی، تمام طائر سربسجود ہوے اور اس پتلے کو آدم کہنے لگے-

وہ آدم میں ہی ہوں، میرا معشوق میرے اندر ہی موجود ہے، لیکن چونکہ بے شمار پردوں میں ہے اس لئے میں اُسکو دیکھ نہیں سکتا، ایک چھوٹا سا پردہ جو بشکل نقاب اُسنے اپنے رخِ انور پر ڈالا ہے کس قدر غیر متناہی ہے جسکو عرفِ عام میں فلک یا آسمان کہتے ہیں، بڑے پردوں کا تو کچھ حساب نہیں-

(۳)

تمہید

انسان بجاے خود ایک عالم ہے، انسانی ہستی کے قوام کا ہر ہر ذرہ بتا رہا ہے کہ وہ کائنات کے جملہ محسوسات و مدرکات کا مجموعہ ہے، بلکہ وجودِ آدمی ہی اصل کائنات ہے، یہ عالم ظاہر عکس یا سایہ ہے جو قوتِ وہمیہ کے سبب ظہور میں آیا اور متخیلہ نے ایک خاص رنگ و انداز اور ایک مخصوص شکل و صوّرت کے ساتھ نمایاں کر دکھایا:-

مجذوب کی بڑ

جانِ عالم! ذرا کان لگاکر سُننا وہ دیوانہ جسکو سب مجذوب کہتے ہیں، کیا بک رہا ہے؟

کس سے نسبت چہرۂ تاباں کو دوں

ماہ کامل میں بھی دھبّا ہو گیا،

میرا معشوق اس قدر حسین ہے کہ اُسکے جمال جہاں آرا کے دیکھنے کی کسی کو تاب نہیں، گویا سراپا مجسّمہ نور ہے، اُسکے چہرۂ منور سے شعاعیں نکلتی ہیں اسی لئے اُس نے اپنے رُخ پر نور پر نقاب ڈالا ہے، مینے بھی بے تابی و اضطرار کی حالت میں آہیں کرکر کے اسکے نقاب کو نورانی کردیا جسمیں سے اس کا نور اور اُسکے چہرۂ زیبا کی شعاعیں چھنکر مجھ تک

آنے لگیں ؎

وہ سامنے بھی ہوا تب بھی میں نہ دیکھ سکا

رہا حجاب کا پردہ نقاب کی مانند،

اس نیم حجابی نے آتشِ اشتیاق کو اور بھی بھڑکا دیا، اب تو آہوں میں اکثر دھواں اُٹھنے لگا جسکو سادہ لوح ابر یا بادل کہتے ہیں، جس گھڑی بیقرار ہو کر آہ کرتا ہوں اہلِ عالم سمجھتے ہیں کہ بادل گرجا گویا میری آہوں کا نام رعد یا گرج رکھا ہے، جب میری مسلسل آہیں باہم ٹکراتی ہیں تو اُن میں سے میری سچی محبت کے جذبات شعلہ بن کر نکلتے ہیں جسکو اہلِ عالم برق یا بجلی کہتے ہیں ؎ کس برقِ تجلی سے مجھے عشق ہوا ہے

ہر آہ میں ہے صاعقۂ طور کا عالم،

چمک جاتی ہے بجلی آسماں پر

ہمارے نالۂ آتش فشاں سے

جب میں نالے کرتے کرتے تھک جاتا ہوں اور میری محبت خود کو اُس معشوقِ حقیقی کے مقابل نہ پاکر عرقِ انفعال میں غرق ہو جاتی ہے، اُس وقت میری پیشانی سے جو پسینہ ٹپکتا ہے اُسکو دنیا والے بارانِ رحمت کہتے ہیں۔

جب آہیں کرتا ہوں تو میرا نفس بادِ صرصر کے تند جھونکے بنکر سارے عالم میں منتشر ہو جاتا ہے اہلِ دنیا اُسکو بارانِ رحمت کی آمد کا پیش خیمہ خیال کرتے ہیں، جب میری محبت کی پیشانی سے ندامت و خجالت کا پسینہ ٹپکتا ہے کائنات میں ایک تروتازگی نمودار ہوتی ہے، جب منفعل ہو کر بحرِ سکوت میں مستغرق ہوتا ہوں تو میرا نفس بادِ صبا کی خوشگوار لہریں بن کر فضائے عالم میں منتشر ہو جاتا ہے، اہلِ دنیا اسکو موسم سرما سے تعبیر کرتے ہیں۔

رخِ انور کے نقاب کو جسے آسمان یا فلک کہتے ہیں میری آہوں نے چھلنی تو کر ہی دیا جس میں سے نورانی شعاعیں چھنکر نکلنے لگیں اور اہلِ عالم نے اپنی سادہ لوحی سے اُس چھلنی نما نقاب کے چھوٹے بڑے روزنوں کو تاروں کے نام سے منسوب کر لیا، یہ تو جو عاشق ہے وہی سمجھ سکتا ہے کہ پس پردہ جلوۂ معشوق ہے؛

آتشِ حسن جہاں سوز کو دیکھوں کیوں کر

اُسکے دیدار کا یارا نہیں رکھتیں آنکھیں

جب تک تصورِ معشوق میں آنکھیں بند کئے بیٹھا رہتا ہوں اُس وقت تک تمام کائنات میں اُجالا رہتا ہے کیونکہ میرا مرکزِ تصور مجسم نور بنکر نہایت درجہ شدت کی آب و تاب کے ساتھ چمکنے لگتا ہے، جب زیادہ اضطراب و جوش کے ساتھ تصور کرتا ہوں تو میرے مرکزِ تصور سے آتشیں لپٹیں نکلنے لگتی ہیں اہلِ عالم اسکو موسم گرما کہتے ہیں، میرے مرکزِ تصور کا نام اہلِ عالم نے خورشید یا آفتاب رکھا ہے، سورج بھی اسی کو کہتے ہیں، اور بھی

بہت نام ہیں غرض ہر ملک والے اپنی زبان میں میرے حرکات وافعال کے نام رکھ لیتے ہیں ۔

صورت ہے نقش اُن کی دلِ صاف میں مری
یہ آئنہ ہے بس اسی تصویر کے لئے ،،

میرے معشوق پاک نے ازراہ قدردانی میرے مرکز تصور کو مرکز فیضان قدرت قرار دیکر عجیب وغریب تاثیر اس میں پیدا کردی جس سے ہیجدہ ہزار عالم کی نشو ونما ہوتی ہے، مگر چونکہ اس مرکز تصور میں ہجر وفراق کی آتش شعلہ فشاں تھی اس لئے میرے رحیم وکریم معشوق نے ایک سرچشمہ میں میرے مرکزِ تصور کا عکس بھی اُتارا جو اہل عالم کے لئے ایک کثیر المنافع کرۂ نور سمجھا جانے لگا جسکو چاند یا قمر کہتے ہیں جب مرکزِ تصور میں غور کرتے کرتے معشوق پاک کے جمالِ جہاں آرا کی زیارت سے مشرف ہوتا ہوں اور وہی نقش ونگار دیکھ کر محوِ حیرت ہوتا ہوں تو نہایت درجہ بے قراری وبے تابی کے ساتھ دیدارِ کامل کے اشتیاق میں آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ مرکزِ تصور جسکو محض میری قوت متخیلہ ومتفکرہ نے پیدا کیا تھا غائب ہو جاتا ہے، تمام کائنات پر ایک تاریکی اور اندھیرا طاری ہو جاتا ہے جسکو اہلِ عالم رات یا شب کہتے ہیں ؎

تا صبح یادِ رخ میں جھپکتی نہیں پلک
عاشق تمہارے عابدِ شب زندہ دار ہیں

اکثر شب کو میرے مرکزِ تصور کا عکس جو سرچشمہ میں پڑتا ہے قائم رہتا ہے اور وقتاً فوقتاً نظام عالم کے قانون کے بموجب اہل عالم کو نظر آتا رہتا ہے اور اس سے مخلوق استفادہ حاصل کرتی رہتی ہے، اس عکس کا باوجود مستقل قیام کے مختلف وقتوں میں نظر آنا اس سبب سے ہے کہ نقابِ رخِ جاناں کو میری آہیں ہر وقت متحرک وجنباں رکھتی ہیں، پس نقاب کی گردش کے باعث مختلف وقتوں میں نظر آتا ہے، اگرچہ میرا مرکزِ تصور بھی نقاب پر قائم ہوتا ہے مگر چونکہ وہ اصل چہرۂ منور کا تصور ہوتا ہے اور پھر پوری قوتِ ارادی سے ظہور میں آتا ہے اس لئے نقاب کی گردش کے باوجود بھی وہ پوری آب وتاب دکھلاتا ہے اور اس مرکزِ تصور میں جو حرکت وگردش پائی جاتی ہے یہ میرے ہی جذبات کی رفتار ہے، حقیقت میں یہ میری قسمت کا چکر ہے ؎

میری گردش سے سدا رہتا ہے گردش میں فلک
سارے عالم کو گھماتا ہوں وہ چکر ہوں میں ،

یہ زمین جسکو صفحۂ ارض یا تودۂ غبرا یا عاسق کہتے ہیں، معشوق حقیقی نے محض میری دشت نوردی وبادیہ گردی

کے لئے بنائی ہو تاکہ آبلہ پائی کا لطف بھی حاصل ہو۔

تیرے دیوانہ کو کم ہے وسعتِ صحرائے ارض
جوششِ وحشت کہہ رہا ہے اور صحرا دیکھئے

میری بادیہ پیمائی کے ساتھ ساتھ زمین بھی رفاقت کرتی ہے اور میری طرح وہ بھی ایک گردش اور چکر میں ہے اسی سبب سے میرا مرکز تصور بہت تیزی کے ساتھ چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور وقت کی تمیز اور ساعت کا امتیاز ہوتا ہے؟

حضرتِ خضر بھی واقف نہیں جس کوچے سے
اُس بیابانِ بلاخیز کا رہبر ہوں میں

چشمۂ حیواں یا آبِ حیات کیا چیز ہے؟ یہ میری روح کے غسل کا پانی ہے، معشوقِ پاک نے ازراہِ قدردانی اُس پانی میں تاثیرِ حیات بخشی ہے جو ایک گھونٹ پیے حیاتِ ابدی حاصل ہو، چنانچہ مشہور ہے کہ خواجہ خضر نے جب کہ وہ ذوالقرنین کے ساتھ اس چشمہ پر پہونچے ایک گھونٹ پانی پیا تھا اسی سبب حیاتِ جاودانی پائی۔

شہابِ ثاقب کیا ہے؟ یہ بھی میری آہوں کی چنگاریاں ہیں، جب کوئی شرارہ میری آہ کا کسی پہاڑ سے ٹکرا جاتا ہے آگ لگ جاتی ہے اور پہاڑ جلنے لگتا ہے، اہلِ عالم اُسکو کوہِ آتش فشاں کہتے ہیں۔

قیامت کا راز بھی سمجھنے کے قابل ہے! جب میری پاک روح عشقِ حقیقی میں کامل ہو کر ذاتِ معشوق میں فنا ہو جائے گی یعنی وصال ہوگا تو میرا یہ جسمِ ظاہر جو ایک ہستیٔ موہومہ ہے نابود ہو جائے گا، اسی کا نام قیامت ہے، کیونکہ یہ جو کچھ بھی کائنات نظر آرہی ہے محض میرے جسمِ ظاہر کا عکس یا سایہ ہے، جب جسم نہ ہوگا تو یہ سب کارخانہ بھی مٹ جائے گا۔ پھر میرا معشوق میری مسرتوں کے لئے ایک نئی کائنات پیدا کرے گا گویا اسی فنا شدہ کائنات پر میرے غسل کا پانی ڈالیگا جس سے از سرِ نو ایک عالم نمودار ہوگا جس میں ہر شئے کو پائداری اور ہر جاندار کو ابدی زندگانی اور دائمی شادمانی و کامرانی حاصل ہوگی، اس کا نام جنت، خلد، فردوس، بہشت اور ارم ہے، البتہ جو اہلِ عالم کہ میرے عشق پر مضحکہ کرتے ہیں یا میرے معشوق کے منکر ہیں یا اُسکی یکتائی و بے ہمتائی کے قائل نہیں اُن پر بے شک اُس دن میرے معشوق کا عتاب ہوگا اور اُسکے انعام و اکرام سے یہ مضحکہ کرنے والے اور اُسکے منکر محروم رہیں گے بلکہ اُن کے لئے میری تمام آہیں اور ان کا دھواں اور ان کی چنگاریاں ایک جگہ جمع کردی جائیں گی جس کا نام دوزخ یا جہنم ہوگا، یہ سب منکر اور مضحکہ کرنے والے اُس میں ڈالدیے جائیں گے

میرے ابتداے عشق کے زمانہ میں جب کہ ایک گستاخی کی جرم کی سزا دیگئی تھی میں ہجراں نصیب بہ سبب غمام کاری شب و روز رویا کرتا تھا آنکھوں سے آنسو کے دریا رواں تھے اور اس کثرت سے تھے کہ کرۂ ارض کے گرداگرد ایک نہر کی طرح بحر بے پایاں بنگیا جسکو اہلِ عالم اوقیانوس یا سمندر کہتے ہیں۔ گویا یہ دنیا میرے آنسوؤں کے حوض میں مثل ایک گیند کے تیر رہی ہے ؂

برس پڑینگی جو آنکھیں سحاب کی مانند
بہے گی کشتی گردوں حباب کی مانند

اب کہیں اگر پھر آنکھیں برس پڑیں تو گردونِ گرداں کشتی کیطرح تیرے گا گویا آنسوؤں کا دریا عالمِ بالا کا بھی احاطہ کرلے گا اور میری مشتِ تصور بھی غوطہ کھانے لگیگی۔

سبحان اللہ! کیا اچھا عشق ہے اور کیا اچھا معشوق ہے، نادان ہیں وہ لوگ جو چند روزہ اور عارضی حسن پر فریفتہ ہوکر جھوٹی باتیں بناتے ہیں، یہ تو بوالہوسی اور شہوت پرستی ہے ؂

سر مد غمِ عشق بوالہوس را نہ دہند   سوزِ دلِ پروانہ مگس را نہ دہند

شایاں نہیں کسی صنمِ بے وفا سے اُنس
توفیق ہو تو کیجئے پیدا خدا سے اُنس

سچا عشق اور پاک عشق تو وہ ہے جو سچے اور پاک معشوق سے ہو، پس ایسا معشوق ایک ہی ہے جسکی کوئی نظیر نہیں، وہ بالکل بے عیب اور پاک ہے ؂

ٹھیرگی نظر غیر کی کب حسن پہ اون کے
اندھے کو نظر آئیگا کیا نور کا عالم

جو لوگ معشوق حقیقی کے عشق میں فنا ہو جاتے ہیں اُن کو میری طرح دائمی زندگی اور ابدی وصال حاصل ہوتا ہے، لوگ مجھے دیوانہ کہتے ہیں، لیکن دیکھو اب اگر میں بظاہر مر بھی جاؤں تو میرا نام قیامت تک بلکہ اس کے بعد بھی ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیگا۔

دیکھو میرا رنگ زرد ہے، جسم میں خون برائے نام ہی ہوگا، ہڈی اور چمڑے کے سوا گوشت کا

نام نہیں، بس یہی عشق کی پہچان ہے۔

اَے دلدادگانِ حُسن وعشق! آؤ تم بھی ایک وحدہٗ لاشریک معشوق کے حُسن پاک کے حقیقی اور سچے عاشق بنو تاکہ میری طرح تمہارا بھی ابد الآباد تک نام زندہ رہے۔

اہلِ جنّت کی عشرت کے لئے علاوہ اُن نعمتوں کے جو اُنھیں ملیں گی ہر ایک کو میرے پرستاروں میں سے جو نہایت خوبصورت ارواح ہیں جنکو حور کہتے ہیں، چند چند عطا فرمائی جائیں گی، سب اہل جنت میرے نام کے گیت گائیں گے اور میں اپنے معشوق پاک کے آغوشِ رحمت میں بیٹھا ہوا سب کی نغمہ سرائی سے محظوظ و مسرور ہو کر اپنے معشوق کے قدم بار بار چومتا رہوں گا . . . . . ،

جانِ عالم! سُنا، مجذوب کیا بڑ لگا رہا ہے، یہ بھی عجیب لوگ ہوتے ہیں جو دل میں آتا ہے بکتے ہیں، مگر حقیقتاً ان دیوانوں کی تقریر میں معانی و مطالب ضرور ہوتے ہیں جو بہت غور کے بعد سمجھ میں آتے ہیں۔

سچ تو یہی ہے کہ آغازِ دنیا محبت سے ہوا اور ہر ذرہ عالم کا محبّت کے شیرازہ میں بندھا ہوا جکڑا ہوا نظر آرہا ہے، انسان کی زندگی کا مدعا محبت الٰہی ہے، دنیا ایک امتحان گاہ ہے، چند روزہ قیام کے بعد اصلی وطن کی طرف مراجعت ہوگی لپس اس درسگاہ سے کامیاب ہی ہو کر جانا چاہیئے، تاکہ ہم چشموں میں رسوائی نہ ہو، دنیا کا سب کارخانہ موہوم ہے اور فانی ہے، بے ثباتیِ عالم سے سبق حاصل کرنا، اور حوادثِ عالم سے نتائج اخذ کرنا ہر ذی شعور کو لازم ہے تاکہ روحانی مسرت حاصل ہو۔

دُنیا سرا ئے فانی ہے
ہر چیز آنی جانی ہے

شمع بن محفلِ معشوق میں جلنے کے لئے
چشم بینا سے جو کی گلشن ہستی پہ نظر
جو ہیں پروانۂ شمعِ رُخِ زیبائے صنم
عشقِ کامل ترے صدقے کہ بھٹکنے نہ دیا
کیوں نہ مرجائیں تری یاد میں مرنے والے

(نظم)

بس یہی شان ہے اک رنگ بدلنے کے لئے
شجرِ عشق ملا پھولنے پھلنے کے لئے
بزمِ ہستی میں وہی آئے ہیں جلنے کے لئے
پاؤں پھیلائے بہت دل نے مچلنے کیلئے
دل ہے آنے کے لئے جان نکلنے کے لئے

چین کا تمدن

چین کے تمدن پر کچھ لکھنے سے پہلے ملکِ چین کی جغرافی تحدید ضروری ہے، چینی خصوصیات صرف اُسی حصۂ ملک میں پائی جاتی ہیں جسے ہم اصلی چین کہتے ہیں۔ منگولیا۔ منچوریا۔ ترکستان۔ اور تبت۔ اسمیں داخل نہیں ہیں، یہ ممالک اگرچہ ایک ہی سلطنت کے اجزا ہیں مگر بلحاظ تمدن و معاشرت اصلی چین سے کوئی بہت مشابہت و مناسبت نہیں رکھتے۔

اصلی چین کی ساحلی آبادی اندرونِ ملک کے باشندوں سے سرعتِ فہم اور ذہانت میں خاص امتیاز رکھتی ہے، خود اہلِ چین کا خیال ہے کہ پہاڑوں میں فضیلت و شرافت اور پانی میں حکمت پیدا ہوتی ہے گویا ان کے نزدیک فضیلت و حکمت کا مفہوم ایک جگہ جمع نہیں ہوتا۔

شمالی اور جنوبی باشندوں میں ہمیشہ سے مخالفت چلی آتی ہے جسکی بنا پر گزشتہ زمانہ میں بڑی بڑی لڑائیاں برپا ہوئی ہیں، چین کی مردم شماری کے متعلق اختلاف ہے، اور تیس کروڑ سے چالیس کروڑ تک بتائی جاتی ہے۔ یہ آبادی اسقدر ہے کہ اگر ہم کرۂ زمین کے گرد ایک سڑک فرض کرلیں اور اُسپر یکے بعد دیگرے چین کے لوگ چلنا شروع کردیں تو یہ رفتار کبھی ختم نہ ہوگی، کیونکہ کُل زمین کا دورہ کرنے میں جتنا وقت صرف ہوگا اس عرصہ میں آنے والی نسل چلنے کے لئے تیار ہوجائیگی۔ اور اسطرح یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا، مردم شماری کے متعلق قدیم زمانے سے اہلِ چین دلچسپی لیتے چلے آئے ہیں وہ مختلف اغراض کے لئے نہایت منتظم طریقے پر مردم شماری کرتے تھے قدیم ماخذوں سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۲ عیسوی میں چین کی آبادی پانچ کروڑ تھی۔

عام خیال یہ ہے کہ چین کی زبان ایک ہے لیکن حقیقت میں چینی زبان آٹھ طریقے پر بولی جاتی ہے۔ یہ مختلف لہجے آپس میں ایک دوسرے سے کامل اختلاف رکھتے ہیں۔ شنگھائی کا باشندہ۔ اہلِ چین کی زبان

نہیں سمجھ سکتا مگر باوجود اس اختلاف کے تحریری زبان تمام ملک کے طول وعرض میں ایک ہے۔ اس حیثیت سے چینی زبان آجکل کی عربی سے مشابہت رکھتی ہے۔ چینی زبان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اکثر طرز ادا۔ اور لہجوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اگر ایک ہی لفظ کو دو مختلف آوازوں سے بولیں گے تو اُن کے معنوں میں بھی اختلاف پیدا ہو جائے گا۔

جس طرح اہل چین کی زبان میں اختلاف ہے اُسی طرح ان کے عادات واخلاق اور رسم ورواج بھی مختلف ہیں۔ مثلاً ملاقات اور گفتگو کے جو آداب ایک حصۂ ملک میں رائج وپسندیدہ ہیں وہ دوسرے حصے میں نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن عام رسم ورواج اور اساسی صفات وخصائل تمام ملک چین میں ایک ہی ہیں۔

چین کی قدیم روایات کی بنا پر چینی تمدن کا دور زریں تین ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے لیکن محققین کا خیال ہے کہ چینی تمدن کا زمانۂ عروج ایک ہزار سال قبل مسیح سے آگے نہیں بڑھتا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اہل چین ترقی وتمدن کے بلند ترین زینے پر تھے اور علوم وفنون صنعت وحرفت۔ اور بنا رعمارت میں تمام ایشیائی اقوام سے آگے نظر آتے تھے۔

چینی عمارتیں ابتدا میں مٹی اور معمولی پتھروں سے بنائی جاتی تھیں۔ اور فرش پر گھاس وغیرہ بچھاتے اور چٹائیوں پر بیٹھتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے میز اور کرسی ایجاد کی۔ پہلے وہ اپنی کتابیں لکڑی کے باریک تختوں پر لکھتے تھے۔ اور بید کی قلمیں اور سیاہی استعمال کرتے تھے۔

علم طب کا رواج بھی چین میں قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ اس فن میں انہوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں جن میں امراض کی چار قسمیں قرار دی گئی ہیں۔ اور سال کی ایک ایک موسم سے ایک قسم کا تعلق کیا گیا ہے

۱۔ دردسر۔ اور عصبی امراض ۔موسم بہار میں۔

۲۔ امراض جلد — موسم گرما میں

۳۔ بخار — موسم خزاں میں

۴۔ امراض سینہ — موسم سرما میں

ان امراض کے لئے پانچ قسم کی دوائیں استعمال کی جاتی تھیں۔ جمادات۔ اور نباتات۔

پودوں کے بیج - حیوانی ادویہ - معدنی ادویہ - ان دواؤں میں سے ہر ایک کی پانچ قسمیں اس طرح تھیں :-

۱- ترش ادویہ - تغذیہ عضلات کے لئے -

۲- نمکین ادویہ - مجاری خون کے تغذیہ کے لئے -

۳- تلخ ادویہ - تقویت جسم کے لئے -

۴- شیریں دوائیں - تغذیہ لحم کے لئے -

۵- تیز دوائیں ہڈیوں کے تغذیہ کے لئے -

نبض کے متعلق بھی اطبا، چین نے بہت تحقیقات کی تھی - اور اسکی چوبیس قسمیں قرار دی تھیں جو انسان کی چوبیس مختلف حالتوں پر دلالت کرتی تھیں -

۲۲۰ سنہ قبل مسیح میں ایک بڑے شخص کا چین میں ظہور ہوا ، جسنے چین کی تمام چھوٹی ریاستوں کو اپنا تابع کر کے شہنشاہ اول کا لقب پایا اور تمام ریاستوں کا خاتمہ ہو کر ایک سلطنت قائم ہو گئی - اس بادشاہ نے چین کی مشہور دیوار بنانے کا حکم دیا اور اسکی تعمیر میں قیدیوں سے کام لیا گیا - جزیروں کی تلاش کے لئے بحری بیڑہ روانہ کیا - اور تانبے کا سکہ بنایا ، لیکن سب سے زیادہ عجیب کام اسنے یہ کیا کہ تمام چینی تصنیفات کو جمع کر کے جلا دیا - اور صرف زراعت - طب - نجوم کی کتابیں باقی رہیں مورخین لکھتے ہیں کہ اس سے بادشاہ کا مطلب یہ تھا کہ اُس کے عہد سے چین کے علوم آداب اور فلسفہ کا دور جدید شروع ہو -

یہ بادشاہ ۲۱۰ سنہ قبل مسیح میں مرگیا - اس کے بعد اس کا بیٹا شہنشاہ دوم کے لقب سے جانشین ہوا لیکن اُسنے کچھ زیادہ عرصہ تک حکومت نہیں کی اسکو ایک کسان نے جو بڑا بہادر اور صاحب عزم شخص تھا مار ڈالا - تین سال تک ملک میں بغاوت رہی آخر کار وہی کسان ۲۰۶ سنہ قبل مسیح میں بادشاہ ہو گیا کسانوں کے خاندان میں دوسو سال قبل مسیح اور دو سو سال بعد مسیح تک سلطنت رہی - اس چار سو سال کی مدت میں چینیوں کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا وہ اپنے ہمسایہ تاتاری اور کوریا والوں سے لڑتے رہے ، کوریا کے ساتھ لڑائیوں کے سلسلہ میں چینیوں کو ملک جاپان کے وجود کا علم ہوا

جو اُس زمانے میں نہایت غیر متمدن حالت میں تھا، چین نے سرکاری طور پر جاپان کو ۵۷ء میں تسلیم کیا اور پہلی مرتبہ جاپانی سفیر کو ایوان شاہی میں باریابی کا موقع دیا گیا۔

خاندان مزارعین کے عہد حکومت میں علوم و فنون کو بڑی ترقی ہوئی، پرانی کتابیں تلاش کی گئیں جو باوجود شہنشاہ اول کی کوششوں کے جلائے جانے سے محفوظ رہ گئی تھیں۔ یہ زیادہ تر مذہبی کتابیں تھیں اور ان میں چین کے مشہور حکیم کانفیوشیوس کے تعلیمات کا بھی بڑا حصہ شامل تھا۔

اس خاندان کے زمانہ حکمرانی میں سیاہی اور کاغذ کا استعمال شروع ہوا۔ اونٹ کے بالوں کا برش بناکر اُس سے تصویروں میں رنگ بھرنے کا کام لیا گیا۔ علماء کے لئے علمی خطابات تجویز کئے گئے۔ اور خاندان، کونفوشیوس، میں سب سے معمر شخص اُس کا جانشین اور خلیفہ تجویز کیا گیا یہ سلسلہ خلافت چین میں آجتک قائم ہے، اور سب اوسکو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اسی زمانہ میں اہل چین نے وسط ایشیا کے سفر اختیار کئے۔ اور یونانی مستعمرات سے بہت سی مفید چیزوں کا اقتباس کیا۔ جن میں سے انگور، نبیذ، اور پانی کی گھڑی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اپنی تقویم کو یونانی حسابات سے صحیح کیا اور فن موسیقی میں بھی یونانیوں کی تقلید شروع کی یونانی موسیقی نے چینیوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی یہاں تک کہ چین کی موجودہ موسیقی یونان کی قدیم موسیقی سے مشابہ ہے۔

خاندان مزارعین کے سقوط کے بعد فتنہ و فساد کی آگ بھڑکی اور سلطنت کے تین حصے ہو گئے یہ انقسامی حالت ۲۲۰ء سے ۲۶۵ء تک رہی۔ اسکے بعد تقریباً چار صدی تک چین میں کوئی قابل ذکر واقعات پیش نہیں آئے اور نہ مختلف حکمراں خاندانوں میں کوئی تاریخی شخص پیدا ہوا، بلکہ اس عرصہ میں چین کی حیات اجتماعی، اور وطنی روح انحطاط اور پستی کی طرف گرتی چلی گئی۔

۶۱۸ء میں حکومت خاندان تانگ کی طرف منتقل ہوئی۔ اور تین صدی تک یہ خاندان برسر حکومت رہا۔ اور چین نے اس عرصہ میں بڑی ترقی کی۔ سب سے زیادہ قابل ذکر واقعہ اس دور کا یہ ہے کہ ملکہ وُو نے اپنے سوتیلے بیٹے سے حکومت غصب کرلی حالانکہ اُس کے شوہر نے اُس کو اپنے بیٹے کا وصی مقرر کیا تھا۔ یہ ملکہ چالاکی اور خباثت میں مشہور ہے۔ یہ شوہر ہی کے زمانہ سے سیاسی معاملات میں دلچسپی لیتی تھی۔ اور اکثر پردہ کے پیچھے بیٹھ کر شاہی دربار میں

وزرا کی بحث سنا کرتی تھی۔ ابتدا میں اس نے اپنے کو ملکہ آلہی کا لقب دیا، پھر معبود قادر کے نام سے شہرت حاصل کی اس نے ہر حیثیت سے عورتوں اور مردوں میں مساوات پیدا کی عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش مناصب حکومت میں جگہ دی ان کے علاوہ اور بھی عجیب وغریب کام کئے خاندان تانگ کے بعد پے درپے خاندان سنہ ۹۶۰ء تک برسر حکومت رہے۔ اسکے بعد سلطنت خاندان سونگ میں منتقل ہوئی اور تین صدی تک اس میں رہی۔ یہ زمانہ چین کے تمدن کا دور زریں کہا جا سکتا ہے، عہد تاریخ سے لیکر آج تک چینی تمدن کو اس درجہ عروج اور ترقی کسی زمانہ میں حاصل نہیں ہوئی۔

بارہویں صدی عیسوی کی ابتداء سے مغلوں کے حملے چین پر شروع ہوئے اور متعدد مرتبہ انہوں نے چین کو تاخت و تاراج کیا۔ یہاں تک کہ اس صدی کے آخر میں انہوں نے خاندان سونگ سے سلطنت چھین لی۔ اور چودھویں صدی کے نصف تک ان کے قبضے میں رہی۔ لیکن "شو یوانگ چنگ" کی مدبرانہ مساعی سے دوبارہ سلطنت اصلی مستحقین یعنی خاندان سونگ کے قبضہ میں آئی شو یوانگ چنگ چین کے عظیم ترین بادشاہوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے نظام حکومت اور انتظام سلطنت میں بڑی حد تک اصلاحات کیں۔

آخر میں دولت منچوریہ کا دور رہا۔ جس کا خاتمہ آخری انقلاب نے کر دیا اور سلطنت نے جمہوری صورت اختیار کر لی۔ اور اس وقت تک جمہوری ہے۔

اہل چین میں بھی دوسری قوموں کی طرح ابتدا میں چیزوں کا تبادلہ سونے چاندی یا سکہ کے ذریعہ سے نہیں ہوتا تھا بلکہ بلا واسطہ اشیا کا آپس میں تبادلہ کیا جاتا تھا اسکے بعد سیپ اور چمڑے کے ذریعے تبادلہ ہونے لگا پھر تانبے کی چھوٹی چھوٹی سلاخیں جن کے بیچ میں سوراخ ہوتا تھا اور بعض اسلحہ اس ضرورت کے لئے استعمال ہونے لگے نویں صدی سے تجارتی ہنڈی کا استعمال شروع ہوا اور اس صدی میں کاغذ کا سکہ رائج کیا گیا۔ اور اب تک رائج ہے۔

چین میں جب سے کہ شاہی حکومت قائم ہوئی (سنہ ۲۲۱ ق م) جمہوری انقلاب تک کوئی قابل ذکر تغیر اس کے دستوری نظام میں واقع نہیں ہوا۔ اس دستور کا دفعہ اول یہ ہے کہ تمام اراضی بادشاہ یا حکومت کی ملک ہیں۔ اور جو شخص ان سے نفع حاصل کرے گا اُسے ہر سال لازمی محصول ادا کرنا ضروری ہے

اور یہی محصول زمین سلطنت چین کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

چین میں اگرچہ ہزاروں سال تک استبدادی اور شخصی حکومت رہی ہے، مگر چینی طبائع جمہوریت پسند واقع ہوئی ہیں چین کا ایک مشہور فلسفی منسیوس کہتا ہے کہ قومی وطنی امور میں سب سے پہلے رعایا کا مرتبہ ہے، اس کے بعد معبودوں کا اور آخری درجہ پر بادشاہ کا۔

مختلف حکمراں خاندانوں کے زمانہ میں قوانین سزا نے بھی مختلف صورتیں اختیار کی ہیں ان قوانین کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قانون سزا تدریجاً نرم ہوتا چلا گیا ہے ابتدا میں مجرمین کو نہایت سخت اور وحشیانہ سزائیں دی جاتی تھیں لیکن آج چین کا قانون سزا نہایت معتدل اور ترقی یافتہ شکل میں ہے، یہاں تک کہ یورپ کے بعض واضعین قانون اس کو طبائع بشری کے لئے نہایت موزوں خیال کرتے ہیں۔ قانون سزا میں یہ تعدیلات صرف حکیم کانفوشیوس کی تعلیمات سے ماخوذ ہیں۔

اُن قدیم عادات میں سے جن کے اہل چین اب تک پابند چلے آتے ہیں ماتم کی رسم ہے جس میں حد سے زیادہ مبالغہ کیا جاتا ہے۔ چین میں یہ قانون ہے کہ اگر کسی شخص کی ماں یا باپ مر جائے تو وہ تین سال تک شادی نہیں کر سکتا۔ چینی لوگ بادشاہ کی موت پر ماتم کا شدید مظاہرہ کرتے ہیں۔ عورتیں اور مرد بادشاہ کی موت کے بعد سو دن تک اپنے بال نہیں کاٹ سکتے اور نہ کوئی زیور پہن سکتے ہیں۔

قدیم نظام کی ایک عجیب و غریب بات یہ تھی کہ سرکاری ملازم بجائے اس کے کہ مہینہ کے ختم پر اپنی معینہ تنخواہ لیتا۔ جو سرکاری آمدنی کہ اسکے ہاتھ میں آتی تھی اُس میں سے جس قدر ضرورت اُسے ہوتی تھی لے لیتا تھا۔ اور باقی اپنے افسر کے سپرد کرتا تھا۔ افسر بھی جتنا اپنی ضروریات کیلئے مناسب خیال کرتا لیکر افسر بالا کے سپرد کرتا اور اسیطرح ہر ایک افسر اپنے مصارف رقم آمدنی میں سے لیتا ہوا جو کچھ بچ رہتا تھا وہ وزیر مال کے سپرد کر دیتا تھا یہ نظام اگرچہ بظاہر نہایت عجیب معلوم ہوتا

مگراس پر نہایت احتیاط سے عمل کیا جاتا تھا۔ اور یہ عادت جاریہ تھی کہ کوئی ملازم اپنے حقوق سے تجاوز نہیں کرتا تھا۔

خدا پر اعتقاد رکھنا اہل چین کا پرانا عقیدہ ہے لیکن مرور زمانہ نے اس قدیم عقیدہ کو اپنی صورت پر باقی نہیں رکھا چینی بدھ مذہب کے پیرو ہیں۔ مگر یہ ایک عجیب بات ہے کہ وہ اپنے دینی اجتماعات میں دوسرے مذہب والوں کی طرح احترام اور خشوع کا اظہار نہیں کرتے بلکہ اپنے ہیکل میں باتیں کرتے ہیں، ہنستے ہیں، خرید و فروخت کرتے ہیں۔ چینی اپنے مذہب کا بہت کم لحاظ کرتے ہیں، اور مذہبی مسائل میں بالکل بحث نہیں کرتے، البتہ جب کسی مرض یا سخت مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اس وقت خدا اور دیوتاؤں کو یاد کرتے ہیں۔

بدھ مذہب کے علاوہ چین میں دو اور مذہب پائے جاتے ہیں جو چین کی حیات اجتماعی پر بڑا اثر رکھتے ہیں۔ ایک کونفوشیوس کا مذہب، اور دوسرا مذہب تادیا۔ ان دونوں مذہبوں کی تعلیمات میں مذہبی حیثیت سے زیادہ ادبی اور اجتماعی حیثیت پائی جاتی ہے، کونفوشیوس فلسفی (۵۵۱ء ۔ ۴۷۹ق م) کی اجتماعی تعلیمات نے آج تک اہل چین کی رہنمائی کی ہے، چینی اسکو "بادشاہ بے تاج" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ کونفوشیوس کی اہم ترین تعلیمات یہ ہیں کہ نیک کام ثواب کی توقع اور عذاب کے خوف سے نہیں بلکہ محض نیکی کی حیثیت سے کرنا چاہئے۔ بادشاہ اور صاحب حکومت کے ساتھ اخلاص عمل کا سلوک ضروری ہے کیونکہ یہی قومی سعادت کی بنیاد ہے۔ والدین کا احترام اور اُن کی اطاعت دنیا میں خوشی اور سعادت کا سبب ہے شر کا مقابلہ عدل سے کرنا چاہئے۔

تادیا لفظ تاؤ کی طرف منسوب ہے۔ تاو کے معنی سیدھے رستہ کے ہیں۔ یہ مذہب ایک بڑے فیلسوف لاؤ دوزا کا نکالا ہوا ہے۔ یہ حکیم بعض کے نزدیک ایک ہزار سال مسیح سے پہلے اور بعض کے نزدیک چھ سو سال پہلے گزرا ہے۔ یہ مذہب بدھ کی تسلط کے بعد بھی باقی رہا۔ اور بقا کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے بدھ مذہب کی ایک شاخ کی صورت اختیار کرلی۔

مذہب تاویاکے مدعی خیال کرتے ہیں کہ وہ انسان کی عمر کو بڑھا سکتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ جو اصول انہوں نے اس مقصد کے لئے اختیار کئے ہیں وہ ضرور بلحاظ حفظ صحت انسان کے لئے بہت کچھ مفید ہیں۔ مثلاً۔

۱- گہری سانس لینا خصوصاً صبح کے وقت۔

۲- ہر دو گھنٹہ میں تین مرتبہ لعاب دہن نگلنا۔

۳- حدِ اعتدال کے اندر جسمانی ریاضت۔

۴- بغیر کسی حرکت کے چند گھنٹے آنکھوں کو بند کئے ہوئے پڑا رہنا اور اس حالت میں اپنی عقل کو ہر قسم کی افکار سے خالی رکھنا۔

نجوم اور پیشین گوئیوں کا بھی چین میں بہت رواج ہے روحوں کے متعلق بھی وہ نہایت مضبوط اعتقاد رکھتے ہیں۔ شریر روحوں سے بہت ڈرتے ہیں کیونکہ وہ انہیں تاریک اور سنسان مقامات پر نظر آتی رہتی ہیں۔ ان کا ایک عجیب اعتقاد یہ بھی ہے کہ روحیں ہمیشہ خطِ مستقیم پر چلتی ہیں۔ اس سے وہ اکثر گلیاں اور سڑکیں ٹیڑھی بناتے ہیں تاکہ روحیں اُن میں نہ گزر سکیں۔ اہل چین کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ انسان کی سعادت اور نحوست اس کے ماحول کے تابع ہوتی ہے جہاں اس نے پرورش پائی ہے، مثلاً اگر کوئی شخص ایسی جگہ کا باشندہ ہو جہاں خوبصورت پہاڑ۔ سبزہ زار میدان۔ بلند عمارات بہتی نہریں واقع ہیں تو سعادت اُس کے حصہ میں ہے، اور اگر اس کے خلاف کسی ویرانہ زمین سکونت رکھتا ہے تو وہ سخت منحوس ہو۔

چینی اپنے مُردوں کا غیر معمولی احترام کرتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ مرنے والے کی روح اپنے خاندان کی حالت کو دیکھنے کے لئے ہمیشہ اہل خاندان کے سروں پر چکر لگاتی رہتی ہے۔ وہ گوشت اور شراب روحوں پر چڑھاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ یہ چیزیں روحوں کے لئے ایک خاص خزانہ میں جمع ہوتی ہیں۔

چینیوں کا اعتقاد ہے کہ انسان کا نفس مرکب ہے ایک جزو جسم کے ساتھ رہتا ہے اور کبھی

علیحدہ نہیں ہوتا۔ اور دوسرا جزو کبھی کبھی جدا ہوکر دور دور کی سیر کر آتا ہے، مسمریزم کے طریقہ پر غیب کی باتیں معلوم کرنے اور روحوں سے باتیں کرنے کے بھی اہل چین بہت شائق ہیں۔

چین میں مختلف اغراض کے لئے بعض ظاہر اور بعض پوشیدہ انجمنیں قائم تھیں ایک انجمن ایسی ہے جو اپنے ممبروں پر گوشت کھانے اور تمباکو اور شراب پینے کو ناجائز قرار دیتی ہے۔

افیون کھانے کا چین میں کثرت سے رواج ہے۔ مہمان کی تواضع کے لئے افیون پیش کیجاتی ہے لیکن اب رفتہ رفتہ اس کا رواج کم ہوتا جاتا ہے۔

چین کی گزشتہ تاریخ ثابت کرتی ہے کہ یہ ملک کسی زمانہ میں تمدن و معاشرت میں بڑی حد تک ترقی کر چکا تھا۔ اور صنعت و حرفت و علوم و فنون میں ایشیا و یورپ کی بہت سی قوموں کا استاد تھا لیکن آجکل چین کی حالت دیگر ایشیائی اقوام کی طرح نہایت افسوسناک ہے، مگر شکر ہے کہ یورپین اقوام کے تسلط نے جہاں اور بہت سی قوموں کو بیدار کیا ہے وہاں اہل چین میں بھی احساس قومی کے آثار پیدا کر دیے ہیں اور اگر یہ رفتار اسیطرح جاری رہی تو وہ زمانہ کچھ زیادہ بعید نہیں کہ جب دنیا کی تمام سلطنتیں چین کے نام سے کانپنے لگیں کیونکہ چین کل آباد دنیا کا $\frac{1}{5}$ ہے +

محمود علی

غزل

اُسی کا عشق سچا ہے، وہی ہے چاہنے والا
کہ جسنے زندگی کو موت پر قربان کرڈالا

دلوں پر آجکل اُس حُسن کی ہے کارفرمائی
کہ جسنے اِک نظامِ عالمِ امکاں بدل ڈالا

ہمارا قتل، دیکھے اور اُس خود دار کے تیور
اگر ہو کوئی شان بے نیازی دیکھنے والا

چلی ہر حال میں باد ستم ہی اہل اُلفت پر
غبار ناتوانِ قیس تک برباد کر ڈالا

خلش ہائے محبت کی تواضع مجھکو کرنا ہے
بنے گا ساغرِ صہبائے حسرت دل کا ہر چھالا

ہجومِ شوق، انبوہ تمنا، مجمع ارماں
کئے ہیں کارواں کے کارواں تہ و بالا

مجھے حامد فقط یہ ایک حسرت اور باقی ہے
سُنا دوں اپنا قصہ گر کوئی ملجائے دل والا

ایڈیٹر

حب الوطنی

ہوشمندانہ دل و دماغ، ہمیشہ اپنے ملک کی فلاح اور بہبود میں بے چین رہتے ہیں، اور محب وطن کا ہر لمحۂ حیات ترقی ملک میں مصروف رہتا ہے۔

یہی جذبۂ مقدس ہے جس سے روح کو تقویت پہونچتی ہے جس سے رگوں میں قومیت کا خون بنتا ہے اور ہر منجمد اور باحس طبیعت میں ایسی حرکت پیدا ہو جاتی ہے جس سے آثار حیات کی جلوہ ریزیاں منظر عام پر آنے لگتی ہیں۔ ہوشمند طبقہ اپنی حفاظت بقاسے صیانت بقا کو مقدم سمجھتا ہے، وہ محسوس کرتا ہے کہ تباہی کا سیلاب ملک میں نہ صرف اُسکی ہستی کے لئے خطرناک ہے، بلکہ اُس کے اہل و عیال عزیز و اقارب دوست آشنا کی حیات کو بھی تہ و بالا کر سکتا ہے۔

وطن پرستی کا جذبہ کائنات میں قدیم سے ہے۔ جب افراد میں اجتماعی صورتیں پیدا ہونے لگیں تو اُن کے قوائے عملی کا اقتضا ہونے لگا کہ اپنے محدود قطعہ کو اندرونی تنظیم کے ساتھ خارجی اثرات سے محفوظ کر لیں اور معاشرتی و تمدنی وسعت پر اسکو شہریت کے خوشنما مرقع میں لے آئیں۔

یہ لطیف جذبہ وراثتاً ہر فطرت انسانی میں منتقل ہوتا رہتا ہے اور اسی کا اثر ہے کہ انسان کو اپنے وطنِ مالوف سے ذوقِ نشاط ملتا ہے۔ اور اپنے ملک کی ہر چیز خوشنما معلوم ہوتی ہے۔ اتفاقاً جب کوئی ملک آفات و حوادث میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اہل ملک کے حیات میں چوٹ لگتی ہے، قلب میں اضطراب کا طوفان اُٹھتا ہے اور اعصاب دماغی بے قابو ہو جاتے ہیں۔

حقیقت میں یہ ایک ایسا مقدس جذبہ ہے جس سے اخلاقی عناصر کو تقویت پہنچتی ہے۔ حفاظت ملک کی جب ضرورت ہوتی ہے تو یہی جذبہ اہل ملک کی شجاعت طبعی کی دبی چنگاریوں کو شعلہ بار بنا دیتا ہے اور سیکڑوں نفوس غنیم کی آتش فشاں توپ و تفنگ کے سامنے اپنا سینہ سپر کر دیتے ہیں۔

جب یہ جذبۂ خوابیدہ بیدار کر دیا جاتا ہے یا ماحول سے متاثر ہو کر اُبھر آتا ہے تو بحالت امن یہی افراد میں اخوت و ہمدردی کی روح پیدا کرتا ہے اور اپنے ملک کی علمی اور اقتصادی روایات کی نسبت متاثر افراد کی یہی تمنا رہتی ہے

کہ بمقابلہ دوسرے متمدنہ ممالک کے اسکو ترجیحی تفوق حاصل ہوجاے۔

اس میں شبہ نہیں ہی کہ وطن انسان کو نہایت محبوب ہوتا ہی وہ غیر معمولی مصائب و آلام بھی وطن میں برداشت کرتا ہی اور مفارقت وطن گوارا نہیں کرتا۔

ہر فطرت کو احساس ہی کہ جلا وطنی ایک ایسی سزا ہی جس سے روحانی سکون فنا ہو جاتا ہی اور دماغ و قلب اذیت و کرب سے بیتاب ہو جاتے ہیں۔

علت تشدد و تکلیف اسکے سوا اور کیا ہو سکتی ہی کہ اُس بدبخت کی قوت باصرہ وطنِ مالوف کی دلاویز فضا سے محروم کردی جاتی ہی۔

بخت نصر کے سفاکانہ حملہ نے جب بیت المقدس کی بنیادیں ہلا دیں اور اسکی بیدردی نے یہودیوں کو جلا وطنی پر مجبور کیا تو اُن پر دنیا تنگ ہو گئی آنکھیں یادِ وطن میں آبشار بن گئیں اور اُس وقت تک آنسو نہ تھمے کہ وہ اپنے وطن مالوف میں نہ پہونچ گئے

واقعہ یہ ہی کہ حب وطنی کے موثر نظارے جسطرح قدیم تاریخوں میں ملتے ہیں اسی طرح زمانہ حاضرہ بھی شواہد سے لبریز ہے۔ ناظرین کے تفنن طبع کیلئے چند دلچسپ مناظر اس موقع پر پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) ایتھنز کا مشہور مدبر طاکلس جسکی ولادت ۵۱۴ قبل مسیح میں ہوئی تھی اسکے قلب کی گہرائیوں میں محبتِ وطن کے نقوش مرتسم تھے، اُسکے دماغی افکار ارتقاء ملک میں مصروف تھے کہ شاہ ایران کے عظیم الشان بحری دستے تسخیر یونان کے لئے آپہونچے۔

یونان میں تہلکہ مچ گیا۔ حریف کی زبردست فوجی مظاہرے نے اہل یونان کو بدحواس کردیا مگر طاکلس کی روح کو جذبۂ محبت وطن نے قوی کردیا تھا وہ اُٹھا اور اپنی ولولہ انگیز تقریروں سے اہل وطن کے دلوں میں حیات ملک کے حسیات بھر دیے اور پرجوش عساکر وحشیں کا سیلاب بحر ایتھنز کے گوشوں سے اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے خاشاک کی طرح غنیم کو پیچھے ڈھکیل دیا۔

تھوڑے عرصہ کے بعد اُسکے مقدر نے بیوفائی کی اور اہلِ وطن کی غدارانہ سازشوں سے وہ جلا وطنی پر مجبور ہوا۔

الوداعِ وطن پر اُسکی آنکھوں میں اشک حسرت تھے، مفارقتِ وطن سے اُس کا قلب پاش پاش ہو گیا تھا۔

وہ جہاں بھی گیا اہل وطن کی ریشہ دوانیاں ساتھ تھیں خطراتِ حیات نے اُس کو گھیر لیا تھا۔ بالآخر وہ زندگی سے مایوس ہو گیا اور تنگ آکر اپنے حریف کے ملک میں چلا گیا۔

جب شاہ ایران کے دربار میں پہونچکر اُسنے اپنا تعارف کرایا ہی تو اُسکی آواز کی گونج نے اراکین دربار کے دل و دماغ کو بے قابو کردیا، اپنی ہزیمت کے واقعات اُنکی آنکھوں کے سامنے آگئے۔ جوش غضب اور جذبۂ انتقام سے آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

طاکلس اس خوفناک نظارہ کو دیکھتا رہا اور نہایت موثر لہجہ میں شاہ سے مخاطب ہوکر گویا ہوا۔

حضور والا! ایک ستم رسیدہ اور بیکس ہستی رحم و غضب سلطانی کے سامنے ہے، اہل وطن کی بے مہریوں نے مجھے ترک وطن پر مجبور کیا ہی میں مظلوم ہوں لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اس آستانۂ عالی کے مقابلہ میں ایسے گناہ کا مرتکب ہوا ہوں جو بلا ناقابل معافی ہی میں اس یاس و بیم کی حالت میں آخری فرمان شاہی کا متوقع ہوں اگر مراحم خسروانی سے کام لیا گیا تو میں آئندہ ناچیز خدمات سے "تلافی جرم کی سعی کروں گا اور اگر میرے حق میں سزا موت کا حکم دیا گیا تو اُس کا بھی اپنے آپ کو مستحق سمجھتا ہوں۔ یہ آواز نہ تھی، آبشار مظلومیت تھی جسنے شعلۂ غضب سلطانی کو ٹھنڈا کردیا اور وہ اُسکے موثرانہ انداز بیان میں گھر گیا۔

طاکلس کو معافی دی گئی، اور رفتہ رفتہ اُسکے مدبرانہ فہم و فراست مکارم خسروی سے مالامال ہوگئی۔

ایک روز طاکلس اپنے مکان میں بیٹھا ہوا تھا کہ فرمان شاہی ملا اور ایتھنز میں دوبارہ لشکرکشی کا ایما ظاہر کرتے ہوے اُس سے اشتراک عمل کی خواہش کی گئی۔

یہ خبر اسکے لئے صاعقۂ جگر سوز تھی، وہ بے چین ہوگیا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ کیا یہ ممکن ہی کہ میری حیات وطن پرستی فنا ہوجائیں، کیا ہوسکتا ہے کہ میں اپنے محبوب وطن کے شاداب تختوں کو گولہ باری سے نیست و نابود دیکھوں! کیا میں اسکو گوارا کرسکتا ہوں کہ میں اپنے برادران وطن کی لاشوں کو حریف کی گولیوں سے خاک و خون میں آغشتہ پاؤں! نہیں ایسا نہیں ہوسکتا، بیشک میرے دوستوں نے میرے ساتھ بے مہری کی ہے تاہم میرا ضمیر اُنکی غلطی کو معاف کرسکتا ہی لیکن میری آنکھیں وطن کی بربادی کا خوفناک نظارہ نہیں دیکھ سکتیں طاکلس۔ انہیں تخیلات کی کشمکش میں اُٹھا زہر ہلاہل کا جام تیار کیا اور قبل اسکے کہ سلطانی عزم کی تکمیل ہو۔ اُسکی روح استقامت اور محبت وطن کے افسانے چھوڑکر راہی ملک عدم ہوگئی۔

---

(۲) سولن جو یونان کا مشہور مقنن ہی اور جسکی ولادت ۶۳۸ ق م ہوئی تھی، یہ ہستی بھی خمخانہ محبت وطن میں سرشار تھی۔ اُسکی قانونی قابلیت کا آج بھی احترام باقی ہے۔ برسوں کی دقت نظر اور کاوش جگر سے ملک کیلئے

ایک نظام آئین مرتب کیا جو ملک کی تنظیمی حالت کو اوج کمال پر لے گیا، اور اپنے زمانۂ سیاحت میں مصر وغیرہ ہوتا ہوا شاہ کرلس کا مہمان ہوا۔

شاہ کرلس جس کا ایوانِ حکومت نظر فریب ساز و سامان سے آراستہ تھا ایک وزاہیں وہ مدعو کیا گیا۔ سولن اُن پرشکوہ تجمل آرائیوں کا نظارہ کرتے ہوئے شاہ کرلس کے حضور تک پہونچ گیا۔

شاہ نے کچھ سطوت بیز سکوت کے بعد دریافت کیا کہ کیا تمنے دوران سیاحت میں مجھ جیسا خوش قسمت بھی دیکھا ہے۔ سولن نے بیساختہ جواب دیا کہ جہاں پناہ، مینے حضور سے زیادہ خجستہ بخت اپنے ملک میں ٹیلس کو پایا ہے جو نہایت ہی خوش کردار تھا، وہ صاحب اولاد بھی تھا اُس کے پاس ایحتاج کے مطابق جائداد بھی تھی اور سب سے زیادہ سب سے بہتر اور سب سے ممتاز اُسکی خوش قسمتی تھی کہ وہ اپنی آخری سانسوں تک وطن مالوف کی بہبودی اور ترقی میں منہمک رہا یہاں تک کہ اپنے ملک کی حفاظت میں آخری دم تک اُسنے جانفشانی کوششیں کیں۔

اور اسی مقدس فرض میں اسکی روح محب وطن کے زریں کارنامے چھوڑکر رخصت ہوگئی!!

روما کی تاریخ کا ایک ایک ورق محبان وطن کے ایثار، قربانیوں اور وطن پرستی کے جذبات سے مملو ہے اور اسی جذبات وطن پرستی کے نتائج تھے جسنے روما کو عروج وکمال کے انتہائی افق پر پہونچا دیا تھا، ایک ایک فرد کا دماغ اسی نشہ سے پُرکیف تھا اگر فرداً فرداً اون سب کی حالات بیان کئے جائیں تو بہت زیادہ وقت درکار ہے اس لئے اس سے قطع نظر کرکے زمانۂ حاضرہ نے حب الوطنی کے جن نظاروں کو پیش کیا ہے وہ بصیرت کے لئے کافی ہے۔

جنگ عظیم کے تلاطم خیز طوفان میں آپ نے سُنا ہوگا کہ جرمن خوفناک آندھی کی طرح بڑھتا ہے، فرانس و انگلستان خطرات میں گھر جاتے ہیں، ہوائی جہاز کی تاخت نے قیامت برپا کردی ہے۔ لیکن وطن پرستی کے جذبات دلوں میں شعلہ بھڑکا دیتے ہیں۔ صنف نازک کا طبقہ گھر سے نکل کھڑا ہوتا ہے، بوڑھے پنشنر واپس آکر پھر خدمات کا جائزہ لیتے ہیں، نوجوان جوق درجوق شہید ملک کا طغرائے افتخار حاصل کرنے کے لئے فوجوں میں بھرتی ہوتے ہیں، بچے اسکولوں کو چھوڑ دیتے ہیں، غرض کہ ایک ایک فرد اپنے خون کے دریا بہا کر اپنے ملکوں کو بچا لیتا ہے، اور حریف کی قوت عساکریہ کے بادل چھٹ جاتے ہیں

جنگ عظیم پر ہی منحصر نہیں ہے بلکہ اگر ابتدا سے تاریخ عالم کا مطالعہ کیا جائے تو ایسی بے شمار مثالیں ملیں گی جہاں اس جذبۂ مقدس نے عظیم ترین یادگاریں قایم کر دی ہیں۔

حب الوطنی ایک ایسا قانون قدرت ہے جو اقوام کے شیرازے کو باہم مربوط رکھتا ہے۔

یہ یقین کر لینا چاہیئے کہ قوم اُس وقت تک حقیقی معنوں میں قوم نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس میں حب الوطنی کا جذبہ بدرجۂ اتم نہ پایا جائے۔

جس قوم میں یہ جذبہ نہ ہو وہ قوم بجائے قوم کے مجموعہ افراد کہے جانے کی زیادہ مستحق ہے۔

غرض کہ محبت وطن کا نظارہ انہیں نباتات میں محدود نہیں ہے بلکہ ہر ایک حکومت کی تاریخ حُب الوطنی کے جذبات سے بھری پڑی ہے، جس طرح دوران جنگ میں احساس وطن پرستی کے کارنامے جلی ملتے ہیں اسی طرح وطن کا ہر ایک سنجیدہ فرد زمانۂ امن میں بھی مُلکی ترقی اور بہبودی سے اپنے افکار دماغی کو معطل نہیں ہونے دیتا۔ وہ چاہتا ہے کہ وطن کی فضا میں ترقی کے انوار پھیلے ہوں اُسکی دلی تمنا یہ ہوتی ہے کہ ملک کا نظام اعلیٰ ترین ہو اُسکی خواہش کا یہ اقتضا ہوتا ہے کہ مُلکی صنعت و حرفت بلند سے بلند سطح پر آ جائے، اُسکی دلی آرزو اہل ملک کی مرفہ الحالی اور اخلاقی اور علمی ترقی کی خواہاں ہوتی ہے، اگر اُسکے پاس سرمایہ ہوتا ہے تو وہ خوشنما عمارات سے شہر کی زینت میں اضافہ کرتا ہے، نصب باغات اور کندہگی چاہات میں حصہ لیتا ہے، اگر وہ تاجرانہ دماغ رکھتا ہے تو وہ اپنے ملک میں تجارت کو فروغ دیتا ہے، کارخانہ کھولتا ہے اور ہر ممکن سے اقتصادیاتِ مُلکی کو آگے بڑھانے کی کوششیں عمل میں لاتا ہے، غرض کہ اُسکے دماغی افکار کا زیادہ حصہ انہیں کاوشوں میں لبریز ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ناقابل برداشت مجبوریوں سے ترکِ وطن اختیار کرتا ہے تب بھی وہ وطن کو فراموش نہیں کرتا عام اس سے کہ دوسری جگہ اُسکو کیسی ہی ثروت اور مرتبت حاصل ہو گئی ہو۔

وہ جس قدر بھی دوسری جگہ سے دولت حاصل کرتا ہے بجائے اسکے کہ وہ وہاں مکانات بنوائے چاہات کندہ کرائے، باغات لگائے، کارخانے کھولے، اپنے وطن کو ترجیح دیتا ہے۔

سیکڑوں ایسے واقعات پیش ہوتے رہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کا پیغام اجل غربت میں پہونچ گیا تو اُسکی زندگی کے آخری لمحوں میں اُسکی آنکھیں وطن کی یاد میں خونبار پائی گئی ہیں اور اسکا انتقال موت کی جگر پاش ساعتوں میں اُسکو یہ مستمندانہ وصیت کرتے سنا ہے کہ جس طرح ممکن ہو میری نعش میرے وطن میں مدفون کیجائے

انہیں جذبات صادقہ کے نتائج ہیں کہ ہر ایک سلطنت اہل وطن کے حقوق کا احترام کرتی رہی ہے اور اُنکی حقوق کو ترجیح دیگئی ہے، یہی سبب ہے کہ جاپان کا قابل سے قابل فرد امریکہ میں وہ حقوقِ امتیازی حاصل نہیں کر سکتا اور نہ ماسکو کا متوطن ٹائمز کے کنارے حقوقِ امتیازی سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔

بلاشک اس مقولہ میں صداقت کے راز مضمر ہیں کہ کسی کی قابلیت سے دوسرے کے حقوق معدوم نہیں ہو سکتے۔ ایک شوہر کا اقتدار اپنی زوجہ پر اسلئے نہیں ہے کہ وہ علمی فضیلت میں اُس سے ممتاز ہے، ایک باپ کا احترام اس لئے اولاد پر نہیں ہے کہ وہ گریجویٹ یا عالم و فاضل ہے بلکہ شرف حق ہے وہ اِس کا مستحق ہے کہ اولاد کے بازوے اطاعت و فرماں برداری، احترام والدین میں جھکے رہیں۔

فارقلیس کہتا ہے کہ ”اگر لیمپوں میں روشنی کم ہے تو اُس میں تیل ڈالنے کی فکر ہونی چاہیئے“۔

پس ضرورت ہے کہ وہ ہستیاں جو اپنے مُلک کو رفعت و اوج پر دیکھنے کی آرزومند ہیں، جن کا نصب العین ملکی بہبودی اور فلاح کے لئے بے چین ہے، جنکے دل و دماغ کا ذرہ ذرہ ارتقاے ملکی میں سرگرم پیش ہے۔ اُن کو ایسی فضا کی جس سے مستقبل روشن، اور کامیاب نظارے باصرہ نوازی کر سکیں +

ماہر،

نوائے رزمی

جہانِ بیخودی کی لذتیں جب یاد کرتے ہیں
تو پابند خرد دل تمام کر فریاد کرتے ہیں

تری خاطر سے، لے ہم یہ بھی اے صیاد کرتے ہیں
کہ اپنے ہاتھوں اپنا آشیاں برباد کرتے ہیں

امیدوں نے کیا ہے پھر جنونِ آرزو پیدا
پھر اک اجڑی ہوئی دنیا کو ہم آباد کرتے ہیں

غم دنیا و مافیہا سے مستغنی ہیں دیوانے
وہ سبکو بھول جاتے ہیں جو تمکو یاد کرتے ہیں

ابھی تک ہیں وہی نیرنگیاں جوشش تمنا کی
ابھی تک جستجوئے عشرتِ برباد کرتے ہیں

دل و جاں کی حقیقت کیا متاع جلوہ کی خاطر
خوشی سے کائنات دوجہاں برباد کرتے ہیں

تباہی کا گلہ کیسا مقام شکر ہے رزمی
خوشا قسمت کہ خود اہلِ وطن برباد کرتے ہیں

رزمی

ایک التجا

اس کارزارِ دہر میں یارب کوئی غمخوار دے
لاچار ہوں بن چارہ گر، تنہا ہوں کوئی یار دے

کب میں نے کی یہ آرزو، کب میں نے کی یہ التجا
پیراہنِ شاہانہ دے تو، خانۂ زرکار دے

ہاں یہ تمنّا ہے مگر سینہ میں میرے موجزن
ہستی کو داغِ عشق دے، دل کو کوئی آزار دے

آوارگی ہو عشق کی، ہو آہ و زاری درد کی
پیروں کو وہ رفتار دے، ہونٹوں کو یہ گفتار دے

دُنیا کا گر اک عضو تھا، مجھ کو معطّل کیوں کیا
میں ہاتھ تھا تیرا اگر، اس طرح پھر شل کیوں کیا

کہتا ہے تو، ہم میں مگر شانِ پرستاری نہیں
اگلی سی وہ افتادگی، پہلی سی وہ زاری نہیں

آماجگاہِ آرزو ہے دل مگر کاوش نہیں
ہے حوصلہ سر میں بہت، لیکن وہ سرشاری نہیں

سعئ عمل کا شور ہے، یہ بھی فریبِ نفس ہے
ہے خواب بیداری کا یہ، اندازِ بیداری نہیں

ہے لب پہ غم کی داستاں لیکن نہیں دل مضطرب
کرتے نہیں کہتے ہیں جو، کیا یہ تبہ کاری نہیں

جو مدعئ فقر ہے، بندہ ہے جاہ و مال کا
ہیں حال کے تو مرد سب، کوئی تو ہوتا حال کا

کب حُسن کا نقشہ مٹا، کب اُس کی رعنائی گئی
الفت ہی سینے کی گر اب وہ ولولہ زائی گئی

صہبا میں کیفیّت وہی باقی ہے لیکن دوستو!
وہ رسمِ رندی اُٹھ گئی، وہ بادہ پیمائی گئی

ہے آستانِ یار تو سجدہ طلب اب بھی مگر
وُہ ادعائے شوق کی اپنی جبیں سائی گئی

چاکِ گریباں زخم تھا گو یا کہ اچھا ہو گیا
اَب دستِ وحشت کی کہاں وہ کارفرمائی گئی

وُہ دن گئے، پھرتے تھے جب ہم ہاتھ میں اک نَے لئے
ناخن میں اک جنبش لئے، سینہ پہ اک کاوش لئے

بستی کی بستی آہ، اب محوِ سکون وش ہے
جس زندگی کو دیکھئے، اک خوابِ غفلت کوش ہے

جب تک خلش پیدا نہ ہو، خواہشِ سکوں کی ہے عبث
نا آشنائے نیش کو کیوں آرزوئے نوش ہے

اُس خوگرِ زنداں کو کیا لطفِ چمن کی جستجو
جو خوش ہے صرف اس بات پر، میرا قفس گلپوش ہے

لب کھولنے کی بھی نہیں فرصت، یہ آزادی ہے کیا
اعضا میں جنبش ہی نہیں، یارب یہ کیسا ہوش ہے

پھر آئے یارب وہ گھڑی جب بال و پر سے کام لیں
سُنکر نوائے غم مرا پھر لوگ دل کو تھام لیں

نیازؔ، فتحپوری

غزل

مجھ سے سن آ، لذتِ تیرِ نظر کیا چیز ہے
غیر کیا جانے بھلا زخمِ جگر کیا چیز ہے

آپ کہتے ہیں کہ ہوتا ہے محبت میں اثر
ہاں ذرا ہم بھی سُنیں تو یہ اثر کیا چیز ہے

مجھ سے پوچھو کس کو کہتے ہیں نگاہِ خشمگیں
دوسرے جانیں عنایت کی نظر کیا چیز ہے

مضطرب دیکھوں تمہیں کب مجھ سے دیکھا جائے گا
ورنہ دِکھلاتا، مری آہِ سحر کیا چیز ہے،

رات بھر جسنے تڑپ کر صبح کی ہو ہمنشیں
اس سے پوچھے کوئی، آہِ بے اثر کیا چیز ہے

بے پئے اک بیخودی سی رہتی ہے اعزاز کو
اُسکی آنکھوں کا تصور بھی مگر کیا چیز ہے

اعزاز

نکاتِ حکمت

موت و زندگی

کہتے ہیں کہ قوانین قدرت کے تحت زمینوں اور آسمانوں میں ایک اَن دیکھی اور اَن بُوجھی مگر اٹل قوت اپنا کام کر رہی ہے جو وقت آنے پر ان ہیبتناک آسمانوں اور بلند و بالا پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیگی، سیارو ثوابت کے وسیع اور فولادی کروں کو باہم ٹکرا دیگی، پھر وقت آئے گا کہ یہی قوت صبح منور کی زرفشانیوں اور شام سیہ کی ہولناک تاریکیوں، ہواؤں کی بوجھل روانیوں اور سمندروں کی ڈرائی موجوں کو برہم و برباد کر دیگی، اور ستم بالائے ستم یہ کہ یہی وہ قوت ہوگی جو نزاکت و ناتوانی کے اس نحیف مجسمہ (انسان) پر اپنا بے رحم عمل جاری رکھے گی جس کا دماغ ہوائے لالہ کار کے شگفتہ جھونکوں سے بھی مختل ہو جاتا ہے، اُس کا نازک ترین دل کسی غیر معمولی صدمہ کو بھی برداشت نہیں کر سکتا وہ کسی دھیمی سی دھیمی آواز سے بھی چونک پڑتا ہے، اُس کی قوتِ باصرہ کسی چھوٹے سے چھوٹے حادثہ کو بھی نہیں دیکھ سکتی، مگر سنا ہے کہ یہ بے رحم طاقت ایک دن اسے بھی اپنی تمام خوں آشامیوں کے ساتھ ختم و تمام کر دیگی۔ پس سنو کہ یہ سب کچھ اس لئے ہوگا اور ہو رہا ہے کہ حیات و بقا اور قیام و دوام کو صرف خدائے واحد و یکتا کے لئے تسلیم کیا جائے۔ اور یہ برہم کن طاقت وہی ہے جس کا خوفناک نام "موت" ہے اور جو کائنات عالم کے ذرہ ذرہ میں اپنا کام کر رہی ہے۔

کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

تم نے دریا کی خوفناک سطح پر سیر و سفر کے لئے آہن پوش جہاز بنائے ہیں جو تمہیں سمندر کی کوہ شکن موجوں اور فلک پیما طغیانیوں سے محفوظ و مامون رکھتے ہیں، تم ہوا کی لچکدار روانیوں پر پرواز کرتے ہو، اور تم نے ایسے آلات ایجاد کئے ہیں جو تمہیں فضائے معلق میں سیر و سیاحت کراتے ہیں اور تم اس خطرناک فضا پر بہ کمال اطمینان خود کو محفوظ رکھتے ہو،

میدان قتل و قتال میں فولاد شکن گولوں اور اژدر دہن توپوں، نیزوں کی خوں چکاں انیوں اور تلواروں کی صف شکن کاٹ سے مشت خاک انسان کا محفوظ و زندہ رہنا گو امر محال ہے لیکن تم نے ان خون فشاں میدانوں اور برباد کن اسلحہ سے بچنے کے لئے بھی آلات و اسباب فراہم کر لئے ہیں اور تم دشمن کی مہلک ترین ضرب سے محفوظ و سلامت رہتے ہو۔ تم نے دشمن کے خونخوار و خونبار اقدام و حملہ کے تحفظ کے لئے فولاد اثر خندقیں اور کوہ پیما قلعے تعمیر کئے ہیں اور ان کی بلند و بالا دیواریں اور مضبوط و قوی تر برج تمہیں دشمن کی برہم کن گولہ باری اور خونبار تیر افگنی سے یقیناً بچا لیتے ہیں، لیکن تم نے اُس قہرمان قدرت کے فولادی پنجہ سے بچنے کے لئے کون سے آلات و ہتھیار تیار کئے ہیں؟ جسکا ڈراونا نام "موت" ہے۔ اور جو تمہیں فولادی پشتوں اور توپوں کے کوہ شکن دہانوں اور قلعوں کی آہنی بروج میں بھی نہ چھوڑیگی۔

اینما تکونوا یدرککم الموت ولو کنتم فی بروج مشیدہ ط

تم ایک ایسی ذات سے اعراض و سرکشی کرتے ہو جس نے تمہیں حیات و زندگی کا خلعت عطا کیا حالانکہ تم مردہ تھے اور تمہارے اندر حس و حرکت کی قدرت بھی نہ تھی مگر اُس نے تمہیں زندگی بخشی اور تم اس نعمت کے ذریعہ خشکی و تری کی پہنائیوں اور اُسکی ان گنت مخلوق پر حکومت کرنے ہو تم اُس ذات سے انحراف کرتے ہو جو باوصف تمہاری اس طاقت و حکومت کے تمہیں پل کے پل میں ختم و تمام کر سکتی ہے اور تم اُسکے چارۂ کار کے لئے یکسر عاجز ہو کیونکہ وہ ایک ایسی ذات ہے جو تمہیں ہر موت کے بعد زندہ اور ہر زندگی کے بعد فنا کر سکتی ہے اور تم مجبور ہو کر بالآخر اُسکی طرف عاجزانہ رجوع کرو۔

تم دنیا کے فنا ہو جانے والے اقتدار و عروج پر گھمنڈ کرتے ہو۔ تم جاہ و حشمت اور دولت و حکومت کے نشہ سے مست و مدہوش ہو۔ تم اپنی طاقت و قوت سے اپنے ابنائے جنس کو غلام و دستگیر بنانے کیلئے کوشش کرتے ہو۔ تم ہوا و ہوس کی شیطانی اشتعال سے دنیا کی کمزور مخلوق پر ظلم و جبر کے پہاڑ توڑتے ہو اور خود پسندی و خود نمائی کے جذبہ سے مغلوب ہو کر اپنی انانیت کا اعلان کرتے ہو، یہاں تک کہ وقت

آتا ہے کہ تم خدا کی جلال و جمال کی قدرتوں سے بھی انکار کر دیتے ہو حالانکہ وقت آنے پر تم اپنی تمام شرمساریوں کے ساتھ اُسکے سامنے لائے جاؤ گے۔ اور سنو کہ یہ وقت تم میں سے ایک ایک کے لئے مقرر ہے۔

کُلُّ نَفسٍ ذائقۃ الموت ط ونبلوکم بالشر والخیر فتنۃ والینا ترجعون

توحیدی

تجلیاتِ سُہا

چلی ہی آتی ہیں شوق میں یاں زباں پہ بے اختیار باتیں
سکوتِ نخوت بھی مسکرا دے سُنے جو دیوانہ وار باتیں

اُدھر غضب حُسنِ عالم آرا، اِدھر قیامت جنونِ رُسوا
ہوا ہے کس کس طرح سے چرچا ہزار منہ اور ہزار باتیں

تمھاری محفل میں رات گذری، مگر خدا جانے ہم کہاں تھے
وہی فلک آشنا نگاہیں، وہی جنوں آشکار باتیں

رقیب کو بزم میں بُلایا، کسی کو کیا اعتراض کی جا
مگر ترا التفاتِ پیہم، مگر تری بار بار باتیں

سہا خیالی ہے اپنی ہستی، سہا نرالی ہے اپنی دُنیا
لگائے یادِ خرام ٹھوکر، سُنائے تصویرِ یار باتیں

سُہا

سیہ کار مُصلح

(افسانہ)

(۱)

شاہد کی مست و سرشار زندگی سے شہر کا بچہ بچہ واقف تھا، کوئی مقام ایسا نہ تھا جہاں اُسکی رسوائی کے افسانے نہ پہونچے ہوں، اور کوئی سوسائٹی ایسی نہ تھی جسمیں اُسکی سیہ کاریوں پر نفرت کا اظہار نہ کیا گیا ہو، ہر جگہ اُسکی بداطواریوں کے چرچے تھے اور ہر شخص اُسکی بدکرداریوں سے بیزار تھا لیکن شاہد نے کبھی ان باتوں کی طرف اعتنا نہیں کیا، اور لوگوں کے انتہائی طعن و سرزنش کے باوجود بھی اُسکی سرمستیوں کا وہی عالم رہا، بلکہ جوں جوں اُسکی آوارہ مشربی کی شہرت ہوتی گئی، اُسیقدر اُسکے چہرے کی شگفتگی زیادہ دلکش اور پائدار نظر آنے لگی۔

لیکن سلیم کے لئے جو شاہد سے بے انتہا محبت کرتا تھا، اور اخلاق و خصائل کے اعتبار سے بہترین انسان تھا شاہد کی یہ حالت سخت تکلیف دہ تھی، اسنے ہر چند کوشش کی لیکن شاہد کی زندگی میں کوئی تغیر نہ پیدا کر سکا، تمام کوششیں اور تدبیریں بیکار ثابت ہوئیں، جب سلیم اپنی تمام تدبیریں ختم کر چکا اور کامیابی کی کوئی توقع باقی نہ رہی تو چار و ناچار اسنے فیصلہ کر لیا کہ شاہد کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور اپنے تئیں جسطرح ممکن ہو بنا ہنے اور اُسکی زندگی سے مانوس بنانے کی کوشش کرے سلیم نے کچھ دن تک تو اس فیصلہ پر عمل کیا لیکن اُس کا جوشِ محبت اور اُس کی شرافتِ نفس زیادہ عرصہ تک شاہد کی المناک تباہیوں کا منظر خاموشی سے دیکھنا برداشت نہ کر سکی اور از سرِ نو اُسے شاہد کی اصلاح کا عزم کرنا پڑا۔

اور اس جدید عزم کے بعد سلیم نے کافی غور و فکر کر کے یہ طے کیا کہ وہ شاہد کو اپنے دوستانہ حقوق کی قوتوں سے مجبور کرے، کیونکہ اُسے یقین تھا کہ شاہد دنیا کی بڑی سی بڑی قوت کا حریف ہو سکتا ہے اور بہتر سے بہتر نعمت کو ٹھکرا سکتا ہے لیکن وہ میری محبت کے مقابلہ میں سرتابی و انحراف کی جرأت نہیں کر سکتا اور یہ طے کرنے کے بعد وہ کسی مناسب فرصت اور موقع کا انتظار کرنے لگا۔

(۲)

ایک دن جب کہ دونوں شہر سے باہر ایک وسیع جھیل کے کنارے جو چاروں طرف پہاڑیوں کے سلسلہ سے گھری ہوئی تھی ایک چٹان پر بیٹھے ہوے قدرتی مناظر کی طلعت ریزیوں اور فطرت کی جلوہ باریوں

سے لطف اندوز ہو رہے تھے سلیم نے موقع پا کر اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔

"شاہد میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں میرا بار بار ایک ہی موضوع پر لاحاصل گفتگو کرنا تکلیف دیتا ہوگا اور تم میری اس حماقت پر اپنے دل میں جھلاّتے ہوگے لیکن میں دوستانہ فرائض کی بجاآوری کیلئے مجبور ہوں اور نہیں چاہتا کہ وہ شخص جسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز کہتا ہوں اسے اسطرح تباہ و برباد دیکھوں حقیقت یہ ہے کہ مجھے تمہاری اس زندگی نے حد سے زیادہ مضطر و وارفتہ بنا دیا ہے اور اب میں زیادہ مدت تک تمہاری اس حالت کو نہیں برداشت کر سکتا، اس لئے جسطرح بھی مجھ سے ممکن ہوسکیگا تمہیں اپنی حالت کی اصلاح کیلئے مجبور کروں گا۔ شاہد! تم خود غور کرو اور انصاف سے کہو کہ تمہارے خاندان کی اُن جلیل المرتبت روایات کا جنہوں نے ساری دنیا میں عقیدت و ارادتمندی کے غیر فانی نقوش پیدا کر دیئے اور تمہارے اس فضل و علم کا جو خدا کی بہترین نعمت ہے اور دنیا میں بہت کم خوش نصیب لوگوں کو منجانب اللہ عطا ہوتا ہے یہی مقتضٰی ہے؟ اور کیا ایک ذی علم و ذی حس انسان کیلئے یہی حالت شایاں ہے جو تم نے اپنی بنا رکھی ہے؟ مجھے تمہاری تبحر علمی اور تمہاری غیر معمولی ذکاوت کو دیکھتے ہوئے اور اپنی بے مائگی پر نظر کرتے ہوئے تمہیں سمجھانے سے شرم آتی ہے لیکن کیا کروں کہ مجبور ہوں۔ تمہیں اس حالت میں دیکھنا میری طاقت اور میرے امکان سے باہر ہے۔ آہ! ایک وہ زمانہ تھا کہ تمہارے شریفانہ اخلاق، مصلحانہ خیالات، ذکاوتِ حس، دقّتِ نظر، ذوقِ علمی، قوتِ تحریر، اور جوشِ بیاں کا ہر شخص مداح و معترف تھا، اور کالج کی زندگی ہی میں دنیا تمہارے روشن مستقبل کی ثناء و صفت کے غلغلوں سے گونج رہی تھی، یا ایک یہ وقت ہے کہ سارا شہر تمہارے نام سے بیزار ہے اور ہر شخص تم سے مخاطبت تک اپنے لئے موجب ننگ و عار سمجھتا ہے، خدارا! اپنی حالت کو سنبھالو اور اپنے آپکو ہلاکت و ذلت کے اس تاریک و عمیق غار سے بچاؤ جسکی طرف تم انتہائی سرعت سے بڑھے چلے جا رہے ہو، اگر تم اب بھی ذرا عقل سے کام لو تو تمہارے واسطے کافی فرصت ہے، اپنے افعال و اعمال کی کافی تلافی کر سکتے ہو ورنہ فرصت گزر جانے کے بعد دنیا و آخرت میں بجز خسران و دوامی ذلت کے کچھ نہ پاؤ گے اور یہ میری آخری گفتگو ہے۔

شاہد! چونکہ میں تمہاری اصلاح کی تمام تدابیر صرف کرچکا اب میرے پاس سوای اسکے کچھ چارہ کار نہیں کہ میں تمہیں اپنی محبت کا واسطہ دوں اور دوستانہ حقوق کی بنا پر تمہیں مجبور کروں - اس لئے میں بحیثیت تمہارے ایک دوست کے تمسے اپنی حالت کی اصلاح کیلئے آخری اپیل کرتا ہوں - مجھے توقع ہے کہ تم میری مخلصانہ زندگی کی سب سے پہلی اور سب سے آخری التجا کو ضرور پذیرا کروگے۔"

سلیم نے دوران تقریر میں شاہد کو متاثر کرنے کے لئے جوش بیان اور اصول خطابت کی پوری قوتیں صرف کردیں - لیکن شاہد بالکل غیر متاثر بیٹھا رہا - اسکے ہونٹوں پر آج بھی وہی بے نیازانہ تبسم نمودار تھا جو اس سے قبل بارہا سلیم کی امیدوں کو خاکستر کرچکا ہے - ہرچند سلیم کو شاہد کی حالت سے کوئی کامیابی کی توقع باقی نہیں رہی تھی لیکن پھر بھی اس نے اپنے سلسلۂ بیان کو بڑے جوش سے جاری رکھا اور اپنی گفتگو کو ختم کرکے جواب کے لئے بیتابی سے انتظار کرنے لگا -

شاہد، جو ابتداء سے اسوقت تک برابر خاموش بیٹھا ہوا مسکرا رہا تھا تقریر ختم ہوتے ہی اس نے نظر اُٹھا کر سلیم کی طرف دیکھا اور دفعتاً اسکی حالت میں ایک حیرت خیز انقلاب پیدا ہونا شروع ہوا، اسکے وہ ہونٹ جنپر اب تک تبسم کی لہریں پیدا تھیں کانپ رہے تھے اور اسکے چہرے پر شکن ہیں سرخی نمودار تھی آنکھیں اُبھر آئی تھیں اور ان میں قدرتاً ایک ایسی معصومانہ چمک پیدا تھی جس نے شاہد کے بغیر کچھ کہے سلیم کی تمام بدگمانیوں کا خاتمہ کردیا - اسی حالت میں شاہد نے ذرا بلند آواز سے سلیم کو مخاطب کیا اور کہنا شروع کردیا :-

"سلیم! میں اپنی خاندانی عظمت سے بخوبی واقف ہوں، اور مجھے اپنے بزرگوں کی اُن قابل احترام روایات کا بھی علم ہے جنہیں تم اس وقت یاد دلانا چاہتے ہو - میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا میرے متعلق کیا رائے رکھتی ہے اور لوگ مجھے کن نظروں سے دیکھتے ہیں اور اسکے ساتھ ہی مجھے تمہارے اُس شدت قلق کا بھی احساس ہے جو تمہیں میری وجہ سے مضطرب بنائے ہوئے ہے جسکے لئے میں سخت شرمندہ و نادم ہوں مگر باوجود ان تمام باتوں کے سلیم تم مجھے معذور سمجھو کہ میں ان کے لئے اپنے مقصد کو قربان نہیں کرسکتا کہ وہ میری نظر میں میرے عقیدہ کے موافق ان سب امور سے بدرجہا

بلند ہے اور میں تم سے بھی التجا کرتا ہوں کہ تم اس باب میں اپنی محبت و دوستی کا واسطہ دیکر سب سے بڑے گناہ کا مجرم نہ بناؤ جسکے لئے میں اپنی کو کبھی تیار نہیں پاتا۔

سلیم! میں تم سے پھر درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اپنی محبت کا خطاوار نہ بناؤ اور للہ مجھے اپنی حالت پر چھوڑ دو۔

شاہد کے ان مختصر جملوں نے سلیم پر ایک عجیب کیفیت طاری کردی، اور کچھ دیر تک وہ بالکل مبہوت بنا رہا، تھوڑی دیر کے بعد جب اسکی حالت سنبھلی تو اُسنے اپنے دل میں ایک ایسی ندامت و شرمندگی محسوس کی جو کسی سخت اخلاقی جرم کے ارتکاب کے بعد انسان کو ہوا کرتی ہے۔ اور شاہد جواب تک اُسکی نظر میں قابل رحم مجرم کی حیثیت رکھتا تھا معصومیت کا سراپا معلوم ہونے لگا۔ اور اسنے منفعل انداز میں شاہد سے معافی کی التجا کی۔ "شاہد! تمہارے ان باثر جملوں نے مجھے بالکل دیوانہ بنا دیا، للہ مجھے معاف کرو، میں نے جو کچھ تمہاری دل آزاری کی اور تمیں اپنی نادانی کے سبب سے صدمہ پہونچایا اُس پر میں سخت شرمندہ ہوں، ہرچند میں تمہارے پُراسرار مقصد سے ہنوز ناواقف ہوں لیکن میرا دل مطمئن ہوگیا ہے اور اب مجھ تم پر کامل یقین ہے۔ اب تک میں تمہارا ہمدرد دوست تھا، لیکن آج کے بعد سے میرے خلوص اور دوستی میں تم عقیدت کیشی کو بھی شامل پاؤگے۔

شاہد نے اِس کے جواب میں سلیم کو محبت بھری نظروں سے دیکھا اور کچھ نہ کہا، اسکے بعد دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔

اتنے عرصہ میں فطرت کی رنگینیاں شام کی تاریکی میں روپوش ہوگئیں اور دونوں اُٹھ کر شہر کی طرف آہستہ آہستہ روانہ ہوے، اور شہر تک دونوں پر ایک قسم کی محویت طاری رہی، شہر پہونچکر ایک نے دوسرے کو سلام کیا، اور حسب معمول ہر ایک اپنے اپنے مکان کی طرف چلدیا۔

سلیم کو آج رات مطلق نیند نہ آئی، وہ تمام رات شاہد کی اس پُراسرار زندگی اور عجیب و غریب مقصد پر غور کرتا رہا۔ لیکن کچھ نہ سمجھ سکا۔

(۳)

سلیم کا روزانہ یہ معمول تھا کہ وہ عصر کی نماز اور ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر شاہد کے یہاں پہونچ جاتا۔ اور پھر دونوں کسی تفریحی مقام پر شام تک کے لئے تفریح کی غرض سے چلے جاتے، چنانچہ آج بھی سلیم حسب معمول

شاہد کے مکان پر پہونچا، شاہد کو خلافِ معمول باہر کمرے میں نہ پایا نوکر سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آج صبح سے شاہد کو سخت بخار ہے اور برابر غفلت طاری ہے سلیم یہ سنکر گھبرا گیا اور فوراً اطلاع کرا کے جس کمرے میں شاہد بخار میں غافل پڑا ہوا تھا پہونچ گیا۔ سلیم نے جاکر چہرے سے چادر ہٹا کر بخار کا اندازہ کرنے کے لئے چہرہ پر آہستہ سے ہاتھ رکھا اور حال پوچھا، شاہد نے بغیر جواب دیئے آنکھیں بند کرلیں اور پھر کچھ دیر کے لئے غفلت طاری ہوگئی۔ سلیم نے ہاتھ سہلانا شروع کر دیئے۔

تھوڑی دیر کے بعد جب ہوش آیا تو نہایت ہی نحیف مگر مطمئن آواز میں سلیم سے کہنے لگا۔ بھائی سلیم! بخار کی تیزی انتہائی حد تک پہونچ گئی ہے، اور ساعت بساعت بڑھتی جارہی ہے۔ اسکے علاوہ یوں بھی مجھے یقین ہے کہ میں زیادہ دیر تک بخار کا مقابلہ نہ کرسکوں گا، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم سے اپنی تمام لغزشوں کی معافی چاہ لوں مجھے سخت افسوس ہے کہ میں نے تمہاری دوستی و محبت کی کچھ قدر نہ کی اور تمہارے احسانات کا کوئی بدلہ نہ کرسکا۔

سلیم! مجھے امید ہے کہ تم ضرور معاف کردوگے اور خدا سے میری سیہ کاریوں کے لئے عفو و بخشش کی دعا کرتے رہوگے"۔ یہ کہتے ہوئے شاہد نے سرہانے سے ایک بند لفافہ اٹھا کر سلیم کے حوالے کیا اور تاکید کردی کہ وہ اسکے دفن سے قبل اسے نہ دیکھے۔

سلیم جو پہلے ہی سے بخار کی تیزی دیکھکر گھبرا گیا تھا، شاہد کی باتیں سنکر بیقرار ہوگیا اور آنکھوں سے رومال لگا کر ہچکیوں سے رونے لگا۔ شاہد نے ہر چند سلیم کو سمجھایا مگر اسکی بیقراری بڑھتی گئی۔

شاہد جو تمام دن میں ابھی ہوشیار ہوا تھا مسلسل گفتگو کرنے اور سلیم کے صدمے کی تاب نہ لاکر پھر بیہوش ہوگیا اور اسکے بعد پھر کبھی ہوش میں آنا نصیب نہ ہوا۔

(۴)

شاہد کی اچانک موت نے سلیم کے دل و دماغ کو پاش پاش کردیا، اسکے ہوش و حواس بالکل جاتے رہے۔ عرصہ تک پاگلوں کی طرح پھرتا رہا بمشکل تمام مدت کے بعد رفتہ رفتہ اسکی حالت سنبھلی اور ہوش و حواس درست ہوئے۔ اب اسے شاہد کے اس خط کا خیال آیا جو شاہد نے اپنی موت سے چند گھنٹہ پیشتر اسے دیا تھا اسنے فوراً ایک دیوانہ وار عقیدت اور پُرشوق بیتابی کے ساتھ خط نکالا اور کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

خط کی عبارت یہ تھی۔

پیارے سلیم! میں تمہیں باور کرانا چاہتا ہوں کہ میری سیہ کاری نہ زندگی نفسانی خواہشوں کا نتیجہ نہ تھی، میں نے یہ زندگی صرف اسلئے اختیار کی تھی کہ میں اپنی کمزوریوں کو سمجھتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اپنی روحانیت کو اس قدر قوی نہ بنا سکوں گا جسکی قوت جاذبیت سے سوسائٹی کی اصلاح کر سکوں جو بحیثیت انسان کے بجانب اللہ میرا اولین فرض قرار دیا گیا ہے، کیونکہ اس صورت میں مجھے نفس و شیطان کے زبردست اغوا اور فریب کاریوں کا حریف ہونا پڑتا، اور یہ میرے امکان و طاقت سے بالکل باہر تھا،

پس میں نے یہی مناسب سمجھا کہ میں خود کو ان سیہ کاریوں کے نتائج کا آئینہ بنا کر سوسائٹی کو ان خوفناک ہلاکتوں سے آگاہ کر دوں، سو بحمداللہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا اور اسلامی سوسائٹی کے بہت سے نوجوانوں کو ہلاکت اور تباہیوں سے بچا لیا، اور اس طرح ایک بڑی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گیا۔

خدا سے دعا کرو کہ میری سیہ کاریوں کو بخش دے اور میری نیت کو قبول فرمائے، اور میرے اس راز کے اخفا کا سبب صرف ندامت تھی نہ کچھ اور، والسلام÷

تمہاری دعا کا محتاج

سیہ کار شاہد

شاہد کے اس خط نے سلیم پر ایسا قوی اثر کیا کہ وہ تمام دنیاوی کاروبار اور مشاغل کو ترک کر کے شاہد کی قبر کا مجاور ہو گیا اور اپنی تمام زندگی محاسن اخلاق اور وحدانیت الٰہی کی تبلیغ میں صرف کر دی÷

مظفر

غمِ عجیب

چارۂ کار بہت۔ مگر چارہ فرما، اے دل وہ صرف تو ہی ہے، جو اپنی ہر تپش قبول کرنے کیلئے آمادہ رہتا ہے۔ میں نے دیکھا ہر نشیب و فراز میں، ہر ویرانہ و آبادی میں، اور ہر وحشت ناک صحرا سے لیکر ہر پُر رونق معمورہ تک ہر زمین و آسمان میں۔ لیکن وہ جو اپنی آرزوؤں سے میری تمناؤں کو متصل کر دے، اپنی خواہشات کو میری مسرتوں سے مل جانے دے، اور وہ جو میری گرانبہا ارمانوں میں اپنی حسرت ختم کر دے کوئی اور کہیں نہیں۔

میں نے سوچا ہر رات کی خلوت میں، ہر تنہائی کی بیداری میں، ہر خاموش گزرگاہ ہر ساکت رستہ اور ہر مطمئن فضا میں، کہ وہ جو میری کائنات کو وسیع، میری زندگی کو لطیف اور میری معاشرت کو عجیب و غریب بنا سکتا ہے، وہ جو میرے دل پر قابو پا لیتا ہے، وہ جو میری نگاہوں کا منظر میری آنکھوں سے چھین لیتا ہے، اور وہ جو میری تمام کیفیات کو اپنی ایک ہی اعتراف ایک ہی اقرار، ایک ہی تبسم سے بے مزہ بنا دینے پر قادر ہے، میرا چارہ ساز نہیں۔ میں سکون چاہتا ہوں، وہ مضطر کرتا ہے، مجھے اطمینان چاہیے وہ بے چین بناتا ہے، میں جمعیت خاطر کا متمنی ہوں، وہ پراگندہ کرنے کے درپے ہے، میں مسرت کا متلاشی ہوں۔ وہ مفقود کرنے کا خوگر لیکن یہ کیوں؟ اس کے سوچنے کے لئے راتوں کا خوشگوار سناٹا بیکار ہے۔ صبح کی بے رنگی جو رنگینی سے بھی زیادہ پُر کیف ہے۔ اس پر غور کرنے کے لئے بے سود ہے قدرت کی رنگ آفرینی بھی جس کا ہر رنگ ایک انجذاب چاہتا ہے۔ انجذاب کا حل۔ اسکے لئے مفید نہیں۔ فطرت۔ جہاں کہیں بھی ہے دلکش ہے۔ ترتیب انتظام میں بھی اور بے ترتیبی و بدنظمی میں بھی لیکن یہ تمام دلکشی، یہ ساری رنگینی اپنی ہر سحر انگیزی و اعجاز نمائی، ہر کرشمہ سازی و اعجوبہ پیرائی کے باوصف موثر نہیں۔ میں جانتا ہوں، کہ ہر وہ موجِ سیمیں جو چادرِ آب کے اس کونہ سے اُس کونہ تک زرخشاں ہے، ہر وہ فروش نقرہ جو سطحِ آب پر اس کنارہ سے اُس کنارہ تک درخشاں ہے اور ہر وہ ارتعاشِ زر جو سارے سمندر پر طوفان و طلاطم کے آٹھ پہر میں تاباں ہے۔ محض اپنے ہی وجود۔ اپنی ہی ہستی سے جاذبِ نظر نہیں۔ جب تک کہ ہر نگاہ اپنی سطح سے لیکر عمق تک ساری وسعت اسکی

تجلی عکس پر صرف نہ کر دے، رات اگر صرف شباب ہی کی ہو سکتی ہے۔ اور صبح کا مطلب اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ وہ تاریکی کے عیوب اپنے نور میں دیکھے۔ تو سچ کہتا ہوں کہ ہر وہ خیال جو گناہ ہے اس میں یہ یقین بھی ہے کہ کامیابی مخصوص ہے اپنی ذات سے۔

سمندر کا سکون اس کے تلاطم سے زیادہ پر کیف ہونا ممکن لیکن اس میں ہوا کی طاقت شامل ہے، فراز نشیب ہی سے شروع ہوتا ہے اور اسی پر ختم لیکن جو لطف سب سے اونچی چوٹی پر ایک گنجان جھاڑی کے نظارہ سے حاصل ہوتا ہے۔ وادی کے کنجوں میں کہاں؟ اور یہ شادابی بنی ہے قطرات شبنم پر۔ ساحل کا منظر خوشنما سہی، مگر قلب کی بیتابی وابستہ ہے تصادمِ امواج کی اس آواز سے جو منحصر ہے کشش و تجاذب کی قوت پر۔ غرض کہ فطرت کا ہر منظر دلکش ہے لیکن یہ دلکشی صرف حسن میں نہیں۔ جب تک نگاہوں کا انجذاب شامل نہ ہو لیکن میرا کہ اپنی آرزوؤں کے ساتھ تنہا ہوں اور اپنی تمناؤں کے ساتھ اکیلا کوئی نہیں حتیٰ کہ اے دل بقدر ضرورت تو بھی نہیں۔

شام کو جو فضا پر تیرنے والی چڑیاں، اور شام کے بعد ساحلِ آب پر ماہتاب کی ضیاریز شعاعوں سے کھیلنے والے انسان۔ دن کی روشنی میں مصروفِ جد و جہد کائنات اور رات کی خاموشی میں محو راحت و استراحت عالم۔ یہ سب میرے تخیل کی قدرت سبب تو کر لیتے ہیں۔ لیکن اسکے معاون نہیں،، بادلوں کی گرج سے میں تڑپ جاتا ہوں اور بجلی کی چمک سے میرے حوصلے شکست ہو جاتے ہیں مگر وہ جنکی طرف میں ایک مترحم نگاہ پیش کرتا ہوں خاموش ہیں۔ میں انسے طلبِ رحم کرتا ہوں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اونکو پس و پیش ہے۔ میری خواہش ہے کہ مجھ میں جسارت پیدا ہو جائے۔ مگر وہ کہتے ہیں۔ موسم کے خلاف بادلوں کا نظارہ خوب نہیں۔ بہت اچھا۔

قمر

غزل

ہر ذرہ میں جلوہ ریز تو ہے — یہ حاصلِ سعی جستجو ہے
آوارۂ چمن ہے بلبل — گل خوش کہ اسیرِ رنگ و بو ہے
دل کو تو ابھی مٹا چکے ہو، — پھر سینہ میں کس کی جستجو ہے
کیفیت اشکِ خوں نہ پوچھو — اب سینہ میں دل نہیں لہو ہے
محوی کو مٹا کے کر دیا خاک — یہ بھی کوئی دلبری کی خو ہے

(محوی)

ناکامِ تمنا

زمانہ بدلتا جاتا ہے ساتھ ہی ساتھ زمانہ کا رنگ بھی، حتیٰ کہ زمانہ کی دستبرد سے کوئی شے محفوظ نہیں رہ سکتی تغیر و تبدل اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ انقلاب زمانہ ہر روز ایک نئی تصویر آنکھوں کے سامنے پیش کرتا ہے کوئی شخص دل میں ہزاروں تمناؤں اور آرزوؤں کو جگہ دیتا ہے، مگر وا حسرتا۔ اسکے دل کی کیا حالت ہوگی جب کہ اسکی تمام آرزوئیں خاک میں ملگئیں، اسکی امیدوں پر پانی پھر گیا۔

در و دیوار تک اس بدنصیب کے دردناک انجام پر اشکِ غم بہا رہے ہیں، ہر شے سے آہ و بکا کی صدا آرہی ہے ذرا غور تو کیجئے وہ بدنصیب بھی کسقدر حسرت نصیب ہے جس کا انجام اس درد انگیز طریقہ پر ہوا ہو؟ وہ اسی چرخ نیلوفر کا کشتہ ہے جو آج یوں ناکام تمنا نظر آرہا ہے۔

کہاں گیا وہ جوش، کیا ہوئے وہ ولولے، کہاں گئے وہ بڑے بڑے حوصلے، کیا ہوئے وہ دعوے کہاں گیا وہ فخرِ رفاقت، کیا ہوا وہ معاہدۂ اعانت، آہ! زمانہ کی ایک گردش نے بس ......
ایک آن میں درماندہ حسرت زدہ بنا دیا، دوست اغیار ہوگئے، جنکی دوستی پر ناز تھا جن کے قول پر اعتبار تھا، جنکی رفاقتِ زندگی گوناگوں انبساط و سرور سے معمور کئے تھی انھوں نے منہ موڑا، اچھے وقت کے سب ساتھی ہیں، رفیق صادق، اور انیس مخلص کوئی نظر نہیں آتا، کشتۂ تمنا ایک طرف اور بیرخیِ دوستاں دوسری طرف ع

دلِ حسرت زدہ اتنا نہ بربادِ تمنا ہو (محوی)

آہ! ابھی گلشنِ امید کھلنے بھی نہ پایا تھا کہ پائمال ہوگیا۔ "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" دل کی حسرتیں دل ہی میں رہیں، ابھی دل کو ایک سرور حاصل ہو رہا تھا اور عالمِ کیف میں وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا کہ ناگہاں انقلاب ہوا، جنکے مشورے انصرامِ امورِ دنیوی کے لئے باعث افتخار تھے، جنکی رائے حوصلہ و رہنما دیتی تھی، وہ اصحابِ مشورہ رخصت ہوگئے، جذبۂ ہمدردی ابھی ناشگفتہ کلی تھی کہ پژمردہ ہوگئی، پناہ بخدا، یہ کیسی بادِ تند چلی کہ چمن کے چمن کو تباہ کر دیا۔

اُف! یہ اصلی تصویر ہے جس نے حقیقی صورت میں جلوہ نما ہو کر اپنے جوہر دکھائے، اور کسی سادہ دل اور ان پر بھروسہ کرنے والے کو محتاط اور دور اندیش ہونے کا درس دیا۔ اور یہ جتا دیا کہ "اس دنیائے ناپائیدار میں

ہرکس و ناکس پر خواہ تعلقات کیسے ہی گہرے ہوں اعتماد نہ کیا جائے بلکہ ہمیشہ اپنی ذات پر اعتبار کیا جائے"۔

آہ! میں ہی وہ سادہ دل، محبت پرور، مگر گشتۂ تمنا ہوں جسکا ایسا دردناک انجام ہوا۔ مجھے ایسے رفیق کے دستیاب ہونے میں سخت ناکامی ہوئی، دل بیٹھ گیا، اور ہمت نہ ہوئی کہ زیادہ جستجو کیجائے میں نے اپنے دل میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دنیا دھوکے کی ٹٹی ہے اور اسپر اعتبار بیکار ہے"۔

ایک دن میں سوچ میں بیٹھا ہوا تھا، ایک بہت گہرے خیال میں پڑا ہوا تھا، دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ میرے پیش نظر تھا، اور اولاد آدم کے حرکات و سکنات اور علم النفس کے ایک پیچیدہ مسئلہ پر غور کر رہا تھا ظاہر و باطن کا موازنہ کر رہا تھا کہ یکایک میری حالت بگڑ گئی، جذبات کا ملاطم پیدا ہوا، قریب تھا کہ آنسو نکل پڑیں، میں نے بہت ضبط کیا اور ایک گہری سانس لیکر کہا "ہاں، لوگوں کے اقوال و افعال میں بہت فرق ہے، ہم جسکو ایس صوری خیال کرتے تھے اُن کے سلوک نے ہمارے خیال کی تردید کردی اور ہمارے حسن ظن کو اپنی حرکات سے بدل دیا"۔

جس بات کا ہمیں وہم و گمان بھی نہ تھا وہ پیش آئی، میری وفا کا خیال نہ کیا، میرے خلوص و عقیدتمندی کی قدر نہ کی، میرے جذبات کا احترام نہ کیا بلکہ بے دردی سے میرے پُر ارمان دل کو مجروح اور میری آرزوؤں کو پائمال کرتا ہوا چلا گیا اور مجھے خبر نہ ہوئی . . . .

جب مجھے ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ میں ایک خوشگوار خواب دیکھ رہا تھا جسکے دردناک انجام سے واقف نہ تھا، میں جس اصول کو صحیح سمجھتا تھا یعنی دل میں محبت، اور محبت میں بیتابی ہوتی ہے اور جذبۂ صادق آخر کو اپنا اثر دکھا کر ہی رہتا ہے" غلط ثابت ہوا۔

میں جس سے یہ جملہ سُننا چاہتا تھا "مجھے تم سے محبت ہے" اسنے یوں تمناؤں کا خون کیا ہے، مجھے ایک سچے دوست کا حاصل ہونا ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے، اس ناپائدار دور جہات میں ایک ہم مذاق ہمیں ہمدم، اور دوستِ صادق کا وجود وہ ہستی ہی جو اس باغ ویراں کو باغ ارم بنا دے، قیام زندگی کو خوشی و انبساط سے معمور کردے" مگر میں اپنے مقصد میں ناکام رہا ؎

آہ اک ہم نہ رہی صحبتِ یاراں باقی،

رہ گئے دل میں مرے داغ ہزاراں باقی

اسی حسرت و یاس بیکسی و بے بسی کی حالت میں غور کر رہا تھا کہ کیا یہ شاہدات و تمثیلات اس بات پر

دلالت نہیں کرتے کہ دنیا کا رنگ ہی ایسا ہے کہ کسی پر اعتماد نہ کیا جائے؟ کیا یہ تلخ تجربے نہیں بتاتے کہ آئندہ احتیاط کی جائے اور ان گندم نما جو فروشوں سے احتراز کیا جائے؟ کیا آزمائی ہوئی بات پر یقین نہ کرنا عقلمندی کی دلیل ہے؟۔

آہ! میں نہیں چاہتا کہ اس دلیل کو مان لوں اور یہ کہہ کر کہ "ہاں آزمودہ را آزمودن جہل است" بے چون و چرا سر تسلیم خم کردوں' اور اپنی وہی کیفیت ظاہر کردوں، محبت جسے حقیقت کا پرتو اور غیر فانی کہا جاتا ہے' اور جسے بقائے دوام کا جامہ پہنایا جاتا ہے اسکی کمزوری سے آگاہ کردوں لیکن میں ایسا کرنے سے قاصر رہا، کیوں؟ یہ نہ پوچھو

عالم رویا میں میں نے دیکھا کہ ایک مقدس بزرگ تشریف لائے میں نے بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا، اور صدر مقام پر بیٹھنے کے لئے اصرار کیا لیکن انہوں نے میرے کسی سوال کا جواب دیے بغیر کندھوں پر ہاتھ رکھکر کہنا شروع کیا، اے جلد باز یہ کیا کرتا ہے' صبر کر صبر، ابھی تو نے دیکھا ہی کیا ہے ؎

نہ داغِ یاس سے گھبرا بر آئے گی امید
گلوں کے بعد ہوا کرتے ہیں ثمر پیدا

کیوں اس قدر جلد مایوس ہوا جاتا ہے، ابھی تجھے کئی ایک دشوار گذار وادیوں سے گزرنا ہوگا، یہ تو ایک معمولی آزمائش تھی لیکن تو اس قدر جلد پست ہمت ہوگیا کہ دنیا سے بیزار ہوگیا، دیکھ! ابھی تجھے کئی ایک سخت امتحانوں میں کامیاب ہونا ہے، مختلف تغیرات زمانہ مشاہدہ کرنے نشیب و فراز دیکھنے اور تلخ تجربوں کے بعد تجھ میں صلاحیت، زمانہ شناسی کا مادّہ پیدا ہو جائے گا، اور یہی وہ زینہ ہے جو تجھے باغِ انبساط و سرور اور کامرانی کے دروازہ تک پہونچا دے گا"

میں جواب دینا چاہتا تھا مگر معلوم ہوا کہ کسی نے زبان پر مُہر لگا دی ہے، میں نے سر جھکا دیا، اور اشاروں ہی اشاروں میں کہا "منظور! بجا ارشاد ہوا! فیصلہ ترا دل سے قبول ہے۔

گو میں نے ضبط کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کرب و بےچینی کے ساتھ ایک آہ نکل گئی اور میں یہ شعر پڑھ کر خاموش ہوگیا ؎

دل وقفِ یاس و حرماں کیونکر کہوں نہیں ہے۔
میں ہوں سرِ قفس ہے، آشفتہ خاطری ہے

(حضرت نوی)

عبدالمنعم سعیدی۔ بی۔اے (علیگ)

اسٹینلی

ہر ملک کی ترقی اور سرسبزی کا انحصار اُسکے نوعُمر افراد پر ہے ، وہ مُلک بہت خوش قسمت ہے جہاں کے نوجوان عالی حوصلہ ، باہمت ، اور مستقل مزاج ہوں ، اور ترقی و بہتری کا خیال اُن کے دل و دماغ میں موجزن ہو ، انگلستان ، جرمنی ، امریکہ ، جاپان ، غرض کسی سلطنت کو لیجئے اُسکی ظفر مندی اور فارغ البالی کا راز یہی ہے کہ اُسکے ہر ایک نوجوان میں غیر معمولی ترقی کا خیال خاص طور پر ہوتا ہے ، وہ اسکی پرواہ نہیں کرتا کہ اُسکی ترقی راہ میں مشکلات و آلام کا ایک خارستان در پیش ہے۔ مثالاً میں انگلستان کے ایک نہایت غریب لیکن باہمت لڑکے کا حال ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں جس نے اپنی غیر معمولی کوشش اور مستقل جواں مردانہ ہمت سے رفتہ رفتہ ترقی کی ، وہ ابتدا میں ایک غریب محرر تھا ، لیکن آخر میں پارلیمنٹ کا معزز و کامیاب ممبر ہوا۔ بڑے بڑے علمی خدمات انجام دیے ، دنیا کی مشہور انجمنوں کا ممبر ہوا اس لڑکے کا نام اسٹینلی تھا ، لیکن آخر میں "سرہنری اسٹینلی ، ایم ، اے ، جی ، سی ، بی ، ممبر آف پارلیمنٹ" کہلایا ، اس کا باپ انگلستان کے ایک محتاج خانہ میں رہتا تھا ، ان محتاج خانوں میں غربا کے لئے رہائش و خوراک کا بطور خیرات کے انتظام ہوتا ہے ، البتہ محتاج خانے میں رہنے والوں کو کوئی کام ضرور کرنا پڑتا ہے ، محتاج خانوں میں غُربا کو بے انتہا تکالیف برداشت کرنا پڑتی ہیں ، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسٹینلی کی ابتدائی زندگی کن مشکلات میں گذری ہوگی اسٹینلی نے تعلیم محتاج خانہ کے مدرسہ ہی میں پائی ، بد قسمتی سے اُسے ایک بد اخلاق اور سنگدل اُستاد سے سابقہ پڑا ، جو محتاج خانہ کے ایک ایسے مہتمم کے زمانہ میں تھا جو اپنی بد سلوکی کی وجہ سے بدنام تھا ، جب اسٹینلی محتاج خانہ کے چھوڑنے کے قابل ہوگیا تو اُسنے ایک دوکان پر ملازمت کر لی۔ اس کے بعد جہاز پر کام کرنے لگا۔ اور پھر ایک سوداگر کے دفتر میں ملازم ہوگیا ، ہر جگہ نہایت محنت و مشقت سے اپنے فرائض کو انجام دیا ، سوداگر اسکی ایمانداری خوش چلنی کی وجہ سے اسے اپنے بیٹے کے برابر عزیز رکھتا تھا ، کچھ عرصہ کے بعد سوداگر کا انتقال ہوگیا۔ سوداگر کی اس بے وقت موت نے اسٹینلی کے خرمن امید پر بجلی گرادی ، مجبوراً اُسنے اور جگہ قسمت آزمائی کی

لیکن ہر جگہ حسبِ بخواہ کامیابی نہیں ہوئی، اب اُسکی پریشانی کی کوئی حد نہیں رہی، اُس زمانہ میں شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ میں غلامی کے انسداد پر لڑائی ہو رہی تھی۔ اسٹینلی فوج میں بھرتی ہو گیا اور لڑائی پر گیا۔ لڑائی میں وہ قید کرلیا گیا۔ جب وہ رہا ہوا تو بحری فوج میں ملازم ہو گیا۔

جنگ کے زمانہ میں وُہ لڑائی کے واقعات اخباروں میں بھیجا کرتا تھا اور اس طرح وہ امریکہ میں مشہور ہو گیا اسکے بعد وہ ٹرکی گیا وہاں کے حالات و واقعات امریکن اخباروں میں بھیجے، اس طرح اُس نے قومی خدمت بھی انجام دی اور مالی امداد بھی کافی حاصل کی۔

جب "ابی سینین" لڑائی شروع ہوئی تو ایک نہایت مشہور امریکن اخبار "نیویارک ہیرالڈ" نے اُسے انگریزی فوج کے ساتھ روانہ کیا تاکہ وہ واقعات جنگ ارسال کرے، کیونکہ یہ ایک خطرناک فرض ہے اور اکثر لوگوں کی جانیں اس فرض کی انجام دہی میں ضائع ہوتی ہیں، اس وجہ سے اس جگہ پر تنخواہ نہایت معقول دیجاتی ہے اسٹینلی نے واقعات جنگ ارسال کئے، اور چونکہ اس فرض کو نہایت بہادری، قابلیت اور محنت سے انجام دیا اس لئے اُس کی دولت اور عزت سے کافی قدردانی کی گئی۔

ایڈیٹر نیویارک ہیرالڈ نے اسٹینلی کو لکھا کہ وہ لونگ سٹون کی تلاش میں افریقہ جائے۔ لونگ سٹون ایک انگریزی مشنری تھی جو تاریک افریقہ کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں اور وہاں کے وحشیوں کی تعلیم و تربیت کیلئے روانہ ہوئی تھی ایک عرصہ سے اسکے متعلق کچھ معلومات حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ کُل یوروپین اقوام اسکے متعلق دریافت کرنے کی منتظر تھیں۔ ایڈیٹر ہیرالڈ نے خیال کیا کہ اگر اسٹینلی اس کا پتہ لگا لیگا تو میرے اخبار کی اشاعت اس مشنری کے حالات کی وجہ سے تعداد میں بہت ہو جائے گی۔

اگرچہ یہ ایک پرخطر اور مہلک مہم تھی لیکن اسٹینلی جواں مردانہ روانہ ہو گیا اور ہزارہا مصائب برداشت کرکے لونگ سٹون کا پتہ لگایا۔ اب کیا تھا اسٹینلی نے کُل یورپ و امریکہ میں نام پیدا کرلیا اور عزت و دولت سے مالامال ہو گیا، انگلستان واپس آنے پر اُس کا نہایت گرمجوشی سے استقبال ہوا۔

انگریزی اخبار "ڈیلی ٹیلیگراف" نے متحد ہو کر طے کیا کہ وسط افریقہ کے متعلق معلومات بہم پہونچانے کیلئے ایک جماعت روانہ کی جائے، اور مسٹر اسٹینلی اُس کا لیڈر ہو،

افریقہ ایک نہایت پُرخطر ملک ہے، آب وہوا بہت خراب ہے، جنگلی قومیں آباد تھیں اور اب بھی اکثر جگہ ہیں، گھنے جنگل بکثرت ہیں، ہزارہا قسم کے درندے موجود ہیں، اس مُلک میں اُس وقت تک مہذب دنیا کا

کوئی انسان نہیں گیا تھا، اور اُسکے متعلق کچھہ معلومات نہ تھی، اسٹینلی مردانہ وار تمام مشکلات کا مقابلہ کرکے اور اپنی جان پر کھیلتا ہوا ایک عرصہ تک اس پُرخطر ملک میں چکّر لگاے اور صدہا تجربے حاصل کئے اپنے ملک کو وہاں کے حالات سے مطلع کیا اور اپنی قوم کو وہاں کے پوشیدہ خزانوں کا راستہ بتایا اس کے بعد یورپین اقوام نے وہاں جاکر تجارت وزراعت سے لاتعداد دولت حاصل کی اور کر رہے ہیں۔ جب اسٹینلی اپنے ملک واپس آیا تو بچے بچے نے اُس کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا، گورنمنٹ نے اُسے "گرانٹ کمانڈر آف دی باتھ" کا معزز خطاب عطا کیا، اور بہت سے اعزازی درجے، تمغے مختلف انجمنوں نے پیش کئے اور اپنی قوم میں اور بھی زیادہ مشہور ہو گیا۔

مختصراً ایک غریب نادار لڑکا اپنی ہمت بہادری مستقل مزاجی، راستبازی اور عالی حوصلگی سے نہایت معزز زندگی بسر کر کے راہی ملک عدم ہوا ٭

انیس انصاری بھوپالی

کلام بزم

جب میں دلدادہ نہ تھا، شہرت بھی پائی نہ تھی
تم تماشا تھے مگر دنیا تماشائی نہ تھی

خوفِ بدنامی نہ تھا، تکلیف رسوائی نہ تھی
کیا طبیعت تھی مری جب تک کہیں آئی نہ تھی

طور پر چڑھ کر کہا جاتا تھا پہلے حالِ دل
بارگاہِ حُسن میں آسان شنوائی نہ تھی

جب کبھی جلوہ دکھایا تونے "اے حُسنِ ازل"
ساری محفل اک تماشہ تھی تماشائی نہ تھی

صاف کہدوں گا اگر محشر کے دن مجمع ہوا
وعدۂ دیدار میں ہنگامہ آرائی نہ تھی

میری وحشت نے بڑھائی رونقِ بزمِ جہاں
میں نہ تھا جب تک تو یہ ہنگامہ آرائی نہ تھی

مرنے والے تھے قفس ہی میں اسیرانِ قفس
تیلیاں ٹوٹیں تو اُڑنے کی توانائی نہ تھی

خواب کے حیلے سے "نالا بزم" مجھکو بزم سے
یہ مری اُلفت کا خمیازہ تھا انگڑائی نہ تھی

بزم اکبرآبادی

عجمی دُلہن اور عربی نوشہ

بوران بنت حسن کی شادی خلیفہ مامون الرشید عباسی سے

بوران کا خاندان دولتِ عباسیہ کے آغاز دعوت میں امام ابراہیم بن محمد بن علی کو ابو مسلم خراسانی، اور سفاح خلیفہ اوّل کو، ابو علی ہروی اور خالد برمکی ایسے اولوالعزم تجربہ کار، اور پرجوش داعی مل گئے تھے جنکی ان تھک کوششوں نے عربوں کے ساتھ ملکر آلِ محمدؐ کو پیرزادگی اور امامت کے درجے سے سلطنت پر پہونچا دیا۔ لیکن حکومت نے بھی ان عجمی بہادروں کے حسنِ خدمات کی خوب قدر کی اور ملکی و مالی عہدے دیکر ان کو بھی عربوں کے ہم پلہ بنا دیا چنانچہ دولت عباسیہ کی تاریخ میں "برامکہ" کا اقتدار ضرب المثل ہے۔ خاصکر یحییٰ برمکی کا عہد وزارت عجمیوں کے لئے خدا کی رحمت سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں سہل سرخسی (سرخس خراسان کا مشہور شہر ہے) کا خاندان بھی عروج پر پہونچا۔

سہل نسباً و مذہباً مجوسی تھا۔ اور اس کا سلسلہ نسب سلاطین فارس تک پہونچتا تھا، خلیفہ ہارون الرشید کے مبارک عہد میں، یحییٰ برمکی کے فیض صحبت سے مسلمان ہوا۔ چنانچہ سہل کے دو بیٹے فضل اور حسن، مامون الرشید کے عہد میں بوجہ وزارت تک پہونچے۔ الفخری[1] کی روایت ہے کہ فضل کو علم نجوم میں کمال تھا اور اسنے معلوم کرلیا تھا کہ ہارون الرشید کے بعد عباسی تخت و تاج کا مالک، مامون الرشید ہوگا۔ لہذا اسنے شاہزادہ مامون الرشید کی مصاحبت کو پسند کیا اور جعفر برمکی کی خاص سفارش سے ہارون الرشید نے فضل کو مامون کا ندیم بنا دیا چنانچہ جب مامون رشید نے بار خلافت اٹھایا تو فضل کو قلمدان وزارت سپرد کرکے "ذو الریاستین" کے معزز خطاب سے سرفراز فرمایا۔ اور حقیقت میں یہ فضل کی اُن خدمات کا صلہ تھا جو مامون الرشید کے حصول خلافت میں کی گئیں لیکن افسوس ہے کہ فضل کو زیادہ مدت تک وزارت کرنا نصیب نہیں ہوا۔ اور ۲۰۲ھ (۸۱۷ء) میں مامون الرشید کے اشارہ سے قتل کر دیا گیا۔ اور فضل کا بھائی حسن وزیر اعظم مقرر ہوا۔ چنانچہ بوران، اسی حسن کی نامور بیٹی ہے جسکی شادی کا یہ مختصر تذکرہ ہے۔

[1] الفخری صفحہ ۲۰۲ مطبوعہ مصر۔

بوران کی ولادت اور تعلیم و تربیت

یہ بلند اقبال اور فخر خاندان لڑکی ماہ صفر ۱۹۲ھ[۲] میں پیدا ہوئی "خدیجہ" نام رکھا گیا۔ اور "بوران" لقب ہوا۔ لیکن یہ پیار کا نام اس قدر مقبول ہوا کہ اپنے نام کی شہرت کو بھی دبا دیا۔ بوران نے اپنے باپ کے گھر میں تعلیم و تربیت پائی اور زیور تعلیم سے آراستہ ہو کر اپنے زمانہ کی بہترین عورت تسلیم کی گئی حسن و جمال کے علاوہ علم ادب اور موسیقی میں باکمال اور عقل و فراست کے ساتھ سلیقہ مندی میں ممتاز تھی اور اس اعلیٰ تعلیم کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ محلسرائے خلافت کی بیگمات سے میل جول رہتا تھا جس طرح[۱] ہارون الرشید کا دربار علم و فن کا مرکز تھا۔ اسی طرح زبیدہ خاتون کی مجلس امیرزادیوں کے لئے ایک درس گاہ تھی۔ جہاں وہ شاہانہ آداب و قواعد، اور تہذیب و تربیت حاصل کرتی تھیں۔ اور یہ مسلم ہے کہ مشرقی خواتین کے شاہی طبقہ میں زبیدہ خاتون جیسی جدت طراز (فیشن ایبل) بیگم اس عہد میں دوسری نہ تھی۔ یہی وہ خاتون ہے جس نے سب سے اول جواہر کی مرصع جوتیاں ایجاد کیں اور سب سے اول خود ہی پہنیں، یہی وہ نازک دماغ بیگم ہے کہ جسکے بزم عیش میں عنبر کی شمعیں روشن ہوئیں۔ یہی وہ عربی شہزادی ہے کہ جسنے چاندی، آبنوس اور صندل کے قبے بنائے اور انکو دیبا و سمور اور مختلف رنگ کے ریشمی کپڑوں سے آراستہ کیا۔ اور یہی وہ جلیل القدر بی بی ہے کہ جسکے لباس کے واسطے پچاس پچاس ہزار اشرفی کی قیمت کا ایک تھان تیار ہوا[۲]۔ خلاصہ یہ ہے کہ بوران کی سلیقہ شعاری میں زبیدہ خاتون کی فیض صحبت کا خاص اثر تھا۔

شادی کے اسباب

یہ قدیم دستور ہے کہ امراء اور وزراء کی بیٹیاں، شاہی محلات میں جایا کرتی ہیں۔ اور ان میں جو ممتاز ہوتی ہیں اُن کی شہرت بادشاہ اور شاہزادوں تک ہو جاتی ہے۔ اور اکثر یہی شہرت باعث تحریک عقد ہوا کرتی ہے۔ اور چونکہ بوران بھی قصر معلیٰ میں آیا کرتی تھی اسلئے اس کا حال مامون الرشید کو معلوم تھا۔ اور اسکے کمالات سُنکر غائبانہ مشتاق تھا، دوسرا سبب یہ ہے کہ جب مامون الرشید نے فضل کو قتل کرا دیا تو خاندان وزارت کے رضامند کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہ تھا کہ اس کا حقیقی بھائی حسن درجۂ وزارت پر ممتاز کیا جائے۔ چنانچہ مامون الرشید نے حسن کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ اور سب سے بڑھ کر احسان یہ کیا کہ اُسکی بیٹی بوران سے عقد کر لیا۔" لیکن نہایت افسوس ہے کہ بعض عجائب پرست وقائع نگاروں نے

[۱] الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۱۰۲ مصر ۱۲

[۲] مروج الذہب مسعودی ذکر خلافت قاہر باللہ مطبوعہ مصر ۱۲

روشن پہلو کو چھوڑ کر تاریک رخ اختیار کیا ہے اور واقعہ مذکور کو ایک افسانہ بنا دیا ہے۔

چونکہ یہ ایک تاریخی واقعہ عام طور پر غلط مشہور رہا ہے۔ لہذا عقد الفرید[۱] ابن عبد ربہ کی وہ روایت لکھی جاتی ہے، بعد ازاں صحیح واقعہ لکھا جائے گا۔

اسحق موصلی مغنی کی روایت۔

اسحاق راوی ہے کہ مجھے خوش نصیبی سے حسن بن سہل وزیر کے محل میں ایک مخفی طریقہ سے جانے کا اتفاق ہوا۔ اور مسلسل تین رات۔ بوران کی محلس عیش میں شرکت کا موقع ملا۔ اور چوتھی مرتبہ میں مامون الرشید کو بھی اپنے ساتھ محل میں لے گیا۔ چنانچہ جب مامون نے بوران کو دیکھا تو وہ اسکے حسن عالم افروز کو دیکھ کر غش کر گیا۔ جب ہوش وحواس درست ہوئے اور دل نے قرار پکڑا تو علمی صحبت مرتب ہوئی۔ اور نبیذ (کھجور کی تاڑی) کے دور کے ساتھ بوران نے عود بجانا شروع ہو گیا۔ بوران کے موسیقی کمالات نے جب مامون الرشید کو دیوانہ بنا دیا تو تحکمانہ لہجہ میں اسنے حکم دیا کہ اسحق! کوئی ترانہ چھیڑ۔ یہ سنتے ہی بوران نے سمجھ لیا کہ میں اسحاق مغنی۔ اور میرا آقا خلیفہ مامون الرشید ہے۔ لہذا وہ تڑپ کر پردہ میں چلی گئی (اسحق نے تمام حالات سے مامون الرشید کو اول آگاہ نہیں کیا تھا) جب میں گانے سے فارغ ہوا تو پوچھا کہ یہ کسکا محل ہے۔ ایک کنیز نے بڑھ کر عرض کیا کہ حسن بن سہل وزیر کا۔ چنانچہ اسی وقت حسن طلب ہوا۔ مامون نے پوچھا کہ تمھاری کوئی بیٹی ہے عرض کیا کہ "ہاں" "ایک کنیز ہے جسکو "بوران" کہتے ہیں"۔ پھر پوچھا کہ شادی ہو چکی ہے؟۔ عرض کیا کہ نہیں۔ تب مامون نے کہا کہ میں بوران کا خطبہ کرتا ہوں۔ حسن نے کہا کہ بوران حضور کی کنیز ہے اور میں بھی فرماں بردار ہوں۔ چنانچہ تیس ہزار دینار مہر معجل پر نکاح ہو گیا۔ اور مامون الرشید کے حکم سے میں نے اس واقعہ کو اُس کے انتقال تک کسی پر ظاہر نہیں کیا"۔

اسحق کی روایت جو ایک فرضی داستان ہے۔ اسپر متعدد جرح ہو سکتی ہیں جس خلیفہ نے مخفی حالات دریافت کرنے کے لئے سترہ سو بڑھیا عورتیں مقرر کر رکھی ہوں اُسکو اپنے وزیر کے گھر کا حال معلوم نہ ہو، یہ کمال تعجب ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ علامہ ابن خلدون[۲] جیسے محقق نے مقدمہ تاریخ میں اس روایت پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مامون الرشید علم و مذہب میں اپنے اجداد اور خلفاء راشدین کا مقلد تھا۔ ایسے شخص کا طرز زندگی اُن فاسقوں کی طرح نہیں ہو سکتا ہے۔ جو پاک شہدوں کی طرح گلیوں میں رات کو

[۱] عقد الفرید جلد ۳ صفحہ ۲۵۶ مطبوعہ مصر ۱۳۰۵ھ۔ اور اردو میں نہایت تفصیل سے دلچسپ افسانہ کتاب برامکہ حصہ دوم میں درج ہے ۱۲

[۲] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۱۳ مطبوعہ مصر۔ فضائل علم تاریخ۔

آوارہ پھرا کرتے ہیں۔ بھلا اس واقعہ کو حسن بن سہل کی بیٹی سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے جو اپنے باپ کے گھر میں پارسائی و عفت سے شریفانہ زندگی بسر کرتی ہو۔"

عقد کا صحیح واقعہ اور رخصتی جلسہ۔

واقعہ نفس الامر یہ ہے کہ مامون الرشید نے فضل بن سہل کے قتل کے بعد ہی ۲۰۲ھ میں بمقام مرو[۱] بوران سے عقد کر لیا۔ اس وقت بوران کی عمر دس سال کی تھی۔ اس وجہ سے دلہن رخصت ہو کر نوشہ کے گھر نہیں آئی لیکن ۲۱۰ھ میں بغداد سے بڑے تزک و احتشام کیساتھ برات روانہ ہوئی جسکی تفصیل یہ ہے:-

فم الصلح میں جشن شادی

دولت عباسیہ کی تاریخ میں صرف خلیفہ ہارون الرشید اور مامون الرشید کا دور حکومت ایسا تھا جسکو "عہد زریں" کا خطاب دیا گیا ہے۔ علمی ذوق، فنون فلسفہ کے تراجم، اور اسکی اشاعت اسی مبارک زمانہ میں ہوئی۔ تہذیب و تمدن کے متن پر جسقدر سنہری حاشیے چڑہائے گئے اسکا فخر بھی اسی دور کو حاصل ہے۔ چنانچہ بوران کی شادی بھی اس عہد کے جاہ و حشم اور مسرفانہ مصارف کی ایک ایسی دلچسپ داستان ہے جسکی نظیر اس عہد کے سوا تاریخ اسلام میں اور کہیں نہیں مل سکتی ہے۔

الغرض جب مامون الرشید کو بوران کی رخصتی کا خیال ہوا تو اس نے حسن سے درخواست کی اور حسن نے بمقام "فم الصلح"[۲] (دجلہ کے کنارے واسط کے قریب) جو آب و ہوا اور موقع کے لحاظ سے ایک بے نظیر جگہ تھی اور جہاں حسن کی شاندار کوٹھیاں تھیں برات بلائی۔ چنانچہ مامون الرشید مع اراکین دولت خاندان شاہی اور تمام فوج و حشم کے دولہا بنکر روانہ ہوا۔ اور بغداد سے چلکر فم الصلح میں ٹھہرا۔ حسن نے فم الصلح کو جس طرح سجایا ہوگا اس کا سماں تو عالم خیال ہی میں انسان دیکھ سکتا ہے کیونکہ جس برات کا دولہا مامون الرشید ہو۔ اسکی شان و شوکت اور تکلفات کا تذکرہ قلم سے ادا ہونا محال ہے۔ حسن نے تمام براتیوں کے ساتھ جو اعلیٰ فیاضی برتی اور جس شان و شوکت سے اپنی بیٹی کو رخصت کیا اسکی نسبت مورخین عرب کا دعویٰ ہے کہ گزشتہ اور موجودہ زمانہ اسکی نظیر نہیں لا سکتا ہے، اور انصاف یہ ہے کہ انکا دعویٰ بالکل صحیح ہے۔ چنانچہ حسن نے اول خاندان بنی ہاشم اور افسران فوج اور اعلیٰ طبقہ کے عہدہ داروں پر مشک و عنبر کی گولیاں نثار کیں۔ اور ہر گولی کے اندر ایک پرچہ تھا جسمیں جاگیر، خلعت، املاک، لونڈی، غلام، اسپ خاصہ اور نقدی کی تفصیل تھی۔ اور یہ حکم تھا

---

[۱] شادی کے حالات تاریخ ابن خلکان جلد اول صفحہ ۹۳۔ اور الفخری صفحہ ۲۵۳ سے ماخوذ ہیں۔
[۲] معجم البلدان یاقوت صفحہ ۳۹۹ جلد مطبوعہ مصر۔

کہ جس پرچہ میں جو تحریر ہو وہ اُسیوقت وکیل المرصد (صدر خزانچی) سے حاصل کرے چنانچہ خواص کیلئے تو یہ لوٹ تھی اور عوام پر مشک و عنبر کی گولیاں۔ اور درہم و دینار کی بارش ہو رہی تھی۔ عجمی اور عربی کھانوں کی تکلفات کا تو ذکر کیا ہو سکتا ہے۔ جو کچھ نہ ہو تھوڑا ہے۔ تمام لشکر میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جسکو بازار سے کسی شے کی خریداری کی ضرورت پیش آئی ہو بلکہ تمام سامان حسن کی طرف سے دیا جاتا تھا

مامون الرشید محلسرا میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک قدیم رسم ہو کہ دولھا برات کے دن اول ہی روز (یا اول ہی وقت) زنانخانہ میں بُلایا جاتا ہے۔ اور عورتیں متفرق رسمیں ادا کرتی ہیں۔ یہ تو یقین نہیں ہے، کہ جو بدعتیں آج ہوتی ہیں وہ اس زمانہ میں ہونگی تاہم طبقۂ اناث کی دلچسپی کے کچھ سامان ضرور ہونگے۔

الغرض مامون الرشید محلسرا میں داخل ہوا تو وہ ایک مسند پر بٹھایا گیا۔ جو سونے کے تاروں سے بنایا گیا تھا، اور گوہر و یاقوت سے مرصع تھا۔ چنانچہ بیگمات نے نچھاور کرنا شروع کی۔ دولھا کے سر سے بیش قیمت موتی ڈھلک کر جب زریں مسند پر بکھرتے تھے تو وہ عجیب شان دکھاتے تھے اور یہ ایسا دلفریب منظر تھا کہ سادہ، عربی النسل دولھا بھی جوش مسرت سے متاثر ہو گیا۔ اور ابونواس کا یہ شعر پڑھا۔ جو اسنے کبھی صفت شراب میں لکھا تھا اور شعر پڑھنے سے پہلے یہ کہا کہ کمبخت نے جو کچھ لکھا ہے گویا یہ سماں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

کانّ صغریٰ وکبریٰ من فواقعھا

حصباءُ دُرٍّ علیٰ ارض من الذھبا

تیسرے دن جب مامون الرشید دوبارہ محلسرا میں گیا اور دولھا دولہن ایک ساتھ مسند پر بیٹھے (اسکو آرسی مصحف یا چوتھی کی رسم سمجھو) تو بوران کی دادی نے ایک ہزار بیش قیمت موتی نثار کئے (یہ موتی طلائی سینی میں تھے) اس رسم کے وقت مامون کی سوتیلی ماں زبیدہ خاتون اور اُسکی بہن حمدودہ بھی موجود تھی۔ اور اسی رات کو مامون الرشید کے خلوت سرائے عیش میں چالیس من (من کی مقدار اُس زمانہ میں نہایت قلیل تھی) عنبر کی ایک شمع طلائی لگن میں روشن کی گئی۔

مصارف حسن بن سہل وزیر اعظم نے اس تقریب میں پچاس کرور درہم یعنی بارہ کرور

۵۱ جام شراب کے چھوٹے بڑے بُلبلے ایسے نظر آتے ہیں کہ گویا سونے کی زمین پر موتیوں کے دانے بکھرے پڑے ہیں۔

پچاس لاکھ روپیہ) صرف کیا، اور مامون الرشید نے اپنے خسر یا وزیر السلطنت کو بہ تقریب تہنیت شادی دو کرور پچاس لاکھ روپیہ انعام دیا اور فم الصلح کو ہمیشہ کے لئے حسن کی جاگیر میں دیدیا - اور انیس دن کے بعد شوال کی ساتویں تاریخ سنہ ۲۱۰ھ (۸۲۵ء) میں بغداد واپس آیا ہے - اپنے ارکان دولت کو انعام دیئے، اور عربوں کی تھیلیاں اشرفیوں سے بھر دیں زمانۂ حال کے عوام اور خواص کو یہ قصہ ایک مبالغہ آمیز کہانی معلوم ہوگی لیکن یہ تاریخ کے صحیح واقعات ہیں جسکا انکار کی جرأت کرنا غلطی ہے کیونکہ اس عہد کے سلطنت کا جمع خرچ زمانۂ حال کے اصول پر نہ تھا، البتہ اسراف کا اطلاق صحیح ہے۔

بوران محل خلافت میں | جب بوران شہنشاہ بیگم ہوکر محل میں داخل ہوئی تو اپنی اطاعت شعاری اور سلیقہ مندی سے مامون الرشید کی طبیعت پر حاوی ہوگئی اور ہمیشہ لوگوں کے حق میں مفید سفارشیں کرتی رہی - بغداد میں کئی بیمارستان (شفاخانے) اور مدرسے بنوائے اور ان پر جاگیریں وقف کیں -

بوران کی موت | افسوس کہ شادی کے بعد صرف آٹھ سال تک بوران نے لطف حیات اٹھایا - کیونکہ ۸ رجب سنہ ۲۱۸ھ (۸۳۳ء) میں مامون الرشید کا انتقال ہوگیا اور بوران - مامون کے فراق میں سوگوار بن گئی، اور اسّی برس کی عمر میں بروز منگل - ماہ ربیع الاول سنہ ۲۷۱ھ (۸۸۴ء) میں بمقام بغداد انتقال کیا - اور جامع السلطان کے قبہ کے سامنے دفن ہوئی - تذکرۃ الخواتین (یہ ایک معمولی تذکرہ عورتوں کے حالات میں ہے جس کا اردو ترجمہ بھی "حور مقصورات فی الخیام" کے نام سے موسوم ہوگیا ہے) میں لکھا ہے کہ بورانی بھی اسی بوران سے منسوب ہے مگر کسی تاریخ میں ہمنے نہیں پڑھا -

عجم کی دوسری خاتون - بوران بنت پرویزبن ہرمز بھی تاریخی شہرت رکھتی ہے ÷

محمد عبدالرزاق
مصنف البرامکہ

افکار فکری

تیرے ہی دم قدم سے ہے شان زندگانی — تو ہی متاع ہستی تو جان زندگانی
یوں ایڑیاں رگڑ کر جینے سے فائدہ کیا — میری بلا اٹھائے احسان زندگانی
مرنا ہی تھا تو تیرے قدموں پہ جان نکلتی — نکلا مگر نہ یہ بھی ارمان زندگانی
یہ صرصر حوادث یہ بحر غم کی موجیں — اب توڑ بوہی دیگا طوفان زندگانی
نیچی نگاہ دالو میری طرف بھی دیکھو — مجھکو بھی چاہیئے کچھ سامان زندگانی
ممکن ہے یہ تو فکری دہ مائل ستم ہو — وسعت طلب ہے لیکن میدان زندگانی

(فکری)

سحر

دُھل جائے سب غبار دل بادہ خوار کا
چھینٹا اگر پڑے کوئی ابرِ بہار کا

ہے آسماں کا قصد کبھی بام یار کا
دیکھو تو حوصلہ مرے مشتِ غبار کا

روزِ شمار کی تو ہوئی داستاں تمام
قصّہ ہوا نہ ختم شبِ انتظار کا

نکلیں گی بعد مرگ جو دل کی کدورتیں
ایک آسمان اور بنے گا غبار کا

کہنا نہ پھر کہ طور کے دھوکے میں رہ گئے
ہشیار اے کلیم یہ کوٹھا ہے یار کا

ڈوبے ہوئے ہیں رنگ میں گُل سر سے تا قدم
طوفاں اُٹھا ہے باغ میں فصلِ بہار کا

بستر پہ میرے دیدۂ تر کا لہو نہیں
پھُولا شفق ہے صبحِ شبِ انتظار کا

بختِ سیاہ کا مرے دونا عروج ہے
طُرّہ لگا ہے جیسے شبِ انتظار کا

ہیں نونہال ساغرِ گُل ہاتھ میں لئے
پیالہ ہے آج باغ میں کس بادہ خوار کا

بھڑکا رہا ہے آتشِ گُل یہ چمن میں اور
پنکھا جو چل رہا ہے نسیمِ بہار کا

غنچے بھی مُٹھیوں میں زرِ گُل لئے ہوئے
مُنھ دیکھنے کو آئے عروسِ بہار کا

ٹھوکر لگاتے آئے ہو ٹھوکر لگاتے جاؤ
اچھی طرح نشان مٹا دو مزار کا

اللہ دسترس دے اگر عندلیب کو
مُنھ چوم لے لپٹ کے عروسِ بہار کا

مشعل دکھا رہا ہے تجھے رہروِ عدم
شُعلہ لپک لپک کے چراغِ مزار کا

جب دیکھو ہے حسینوں کا میلہ لگا ہوا
تعویذ نقشِ حب ہے ہماری مزار کا

لُقمہ جو میری نعش کا کھا کر رہا تھی
مٹّی سے دوستوں نے بھرا مُنھ مزار کا

سحر اک نگاہ ناز سے دیوانہ کر دیا
دیکھا کرشمہ چشمِ فسوں سازِ یار کا

شورشِ غم

ہوا دنیائے دوں میں روزِ عبرت خیز چلتی ہے کبھی آہستہ چلتی ہے، کبھی کچھ تیز چلتی ہے
ہزاروں شکل سے بن بن کے دَرد انگیز چلتی ہے ہمیشہ دلشکن ہر وقت حسرت ریز چلتی ہے
مگر جو سو رہے ہیں آنکھ اُن کی بند رہتی ہے
طبیعت راحتِ فانی کی خواہشمند رہتی ہے

ذرا اے اہلِ بینش چشمِ بینا کھول کر دیکھو جو اس بازار سے لینا ہے اُس کا مول کر دیکھو
ملیگا گوہرِ نایاب موتی رول کر دیکھو عمل کو اپنے میزانِ جزا میں تول کر دیکھو
تمھیں جانا ہے، جانے کے لئے تیار ہو جاؤ
کہاں تک غفلتیں بیدار رہو ہشیار ہو جاؤ

صفر کی تیسری تاریخ کی شب، شامِ آفت تھی وُہ زندہ تھے مگر بے چین عالم کی طبیعت تھی
نگہداروں کے گھر سے اک قلم مفقود راحت تھی اسی کی صبح تو بھوپال میں صبحِ قیامت تھی
نتیجہ صبح کو یہ گوشزدِ سب کے ہوا آخر
کہ پچھلی رات کو نوابؔ اپنا چل بسا آخر

یہ دیکھا جا کے ہیں نواب نصر اللہ خاں بیجاں کسی پہلو میں حسرت ہے کسی پہلو میں ہے ارماں
سرہانے بانوے دلگیر، بچے پائینتی نالاں تلاطم سا تلاطم، خادم و مخدوم سب گریاں
کہوں کیا غم کسے کم تھا زیادہ جوش کس کو تھا
کسی کی دلدہی کرتا کوئی یہ ہوش کس کو تھا

اُدھر اہلِ عزا کی آنکھ سے آنسو نکلتے تھے تاسف سے اِدھر سارے ملازم ہاتھ ملتے تھے
زمیں پر اُٹھ کے گرتے تھے کبھی گر گر سنبھلتے تھے سراپا سرد تھے لیکن کلیجے غم سے ملتے تھے
وُہ جیتی جاگتی تصویر کا مُردہ نظر میں تھا
فلک کا دِل ہلا دینے کو اک کہرام گھر میں تھا

عبیداللہ خاں کے غم میں نصر اللہ خاں آخر — ہوے آخر اُٹھا کر دردِ دل کی سختیاں آخر
فراقِ قوتِ بازو میں کھودی اپنی جاں آخر — سُنا دی مختصر کر کے یہ اپنی داستاں آخر
بھلا جو رات دن غم کھاے وُہ پانی پیے کیونکر
جو مرنا بھائی کا دیکھے وہ ہنس ہنس کر جیے کیونکر

تسلی کے لئے بیگم کے بچے ہیں خدا رکھے — غمِ والد بھی ہے اولاد کی میراث دل سے پوچھے
مگر سلطانہ کے دل کو کوئی تسکین کیونکر دے — حمید اللہ خاں خود ہو رہے ہیں رنج کے پُتلے
کہیں کیا صبر کو اب صبر ان کو آ نہیں سکتا
یہ ایسا داغ ہے جو زندگی بھر جا نہیں سکتا

خدا کے سامنے مرحوم سر اپنا جھکاتا تھا — رسولِ پاک کے رستہ پہ تا امکان جاتا تھا
قدم ہرگز نہ اپنا ماں کی طاعت سے ہٹاتا تھا — یہ وہ مخدوم تھا جو ناز خادم کے اُٹھاتا تھا
جنازہ لیکے سب کاندھوں پہ جاتے ہیں سعادت کا
ہوا جاتا ہے پیوندِ زمیں لاشہ مُروّت کا

عظیم القدر تھا اُس کا وُہ عہدِ حکم فرمائی — کہ جب طاعون کی ہر سمت تھی ہنگامہ آرائی
قضا سے بھاگتے تھے لوگ زیرِ چرخِ مینائی — خبرگیراں نہ تھا مونس کا مونس بھائی کا بھائی
جہاں سب مر رہے تھے یہ وہاں مرنے کو حاضر تھا
رعایا کا شریکِ درد تھا، حالت کا ناظر تھا

وہی مرحوم کی دلسوزیاں اب یاد آتی ہیں — لبِ گویا پہ سب کی صورتِ فریاد آتی ہیں
چمن میں قمریاں نالاں پئے شمشاد آتی ہیں — سوئے گل بلبلیں آتی ہیں اور ناشاد آتی ہیں
صفِ ماتم میں جوشِ عام ہے اک نوحہ خوانی کا
دُھواں پہونچا ہے چرخِ پیر تک سوزِ نہانی کا

شفق تا کے زباں کو بند کر نوحہ گری کیسی — حواسوں میں ترے بیفائدہ یہ ابتری کیسی
[illegible]

تارا

(افسانہ)

وہ وقت قریب ہی کہ ستارے دنیا کے مناظر پر حسرت و یاس سے آخری نگاہیں ڈالیں اور شہنشاہ خاور تخت آسماں پر جلوہ افروز ہو کر فضا کو زرین اور کائنات کو منور بنا دے، یہ وقت خصوصیت کے ساتھ ایسا وقت ہے کہ دنیا کا ہر ذی حیات مسرور و بشاش ہے، سُبحان دنیا کی دعائیں آسمانوں سے ٹکرا رہی ہیں اور آسمان سے ہر سمت بارش نوارہی، ہر شخص خوشی خوشی مناظر قدرت کے اُس دلفریب تماشہ میں مصروف ہے جسے قدرت نے خاص اُسی کیلئے پیدا کیا ہے لیکن اس عالم انبساط میں اس دنیا سے مسرور ہیں ہم ایک شخص کو دیکھتے ہیں جو ایک درخت کے نیچے خاموش سر جھکائے اس طرح بیٹھا ہے کہ گویا اسکی نگاہیں ان مناظر قدرت سے بالکل ناآشنا ہیں اسکے کان طیور کی اُن خوش الحانیوں سے (جس سے لوگوں کو وجدانی کیفیت طاری ہو) ناشنوا ہیں۔ اگر کبھی اُسکی نگاہ کسی طرف کو اُٹھ جاتی ہے تو بجائے ذوقِ نظر کے آنکھوں سے بے اختیارانہ آنسو نکل پڑتے ہیں اور دل سے ایک بے پناہ آہ نکل جاتی ہے، لوگوں کی آنکھیں جو اُسکی صورت سے آشنا ہیں غور کے بعد بتاتی ہیں کہ یہ تو شیام ہے وہی شیام جسکے دل پر بیوفا تارا کا حسن حکومت کرتا ہے شیام جس جگہ بیٹھا ہے اُس کے قریب ہی ایک مندر ہے اور تارا روزانہ مراسم مذہبی ادا کرنے اس مندر میں آتی ہے، پورا ایک سال گزر چکا ہے کہ خانماں برباد شیام نے اس درخت کے سایہ کو اپنا دائمی مسکن سمجھ کر اِدھر اُدھر سے تھوڑا سا پتھر وغیرہ فراہم کر کے ایک مکانی خاکہ بھی بنا لیا ہے، اسکے اعزا اسکی خبر گیری رکھتے ہیں، اور ضروریات خورد و نوش سے غافل نہیں رہتے۔

شیام اپنے خاندان میں سب سے زیادہ وسیع اور بڑی جائداد کا مالک ہے۔ لیکن "تارا" کی محبت نے اُس امارت کو انتہائی غربت سے بدل دیا ہے اور اُسکو سوائے "تارا" کے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں ہے۔ وہ دن میں ایک دفعہ جب کہ "تارا" پوجا کے لئے مندر میں آتی ہے خوشی خوشی اُسکو دیکھ کر چوبیس گھنٹہ کے لئے کائنات کی ہر چیز سے بے نیاز ہو کر پھر اُسی وقت کے انتظار میں چشم براہ ہو جاتا ہے۔

تارا کی بے پروا زلفیں جو شانوں پر بکھری رہتی ہیں شیام کی آنکھوں میں ہر چیز تاریک کئے ہوئے ہیں

اسکے بے پروایانہ انداز شیام کو اور زیادہ گرویدہ بنائے ہوئے ہیں، اُس کا مینائے جسم جسمیں شراب ارغوانی کے صدہا قرابوں کا کیف ہے شیام کو مدہوش کئے ہوئے ہے

تارا کے دل میں بھی شیام کا خیال ضرور تھا لیکن دنیوی بدنامیاں اُسے مجبور کئے ہوئے تھیں کہ وہ اُسکی طرف توجہ نہ کرے، کبھی کبھی وہ شیام کو غلط انداز نگاہوں سے دیکھ لیتی تھی اور محبت کے اُس ناپیدا کنار سمندر کو جو اُسکے دل میں موجزن ہوتا تھا کوزۂ دل میں بند کرلیتی تھی ایک روز جب کہ تارا اپنے مراسم مذہبی سے فارغ ہوکر اپنی سہیلیوں کے ساتھ مندر سے باہر آئی تو شیام نے قریب آکر اُس کا دامن تھام لیا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا "تارا تم کو معلوم ہے کہ میں تمہاری محبت میں اپنی زندگی کس طریقہ پر برباد کر رہا ہوں کیا میں امید کروں کہ کبھی میری محبت کا کچھ نتیجہ نکلے گا۔؟

اس واقعہ سے تارا کے دل میں لرزہ پیدا ہوگیا اور اہمیت واقعہ نے اُسکے خیالات کو خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچادیا، تھوڑی دیر وہ اُس عالم میں رہی کہ گویا وہ دنیا میں ہی نہیں اُسکے بعد ادھر اُدھر گھبراکر دیکھا اور کہا کہ شیام تمہاری اُلفت کے نقوش میرے دل پر جم چکے ہیں لیکن خدا کے لئے اب کبھی ایسی جرأت کرکے اپنی اور میری جان کو ہلاکت میں نہ ڈالنا۔

اس بات نے شیام کے دل پر کچھ ایسی کیفیت طاری کردی کہ وہ کچھ اور نہ کہہ سکا، اور نہ اُسے یہ خبر ہوئی کہ تارا کب اور کدھر چلی گئی، تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر لوگوں کی زبان پر تھی، اور تارا کا باپ جو اس شہر کا حاکم تھا شیام کا درپئے قتل!

اس خبر کی شہرت اور حاکم وقت کے ارادہ نے تارا کے دل میں ایک قیامت خیز تلاطم پیدا کردیا اور عقل و حواس نے دماغ کو خیرباد کہدیا۔ بہت دیر تک وہ اپنے دل ہی دل میں فیصلہ کرتی رہی کہ اُسے کیا کرنا چاہئے، آخر کار سچی محبت کے اثرات جذبات کامل بن گئے اور تارا نے فیصلہ کرلیا کہ خواہ اس ارادہ میں اُسکی جان ہی کیوں نہ جاتی رہے مگر وہ شیام کو ضرور بچائیگی، غرض کہ خدا خدا کرکے تارا نے دن گزارا، اور جب وہ وقت آیا کہ لیلیٰ شب نے اپنے آپ کو سیاہ پردوں میں چھپایا، تارا نے بھی اپنا زریں جوڑا اُتار کر اپنے آپ کو سیاہ پوشاک سے آراستہ کیا۔

آدھی رات کا وقت ہے اور یہ مخمور محبت اپنے آپ کو پاسبانوں کی نگاہوں سے بچاتی ہوئی اُس اندھیری اور بھیانک رات میں منزل مقصود کی جستجو میں گامزن ہے۔ جلاد ملازم شاہی کی فکر اور کسی خاص

موقع کے انتظار میں ہیں، اور تارا ایک بے گناہ کو بچانے کی خیال میں ہیں - غرض کہ بہزار دشواری وہ شیدائے محبت، منزل مراد پر پہونچی۔

شیام نے تارا کو دیکھتے ہی اُٹھ کر متوحشانہ طریقہ پر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور محو حیرت ہو کر کہا کہ کیا جو کچھ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں وہ صحیح ہے، کیا واقعی تم "تارا ہو،" تارا کے دل کو باوجودیکہ ہر طرف سے رنج وغم گھیرے ہوئے تھا لیکن وہ مسکرا اُٹھی اور کہا کہ ہاں جو کچھ تم دیکھ رہے ہو اور خیال کر رہے ہو وہ صحیح ہے

- پھر اس وقت تمہارے آنے کا سبب ؟

- ایک خاص ضرورت -

- کہو کہو تارا جلد کہو -

- پہلے تم اپنے آپ کو سنبھالو - سکون واطمینان سے بیٹھو اُس وقت کہونگی -

- میں بالکل مطمئن ہوں -

- اپنے خیال میں، ابھی تو میں ہرگز تمہاری حالت اس قابل نہیں پاتی کہ تم کسی معاملہ میں صائب رائے قائم کر سکو -

شیام کچھ دیر تک اُس عالم استعجاب میں جو ایسے اچانک واقعہ سے ظہور پذیر ہوا کرتا ہے رہا - اس کے بعد رفتہ رفتہ نبض کی سرعت اور قلب کی تیز رفتاری میں اعتدال پیدا ہو گیا، اب جب کہ تارا نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا کہ شیام پر وہ پُر کیف غلبہ جسنے اس کو عقل و ہوش سے بالکل بیگانہ کر دیا تھا، نہیں رہا، اسوقت کہا:-

شیام! تم کو معلوم ہے کہ کل کا واقعہ واقعۂ قیامت ہو گیا، لوگ مجھے بدنام کر رہے ہیں، اور میرا باپ تمہارے قتل کا انتظام کر چکا ہے، قاتل تمہاری فکر میں لگے ہیں، اس وقت میں خاص اسی لئے آئی ہوں کہ تمکو آگاہ کر دوں اور فوراً اس شہر سے چلے جانے کی فہمائش کروں، خدا کے لئے جلد اپنی جان بچاؤ -

- "تارا مجھے ذرا اسکی پروا نہیں ہے، تمہاری محبت پر میری ایک جان نہیں بلکہ ہزار جانیں قربان ہیں - مجھ سے یہ کبھی نہ ہو گا کہ تم کو چھوڑ کر کہیں جاؤں" تارا بہت دیر اپنے خیال کے پورا ہونے کی ناکام کوشش کر کے شیام سے رخصت ہوئی اور اُسکے بچانے کی تدابیر میں مصروف ہو گئی -

پچھلی رات ہے، بیکس تارا اپنے آتشیں بستر پر کرب کی کروٹیں بدل رہی ہے، تکلیف سفر نے پاؤں میں چھالے ڈالدیے ہیں، جوشش گریہ نے آنکھیں سُجا دیں، گریباں سحر تارا کے غم والم میں چاک ہونیکو ہے

ہرچند تارا اپنے آپ کو سنبھالنے اور اخفاءراز کی کوشش کرتی ہے، مگر اسکا جی بھر آتا ہے اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہ رہے ہیں، جوشش گریہ نے طوفان اٹھا رکھا ہے، یہاں تک کہ صبح ہوئی اور تارا کی ماں نے اپنی بیٹی کا کچھ ایسا ابتر حال پایا کہ دیوانہ وار پوچھنے لگی، تارا خیر تو ہے تو کیسی ہے اس لفظ نے دُکھے دل کو اور دُکھایا اور کلیجہ خون ہو کر آنکھوں کے رستہ سے بہنے لگا۔

محل میں کُہرام مچگیا، اور تارا کا باپ جسونت سنگھ مضطربانہ حرم خانہ میں داخل ہوا۔

باپ کو دیکھ کر تارا نے ضبط درد کی ناکام کوشش کی، جسونت سنگھ فوراً ضروری تدابیر عمل میں لایا اور تارا کی حالت پہ غور کرنے لگا۔

محبت کا چھپانا کوشش ناکام ہے اسلئے کہ کائنات کا ایک ایک ذرہ اہل اُلفت کا دشمن ہے، جسونت سنگھ کو محل میں آئے ہوئے ابھی تھوڑا ہی وقفہ ہوا تھا کہ شاہی چوبدار حاضر ہو کر آداب خدمت بجالایا اور عرض کیا کہ ایک شخص دردولت پر حاضر ہے اور کہتا ہے کہ مجھے مہاراج سے کوئی خاص اور پوشیدہ بات کہنا ہے اسلئے جلد مہاراج کو میری اطلاع کر دی جاے۔ یہ سُنتے ہی جسونت سنگھ کے چہرہ پر ایک غیر معمولی مسرت کے آثار ظاہر ہونے لگے اور اُس نے یقین کر لیا کہ شیام قتل کر دیا گیا وہ خوشی خوشی باہر آیا اور آنے والے شخص سے پوچھا۔ کیوں کیا کہنا چاہتا ہے، کیا جس کام کیلئے مین نے تم لوگوں کو مقرر کیا تھا وہ پورا ہو گیا۔

یہ سُنکر اُس شخص کے چہرہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں اور باوجودیکہ اُسنے کچھ کہنے کی بہت کوشش کی مگر سوا اسکے کہ مجھے حضور سے تنہائی میں عرض کرنا ہے کچھ نہ کہہ سکا۔

جسونت سنگھ اُسکے ہمراہ آیا اور حسب دستور استصواب حال کیا، جاسوس نے اپنا چشم دید واقعہ یعنی تارا کا شیام کے پاس جانا بے کم وکاست کہہ دیا، اسوقت جسونت کے غیظ وغضب کی کوئی انتہا نہ تھی اُسنے بے تابانہ تلوار کے قبضہ پر ہاتھ ڈالا اور کہا کہ اگر آج ہی شیام اور تارا دونوں کا فیصلہ نہ کیا تو میں سمجھ لوں گا کہ میرے جسم میں شریف خون نہیں ہے" یہ کہکر وہ محل میں گیا اور تارا کی ماں کو بلا کر تمام واقعہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگر بیٹی کی سفارش میں ایک لفظ زبان پر آئے گا تو تمہارا ابھی وہی حشر ہوگا جو شیام اور تارا کا ہونے والا ہے، غرض کہ جسونت سنگھ بہت دیر تک محل میں مضطربانہ ٹہلتا رہا اور جب وہ وقت آیا کہ سورج نے اپنے منہ پر نقاب ڈال کر کائنات میں تاریکی پھیلا دی اس وقت یہ اپنے ارادہ کو

پورا کرنے کیلئے پہلے شیام کی جستجو میں چل دیا۔ اس کے جانیکے بعد ایک خادمہ نے جسکے کانوں تک یہ معاملات پہونچ چکے تھے، تارا کو خبردار کرکے اُس بیکس کو دیوانہ بنا دیا۔

دنیا میں جسقدر محبت ماں کو اولاد کیساتھ ہوتی ہے اُسکی مثال زمانہ (۴) مشکل ہی سے پیدا کرتا ہے۔ تارا کی ماں کچھ دیر تک حیران و پریشان تارا کے بچانے کی فکر کرتی رہی اور آخرکار سوائے اس تدبیر کے کوئی اور بات ذہن میں نہ آئی کہ تارا کو کہیں چھپا دے اور خود اُسکے بستر پر پڑکر نذر شمشیر اجل ہوجائے، چنانچہ اُسنے ایسا ہی کیا۔

تارا جو اپنی ماں کے اس ارادہ سے بالکل بے خبر تھی جب ایک تنہا مکان میں پہونچی تو اُسنے فوراً ہی اپنا لباس مردانی وضع سے تبدیل کیا اور جلد اس ارادہ سے روانہ ہوئی کہ جسونت سنگھ کے پہونچنے سے پہلے شیام کو کہیں پوشیدہ کردے۔ رات زیادہ گزر چکی ہے اور ان تمام حالات سے ناواقف شیام تارا کی خلاف امید مہربانی کی مسرت میں مسرور بیٹھا ہے اور غم نصیب تارا اس بھیانک تاریکی کا نقاب اپنے چہرے پر ڈالے ہوے جلد جلد اپنے حبیب کے بچانے کی فکر میں جارہی ہے شیام کے پاس پہونچکر ہرچند تارا نے کوشش کی کہ شیام کچھ روز کو ترک سکونت کرکے کہیں چلے جانے پر آمادہ ہوجائے لیکن سوائے ناکامی کے اور کچھ نہ ہوا۔ اب تارا کو یقین کامل ہوگیا کہ بنصیب دشمناں آج شیام کی جان بچنا ناممکن ہے، یہ سوچکر اُس پیکر مہر و وفا نے شیام کو اس امر پر آمادہ کیا کہ اچھا میں بھی تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں اسلئے تم جلد جاؤ اور دریا سے پار اترنے کے لئے فوراً ایک کشتی کا انتظام کرو، وہ جانتی تھی کہ دریا کا کنارہ یہاں سے اتنی دور ہے کہ وہاں تک پہونچنے اور کشتی کا انتظام کرکے واپس آنے میں شیام کو کم ازکم ۳ گھنٹے چاہئیں۔ اسے اس کا بھی قطعی یقین تھا کہ شیام حدود سلطنت جسونت کے اندر زندہ نہیں رہ سکتا۔ بہرحال تارا جو تھوڑی دیر کیلئے شیام کو اُسکے مکان سے علٰحدہ کرنا چاہتی تھی اپنی کوشش میں کامیاب ہوگئی، شیام خوشی خوشی اپنی دائمی آسودگی کی خاطر کشتی کی فکر میں روانہ ہوا، اور تارا اپنا منھ لپیٹ کر پڑ گئی، چونکہ یہ مردانے لباس میں تھی اور یہ یقین کرچکی تھی کہ جسونت ضرور دھوکا کھائیگا اور اپنی تلوار کو شیام کے عوض میرے خون سے بھرے گا۔ تارا لیٹی ہی تھی کہ جسونت پہونچا اور اپنے خیال میں شیام کو سوتا دیکھکر بہت مسرور ہوا اسکے چہرہ پر بشاشت و شادمانی کی سرخی پھیل گئی اور دست تظلم نے قبضہ شمشیر مضبوط پکڑلیا۔ جسونت بڑھا اور اس مہجور کے دو ٹکڑے کردیے۔ اس ظلم کے بعد جسونت نے اپنے گھر کا راستہ لیا اور تارا کی خوابگاہ میں پہونچکر تارا کے عوض اپنی رفیق زندگی کو ختم کردیا۔

یہاں شیام دریائے مسرت میں ڈوبا ہوا کشتی کا انتظام کرکے واپس آیا اور اپنے گھر میں یہ قیامت خیز منظر دیکھکر تارا کی لاش پر گر پڑا اور داعیٔ اجل کو لبیک کہتا ہوا دائمی صدمات سے آزاد ہوگیا۔

وہاں صبح کو جسونت نے اپنے محل میں یہ محشر خیز نظارہ کیا اور دنیوی بدنامیوں سے آسودہ رہنے کیلئے اپنے سینہ میں خنجر مار لیا۔

ایڈیٹر

دنیائے اسلام

اور

(چھٹی صدی عیسوی کے مسلمان)

فتح بابلن | بارہ سو اسی ۱۲۸۰ سال گزرے کہ اسلامی فتوحات کی لہر ملک مصر کی طرف بڑھی، یہ وہ زمانہ ہے کہ ابھی طفلِ مشرق نے مدعی تہذیب دوراں یعنی معلم مغرب کے حلقۂ درس میں زانوئے شاگردی تہ نہیں کیا تھا، اس حملہ آور عساکر اسلامی کا سپہ سالار اعظم عربی اُمّی نبی کے صحابی حضرت عمرو ابن العاص تھے۔ جنھیں صرف اپنے پیر طریقت کے پڑھائے ہوئے سبق یاد تھے۔

اس لشکر نے ۲۰ھ میں بابلن کے مضبوط قلعہ کا محاصرہ کیا۔

بقول عیسائی مورخین قلعہ نہایت مضبوط، اور حملہ آور عرب فن محاصرہ سے قطعی نابلد، اس پر بھی گورنر شہر نے ازراہ "تہذیب" لڑائی کی نسبت صلح کو زیادہ پسند کیا اور گفتگوئے صلح کے لئے شہر کا ایک معزز وفد اسلامی کیمپ میں بھیجا۔

رومی وفد صلح | اس حامل امن وفد کا عزت سے خیر مقدم کیا گیا، ممبران وفد کے دوستانہ مشورے کو جو نہایت دل سوزی سے پیش کیا گیا تھا۔ غور سے سُنا گیا۔

"تم اور تمہاری فوج نے ہمارے ملک پر چڑھائی کی ہے، اور تمہارے ارادوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگ بے لڑے نہیں ٹلو گے۔ اس میں شک نہیں کہ تم لوگ مدت سے ہمارے ملک میں ڈیرے ڈالے پڑے ہو۔ اب جب کہ دریائے نیل کے سیلاب نے تم کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے، تم ہمارے ملک میں قید پڑے ہو۔ اس پر طرہ یہ کہ رومی شمار میں تم سے بہت سے بہت زیادہ۔ اور سامان حرب میں تم سے کہیں اعلیٰ ہیں، تمہارے لئے سلامتی اسی میں ہے کہ تم اپنے قاصد ہمارے گورنر کے پاس درخواست صلح کے لئے بھیجو، ورنہ رومی فوج تم کو کچل کے رکھ دیگی، تمہارے لئے یہ موقع غنیمت ہے ورنہ پچھتاؤگے"

اس نیک مشورے کا کوئی جواب نہ دیا گیا، البتہ سفیروں کو ٹھیرائے رکھا، اور ان کو لشکرگاہ میں کھلے بندوں پھرنے کی اجازت دے دی کہ جو چاہیں دیکھ بھال کریں۔

دو دن کے بعد ان کو رخصت کیا گیا۔ اور ان کی تمام فصیح و بلیغ تقریر کے جواب میں یہ مختصراً جواب دیا گیا
(۱) قبولِ اسلام۔ اخوت و مساوات۔ (۲) اداے جزیہ۔ جسکے معاوضہ میں جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری (۳) جنگ۔

سفیروں کی واپسی پر گورنر کو اطمینان ہوا جتنے دن سفیر اسلامی لشکر میں ٹھہرے رہے، گورنر بے چین ہو بار بار پوچھتا تھا کہ "وحشی مسلمانوں کے ہاں قاصدوں کا قتل جائز تو نہیں ہے؟"

سفیروں نے اگر شرائط صلح بیان کرنے کے بعد اپنے چشم دید حالات بیان کئے "ہم ایک ایسی قوم کو دیکھکر آئے ہیں جو موت کو زندگی پر اور خاکساری کو تکبر پر ترجیح دیتی ہے، وہ لوگ زمین پر بیٹھتے اور گھوڑوں کی پیٹھ پر کھانا کھاتے ہیں، ان کا حاکم ان ہی جیسا ایک فرد ہے، اُن میں جاہ و منزلت کی تمیز نہیں اُنھوں نے عبادت کے اوقات مقرر کر رکھے ہیں۔ عبادت سے پہلے وہ ہاتھ مُنھ اور پاؤں دھو لیتے ہیں، اور بڑے انہماک سے عبادت کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی پیش کردہ تین شرائط اگرچہ کرخت تھیں۔ مگر گورنر نے بالآخر اس موقع کو صلح کی گفتگو کے لئے موزوں سمجھا، کیونکہ مسلمانوں کا لشکر دریائے نیل کے سیلاب کے باعث پانی میں گھرا پڑا تھا۔" ان کی اس موسمی مجبوریوں سے رومیوں کو امید تھی کہ مسلمان بہت آسان شرائط پر صلح کر لیں گے، لہذا گورنر نے سپہ سالار عساکر اسلامی کو پیغام بھیجا کہ "شرائط صلح طے کرنے کے لئے ایسے بااختیار اشخاص بھیجے جائیں جنکو عہدنامہ کی تکمیل کے پورے اختیارات ہوں۔

اسلامی سفارت امیر عمر ابن العاص نے لشکر میں سے ۱۰ آدمی منتخب کر کے سفارت پر روانہ کئے۔ اس سفارت کا سردار ایک قوی ہیکل، طاقتور، سیاہ فام۔ عبادہ ابن الصامت تھا۔ عرب کے ریگستان کے رہنے والوں کی یہ سفارت دریا کو عبور کر کے دربار مقوقس میں پہنچی۔ لیکن رومی گورنر عبادہ کو دیکھتے ہی چلایا کہ اس کالے دیو کو تو باہر نکالدو۔ میں کالے آدمی سے صلح کی گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن سفارت کے دوسرے ممبروں نے جب بیان کیا کہ "ہمارے درمیان عبادہ نہایت معتبر اور باوثوق شخص ہے۔ اور عمر ابن العاص نے خاص طور سے اسے ہمارا سردار مقرر کر کے صلح کی شرائط طے کرنے کے لئے بھیجا ہے" مقدس لاٹ پادری کے تعجب کی انتہا نہ رہی، جب اسکو بتایا گیا کہ "مسلمان کالے اور گورے کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتے ہیں

ان کے نزدیک آدمی کی وقعت کا معیار اسکی چمڑے کی رنگت نہیں بلکہ اسکے افعال و کردار ہیں۔

عبادہ سے بمنت کہا گیا کہ نرم لہجے میں گفتگو کرے تاکہ وہ "تہذیب" کا پُتلہ نازک اندام گورنر ڈر نہ جائے۔

عبادہ "ہمارے لشکر میں ایک ہزار سیاہ فام اور بھی ہیں، وہ مجھ جیسے ہی کالے ہیں ہم میں سے ایک ایک کالا سو سو گورے رومیوں کے ساتھ نبرد آزمائی کے لئے تیار ہے، ہم تو اس امید پر جیتے ہیں کہ خدا کی راہ میں مریں۔ ہم دنیوی زر و مال میں سے توت لایموت اور ستر ڈھانپنے کے قابل کپڑے سے کچھ زیادہ نہیں چاہتے، ہماری نظروں میں اس دار فانی کی کوئی وقعت نہیں، ہم عاقبت کے متلاشی ہیں۔

رومی گورنر پر اس بے باکانہ گفتگو کا بہت اثر ہوا۔ اس نے اپنے اراکین کو مخاطب کرکے کہا "سنتے ہو یہ کیا کہتے ہیں؟ عجب نہیں کہ خدا نے ان لوگوں کو دنیا کی اصلاح کے لئے بھیجا ہو" پھر عبادہ کیطرف مخاطب ہوکر کہا "جناب من! میں نے آپ کی تقریر کو سُنا جو کچھ آپ نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے متعلق بیان کیا ہے۔ اس سے میں یہ نتیجہ نکال سکتا ہوں کہ ان ہی کرتوتوں کے طفیل آپ ہر جگہ آج تک کامیاب ہوئے ہیں۔ میں یہ بھی ماننے پر مجبور ہوں کہ برخلاف اسکے رومی دنیا کے مال و جاہ پر مٹے ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ذلیل ہو رہے ہیں۔

لیکن ساتھ ہی اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آپ لوگوں کے مقابلہ میں رومی ایک ایسی فوج میدان جنگ میں لانے کے قابل ہیں، جو تعداد میں آپ لوگوں سے بہت زیادہ اور آلات حرب میں نہایت بہتر ہوگی۔ ایسی زبردست فوجی طاقت کا مقابلہ کرنا آپ کے بل بوتے سے باہر ہے۔ لیکن چونکہ ہمارا نصب العین صلح و آشتی ہے، اسلئے ہم رضامند ہیں کہ آپ کے ہر لشکری کو فی کس دو دینار۔ سردار فوج کو یکصد دینار۔ اور آپ کے خلیفہ کے لئے ایک ہزار دینار دے دیں۔ بشرطیکہ آپ اپنے وطن کو واپس تشریف لے جائیں"۔

عبادہ "کسی غلط فہمی میں نہ رہنا، ہم کثرت تعداد سے بالکل نہیں ڈرتے ہماری تو بڑی خواہش یہ ہے کہ رومیوں سے برسر میدان دو دو ہاتھ ہو جائیں اگر ہم غالب آئے تو بہتر، اور اگر مارے گئے تو جنت۔

ہماری دُعا یہ ہے کہ خدا ہمیں درجۂ شہادت دے، ہم یہ نہیں چاہتے کہ زندہ سلامت اپنی بیوی اور اپنے بچوں کے پاس واپس جائیں۔

ہماری قلتِ تعداد ہمیں ذرا بھی ہراساں نہیں کرتی، ہمارے قرآن میں لکھا ہے "خدا کی مدد سے بار ہا تھوڑے بہتوں پر غالب آئے ہیں"۔

یہ سمجھ رکھو کہ ان تین شرطوں کے سوا ہمارے پاس تمہارے لئے کوئی چوتھی شرط نہیں، رومی گورنر نے بہتیرا نشیب و فراز سمجھایا، ہزار کوشش کی کہ شرائط کچھ نرم ہوں، مگر اُسکی ساری فصاحت اور ڈپلومیسی ان اکھڑ مزاج سفیروں کو نرم نہ کر سکی، جب گفتگو نے بہت طول کھینچا اور عبادہ تنگ آ گئے، تو دونوں ہاتھوں کو اوپر اُٹھا کر پکارے "رب کعبہ ہمارے پاس یہی تین شرطیں ہیں، ان ہی میں سے کوئی ایک پسند کر لو"۔

اسکے بعد گورنر نے اپنے مشیروں کے ساتھ مشورت کی۔ پہلی شرط (قبول اسلام) کے متعلق تو سب نے متفقہ طور سے کہا کہ ہم مذہب عیسوی کو ایسے مذہب سے تبدیل کرنے کے لئے تیار نہیں جسکے متعلق ہم کو کوئی واقفیت ہی نہیں۔ دوسری شرط قبول جزیہ "گویا غلامی کی ذلیل زندگی اختیار کرنا ہے، اس سے تو موت بہتر" لیکن عبادہ نے ان کو سمجھایا کہ "جزیہ دینے سے تم لوگ ہماری حفاظت میں آ جاؤگے، ہم تمہارے مال و جان کی محافظ ہو جائیں گے، تم اپنی املاک پر اسیطرح تمام حقوق کے ساتھ قابض رہوگے، تمہارے قواعد وراثت بھی یہی رہیں گے۔ تمہارے گرجاؤں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، تمہارے مذہب میں دست اندازی نہیں کی جائے گی" عبادہ کی اس تقریر سے لوگ صلح پر آمادہ ہو گئے، اُنھوں نے مزید غور کے لئے ایک مہینہ کی مہلت طلب کی۔ مگر حضرت امیر عمرابن العاص نے صرف ۴ دن کی مہلت منظور کی۔

عہدنامۂ صلح اکتوبر ۶۴۱ء کو عہدنامہ تحریر ہوا جسکی رو سے رومیوں نے بہ ادائے جزیہ مسلمانوں سے صلح کر لی، عہدنامہ پر بادشاہ ہرقل کے دستخط کرانے کے لئے گورنر سکندریہ خود قسطنطنیہ گیا لیکن ہرقل نے اپنے گورنر کی کارروائی کو ناپسند کیا۔ اور گورنر پر ناراض ہوا کہ "ایک لاکھ آدمی بارہ ہزار عربوں کا مقابلہ نہ کر سکے؟ اور ایسی ذلیل کن شرائط پر صلح کی"، اسی ناراضگی میں بادشاہ نے گورنر کو دربار سے نکلوا دیا۔

حالت جنگ و محاصرہ جب گورنر کے تحریر کردہ عہدنامہ کا یہ حشر ہوا تو دونوں فریق لڑائی پر تُل گئے، رومی قلعہ بند ہو کر لڑتے تھے اور مسلمان محاصرہ کئے ہوئے تھے۔

تاریخ کہتی ہے اور ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ عرب محاصرہ کے دھنی نہ تھے، مصر کے جن شہروں کو ایرانیوں نے دنوں کے محاصرے میں فتح کر لیا ان پر عربوں کے مہینے خرچ ہو گئے، عرب تو مرد میدان تھے، کھلے میدان میں دست بدست

لڑائی میں ان کی خوب بن آئی تھی مگر محاصرہ ڈال کر محصورین پر آب و دانہ بند کردینا، ہرطرح کی آمدورفت مسدود کردینا، یہاں تک کہ محصورین فاقہ سے مجبور ہو کر اطاعت قبول کرلیں، یہ عربوں سے نہیں ہوسکتا تھا، چنانچہ خلیفہ سوم کے عہد میں جب مصر کے لوگوں نے بلوہ کرکے حضرت عثمان بن عفان کا گھر گھیر لیا اور ان کا پانی بند کردیا تو عرب اس سختی کو برداشت نہ کرسکے اور انہوں نے احتجاجاً کہا کہ "یہ حرکت تو ہم نے کبھی کافر محصورین کے ساتھ بھی روا نہیں رکھی" اور حضرت علی ابن ابی طالبؓ نے خود حضرت عثمانؓ کو پانی پہنچایا۔

عربوں کی نماز | قلعہ کی ڈھیلی ناکہ بندی کا یہ حال تھا کہ رومی سپاہیوں کا ایک دستہ ایک دن قلعہ سے نکل کر مسلمانوں کے کیمپ کے اس حصے پر جا پڑا جس پر زبیر و عبادہ متعین تھے، مسلمان نماز میں مشغول تھے کہ رومیوں نے قتل کرنا شروع کردیا، زبیر و عبادہ نماز چھوڑ، گھوڑوں کی پشت پر ہو لئے، اور حملہ آوروں پر جھپٹے، رومی یہ دیکھ کر واپس پلٹے۔ زبیر و عبادہ نے تعاقب کیا، جب "باقاعدہ" بھاگتے ہوئے رومیوں نے دیکھا کہ عربی صبا رفتار گھوڑے ان کے سر پر آپہنچے ہیں تو تعاقب کرنے والوں کی توجہ کو دوسری طرف ہٹانے کے لئے رومیوں نے اپنے قیمتی زیورات اُتار اُتار کر پھینکنے شروع کئے۔ مگر زبیر و عبادہ زیور نہیں پہنا کرتے تھے، انہوں نے زیورات کی نسبت رومی شجاعوں کو زیادہ قابل توجہ سمجھا۔

کچھ سوار تو انہوں نے گرالئے، مگر چونکہ قلعہ کے قریب پہنچ چکے تھے، باقی جو بچے تھے وہ قلعہ میں داخل ہوگئے۔ زبیر و عبادہ گھوڑے کی باگیں پھیر کیمپ کو واپس ہوئے، اور راہ میں گرے ہوئے رومی زیورات کو نظرِ حقارت سے دیکھتے ہوئے اپنے مقام پر پہنچ کر تکمیل نماز میں مشغول ہوگئے۔ رومیوں نے جب دیکھا کہ اب میدان خالی ہے تو قلعہ سے نکلے اور اپنے زیورات اٹھا کر لے گئے۔

قلعہ کی فتح | قلعہ کا محاصرہ کئے کم و بیش چھ مہینے گذر گئے۔ نہ قلعہ والوں کی مراد پوری ہوتی تھی کہ عرب محاصرے سے اکتا کر واپس چلے جائیں۔ نہ عربوں کی خواہش پوری ہوتی تھی کہ قلعے والے کھلے میدان میں نکل کر عربی تلواروں اور نیزوں کو کھلے بندوں ارمان نکالنے کا موقع دیں، آخر عرب ہی اس لمبی انتظار سے گھبرائے۔ اور چپ چاپ پڑے رہنے سے اکتائے۔ قلعہ کی فصیل کے ایک مناسب مقام پر سیڑھیاں لگا کر عرب کا شجاع زبیر دانتوں میں تلوار دبا کر فصیل پر چڑھ گیا اور وہاں کے محافظین کو مار گرایا۔ ساتھ ہی عرب کے تیر اندازوں نے نیچے سے تیروں کی وہ بوچھار کی کہ پتھروں کی پناہ میں حریفوں کو سر چھپانا مشکل ہوا، کئی سپاہی فصیل پر چڑھ گئے، قریب تھا کہ زبیر اور اُسکے ساتھی تلوار کی نوک سے قلعہ کا دروازہ اسلامی فوج کے لئے کھول دیتے کہ رومیوں نے خود ہی دروازے

کھول دیئے اور امان کے طلبگار ہوئے۔

امیر لشکر عمرو ابن العاص نے باوجود زبیر کے دعویٰ "فتح بشمشیر" اہلِ شہر کو جان و مال کی اماں دی اور ان شرائط پر قلعہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔

شرائط | (۱) دو دن کے عرصہ میں فوجی آبادی قلعہ خالی کردے۔

(۲) جو لوگ جانا چاہیں وہ بذریعہ دریا قلعہ چھوڑ کر چلے جائیں۔

(۳) تمام شاہی خزانہ و قلعہ کا میگزین فاتحوں کے حوالہ کیا جاوے۔

(۴) شہر علاقہ مفتوحہ قرار پاوے۔

عیسائیوں کا عیسائیوں سے مہذبانہ برتاؤ | ناظرین کو تعجب ہوگا کہ دلاور رومی فوج نے عربوں کی مزاحمت میں پورا زور کیوں نہ صرف کیا واقعی رومیوں نے حملہ کرنے وقت جیسا کہ چاہیئے تھا عربوں کا مقابلہ نہیں کیا اسکی یہ وجہ ہے ان کو فرصت کم تھی، وہ اسوقت مدافعت سے زیادہ اہم کام میں مشغول تھے جسکی تفصیل یہ ہے کہ شہر میں عیسائیوں کے دو فرقے ہو گئے تھے، رومی اور قبطی، ان دونوں فرقوں میں چند فروعات کا مذہبی اختلاف تھا، رومی فرقہ چونکہ حکمراں تھا اس لئے زبردست تھا انہوں نے ان قبطیوں کو جو ان سے اختلاف عقائد رکھتے تھے ذلیل کر رکھا تھا، اور ایک بہت بڑی تعداد کو قیدخانے میں ڈال رکھا تھا، عربوں کے حملے کے وقت جب رومیوں نے لڑائی کا رنگ پلٹتے دیکھا تو انہیں یہ اندیشہ ہوا کہ ہونے والے حکمراں کے "غیر مہذب" قوانین کے ماتحت قبطیوں اور رومیوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاوے گا تو انہوں نے ازراہ "تہذیب" مسلمانوں کے "غیر مہذب" مساوات کے اصول کے اثر سے قبطیوں کو اس طرح بچایا کہ انکو قید خانے سے نکال کر ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے۔ ان کی ناک کے نتھنے پھاڑے۔ غرض ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جس کا بیان ایک عیسائی مورخ (جو پادری بھی تھا) ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"مسیح کے ان دشمن رومی عیسائیوں" نے اپنے گندہ ایمان سے گرجے کو ناپاک کیا انہوں نے بے ایمانی اور ظلم وستم کے وہ کام کئے ہیں جو آج تک کسی لامذہب اور بُت پرست کافر سے بھی بن نہ آئے تھے۔ انہوں نے مسیح اور اسکے ماننے والوں کی بے عزتی کی جو کسی نے نہ کی ہوگی ہمنے تو ایسے بدکردار کاذب بُت پرستوں میں بھی نہیں دیکھے سُنے۔

(ترجمہ)

برکت علی

کلامِ شہید

حضرت شہید مرحوم کی ذات شعرائے بھوپال میں ایک ممتاز خصوصیت رکھتی ہے اور اہلِ بھوپال کو شہید پر افتخار تھا، مرحوم ٹونک کے رہنے والے اور تقریباً ۲۰ سال سے بھوپال میں مقیم تھے، مرحوم کے کلام کا لطف زبان و انداز بیان سامعہ کو بیچین کر دیتا ہے افسوس کہ موت کی چیرہ دستیوں نے ایک صاحب کمال کو ہمسے بہت جلد جدا کر دیا، مندرجۂ ذیل غزل مرحوم کے افکار نادرہ کا نمونہ ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے۔

(غزل)

اُلفت اِک ضدِ شکیبائی تھی، راز رکھنے میں بھی رسوائی تھی
تم تھے اور کوئی مکاں خاص نہ تھا ہم تھے اور بادیہ پیمائی تھی
تھا اُدھر حکمِ نگہباں کو کہ ہاں اور اِدھر ناصیہ فرسائی تھی
کوئی تو بات مرے قتل میں تھی ایک مخلوق تماشائی تھی
ضبطِ اظہارِ تمنا سے کھلا ہم میں بھی قوت گویائی تھی
حدِ امکاں سے ہم آگے جو بڑھے نہ خودی تھی نہ خود آرائی تھی

اے مسیحا نہ کیا تو نے شہید
یہ بھی اک طرزِ مسیحائی تھی

شہید مرحوم

صدق و مومن

کیا عشق سے باز آئیں گے ہم | اسکی تو قسم نہ کھائیں گے ہم
ہاں ضد پہ یہ کر دکھائیں گے ہم | آپ آور سے لو لگائیں گے ہم
جوں شمع بجھے جلائیں گے

پوچھیں گے نہ اب کہ کیوں خفا ہو | اچھا نہیں بولتے، نہ بولو
ہم بھی ہیں غیور یاد رکھو | دل دے کے اک اور لالہ رو کو
ہر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم

دل ہو گا جو زندگی سے عاری | بہلائیں گے کر کے آہ و زاری
چھوڑیں گے نہ پاس وضعداری | گر تیری طرف کو بیقراری
کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم

آنکھوں میں بھر آئیں گے جو آنسو | پی جائیں گے دیکھ کر ہر اک سو
بالفرض کسی دن اے جفا جو | گر دیکھ کے ہنس دیا ہمیں تو
مُنھ پھیر کے مُسکرائیں گے ہم

جو کچھ کہ بھی گذرے صدق دلپر | در سے تو اُٹھا ہی لیں گے بستر
تیری ہی قسم مگر ستمگر | "بُت خانۂ چیں سہی ترا گھر"
مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

صدق جائسی

مریم

لاک لیون کے صحن کے دروازہ پر والیہ لاک لیون جو پرنس جیمس کی ناجائز لڑکے نائب السلطنت 'مرے' کی ماں تھی اور بعد میں سر ولیم ڈوگلاس' والئی لاک لیون سے عقد کر لیا تھا، ایک خاص انداز تمکنت کے ساتھ نمودار ہوئی' یہ خاتون خیالات مذہبی کے اعتبار سے نہایت متعصب اور تنگ نظر ہی نہ تھی بلکہ اپنی اصلاح پذیرفتہ عقائد میں کلیسائے روم کی ان بدترین غلطیوں کا اعادہ بھی کرتی تھی جنکی رو سے انجیل مقدس سے مستفیض ہونے اور نجات حاصل کرنے کے صرف وہ لوگ مستحق سمجھے جاتے تھے جو اُسکے ہم عقیدہ تھے۔

بدنصیب ملکہ مریم، جو اس تُرش رو خاتون کی ناخواندہ مہمان یا بالفاظ دیگر اسیر تھی، ہر لحاظ سے اپنے میزبان کیلئے بار خاطر تھی' والیہ لاک لیون' مریم' سے کچھ تو اس وجہ سے متنفر تھی کہ مریم رئیسہ گائز کی بیٹی تھی لیکن زیادہ تر اس نفرت کی یہ وجہ تھی کہ مریم ایک ایسے مذہب کی پرستار تھی جو اس خاتون کے نزدیک بت پرستی سے بھی زیادہ مکروہ تھا۔

اس خاتون کے خط و خال گو سخت مگر خوبصورت تھے" اسوقت سیاہ مخمل کی ٹوپی اسکے زیب سر تھی (اور اس خدمتگار سے جو کشتی لیکر گیا تھا پوچھا) کہ لینڈ سے اور سر رابرٹ میلوائل کا کیا حشر ہوا، خدمت گار نے تمام گزشتہ واقعات کا اعادہ کیا، خاتون نے ایک حقارت آمیز تبسم کے ساتھ کہا" احمقوں کی خوشامد کرنا چاہیئے، نہ کہ اُن سی جنگ اچھا جاؤ کوئی بات بنا دینا اور کہدینا کہ لارڈ رتھ ون قلعہ میں داخل ہو چکے ہیں اور آپ کا بیچینی سے انتظار کر رہے ہیں۔

"اینڈل فوراً جاؤ۔ ہاں ذرا ٹھہرنا، یہ تم کس مسخرہ کو اپنے ساتھ لائے ہو۔

حضور یہ . . . . کا پیش خدمت ہے"

اچھا، یہ نیا خادم ہے، ایک خادمہ کل بھی آچکی ہے" مریم اور اُسکی ہمراہیوں کی موجودگی سے گو مکان کی حالت درست ہو جائے گی لیکن مجھے توی امید ہے کہ حکام بہت جلد کوئی دوسرا شخص اس خدمت کے اہتمام دینے کے لئے منتخب کریں گے۔" اچھا اینڈل جاؤ" رولینڈ گریم کی طرف مخاطب ہو کر" اور تم' میرے ساتھ آؤ۔ اسکے بعد وہ ایک انداز رعونت کے ساتھ آگے ہولی اور بہت جلد اوس باغیچہ تک جو ایک سنگین دیوار سے محصور تھا پہونچگئی یہ دیوار برجوں سے آراستہ تھی اور اسکی وسط میں ایک مصنوعی فوارہ نصب تھا۔ باغ کی بے کیف کیاریاں صحن قلعہ تک جہاں سے آمد و رفت کے لئے ایک محراب دار دروازہ مخصوص تھا پھیلی ہوئی تھیں، اس باغ کی محدود دباقاعدہ روشوں پر، ملکہ مریم اُن روح فرسا مصائب سے دوچار ہونے کی جنکے لئے قدرت نے تقریباً اُسکی تمام زندگی وقف

کردی تھی عادت ڈال رہی تھی اور اس تکلیف دہ شغل میں دو سہیلیاں اکثر شریک تھیں، لیکن رولینڈ پہلی ہی نظر میں تاڑ گیا کہ وہ شخصیت جو باعتبار حسن صورت وجاہت خاندانی اور فضائل ذاتی نیز بلحاظ شومیٔ قسمت ایک ممتاز حیثیت رکھتی تھی ناشاد ملکہ اسکاٹ لینڈ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

ہمارے تخیل پر اسکی شکل و شباہت کا ایسا گہرا نقش ہے کہ تقریباً تین سو سال کی طویل مدت کے بعد بھی معمولی سے معمولی شخص کے لئے اس بات کی ضرورت نہیں کہ ملکہ مذکور کے اُن مابہ الامتیاز خصوصیات خط و خال کی یاد دہانی کیجائے جنکو تخیلہ دفعتاً عظمت حسن اور ذکاوت کی تصویر کی شکل میں ہمارے سامنے لاکر کھڑی کرتی ہے اور ہم حیران رہجاتے ہیں کہ یہ نقش تخیل کوئی ملکہ ہے، یا مجسمۂ حسن، یا عورت۔

ایسا کون شخص ہے کہ مریم کا ذکر آتے ہی اسکی آنکھوں میں ملکہ موصوف کی تصویر اس خوبی و صفائی سے نہ پھر جاتی ہو جیسے کسی نوعمر کی آنکھوں میں اسکی محبوبہ کا فوٹو۔ وہ لوگ بھی جو ان تمام الزامات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں جو مریم کے دشمنوں نے اُسپر لگائے ہیں اسکی صورت دیکھنے کے وقت اظہار افسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کیونکہ اسکی تصویر سے خواہ کسی قسم کے جذبات نمایاں کیوں نہ ہوں لیکن ان بہتانات اور افعال قبیحہ کے اظہار میں جو مریم کے حیات ہی میں اُس سے منسوب کئے گئے تھے اور جو آجتک اسکی یاد کو اگر بالکل تاریک نہیں تو کم از کم دُھندلا ضرور کئے ہوئے ہیں بالکل ساکت نظر آتی ہے، وہ کشادہ پیشانی اور باقاعدہ ابرو جنکی خوشنمائی میں اُن حسین آنکھوں نے جن پر وہ سایہ فگن ہیں، اور جو سیکڑوں افسانوں کی حامل نظر آتی ہیں ایک گونہ اضافہ کردیا ہے، وہ ستواں ناک، وہ مناسب دہن جو گویا عمدہ اور موزوں الفاظ ہیں ادا کرنے کے لئے خلق کیا گیا تھا۔ وہ چاہِ زنخداں وہ صراحی دار گردن یہ تمام چیزیں ملکر ایک ایسی تصویر پیش کرتی ہیں جنکی نظیر اس اعلیٰ طبقہ میں بھی جسکے ہر ممبر کے ایک ایک فعل و حرکت کا دنیا نہایت غور و توجہ سے مطالعہ کرتی ہے، مشکل سے دستیاب ہوسکتی ہے۔ اس عجیب ہستی کی تصاویر کے متعلق یہ خیال کہ اُن میں اختلاف ہے بے فائدہ ہے کیونکہ ہر ایک تصویر میں ایسے خط و خال موجود ہیں جنکو آنکھ فوراً پہچان لیتی ہے کہ وہ اُسی ہستی کے لئے مخصوص ہیں جسکا نقش ہمارے تخیل پر اسکی سوانح کے مطالعہ اور اسکی تصاویر کے دیکھنے سے قائم ہوچکا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم خراب سے خراب تصویر کے متعلق بھی خواہ وہ باعتبار حسن کیسی ہی ناکمل کیوں نہ ہو۔

یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ مریم کی تصویر ہے۔ قوت حسن کی یہ کوئی معمولی مثال نہیں ہے کہ اس قدر طویل زمانے کے بعد اُس کا جمال صرف پسندیدگی کی نظر ہی سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ لوگوں کو حقیقی جذبات شجاعت سے معمور کردیتا ہے

اور ایسے سخت گیر اصحاب کے دلوں میں بھی جو بعد میں مریم کے چال چلن کے متعلق کوئی اچھی راے نہیں رکھتے تھے اُس جلاد کی طرح جسنے اپنا خوفناک فرض انجام دینے سے قبل اُن حسین ہاتھوں کو بوسہ دینے کی خواہش کی تھی، اُس کے دست بوسی کی تمنّا تھی۔

مریم اُن تمام محاسن ظاہری و باطنی کے ساتھ جنسے صحیح روایات نے ناظرین کو شناسا کردیا ہے گہرا سیاہ ماتمی لباس زیب تن کئے ہوے والیۂ لاک لیون کے استقبال کو جو اس وقت ایک مودبانہ بے تعلقی کے پردہ میں خوف و نفرت کے جذبات چھپانے کی کوشش کررہی تھی، آگے بڑھے، حقیقت یہ ہے کہ وہ اُس قسم کی طنزیہ گفتگو میں جس سے کہ عورتیں اپنے سخت سے سخت نقصانات کی کامیابی کے ساتھ تلافی کرسکتی ہیں متواتر ملکہ کی برتری کا اندازہ کرچکی تھیں، لیکن اسکے متعلق کوئی صحیح راے قائم نہیں کی جاسکتی کہ آیا یہ وصف بھی اسکے حال کیلئے اور دوسری خوبیوں کی طرح جو اس کو ودیعت کی گئی تھیں مفید تھا یا مضر کیونکہ گو اسکے ذریعہ سے مریم کو اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں ایک عارضی فتح ضرور حاصل ہوجاتی تھی لیکن اس سے اُسکے دشمنوں کے جذباتِ انتقام زیادہ مشتعل ہوجاتے تھے، اور اکثر ان طعن و تشنیع کا جسکی مریم یک گونہ عادی ہوگئی تھی سخت سے سخت مصائب و تکالیف سے انتقام لیا جاتا تھا۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اُسکی بے وقت موت کا خاص سبب وہ خط ہوا جو اُسنے ملکہ ایلزبتھ کو تحریر کیا تھا اور جسمیں اُسنے اپنے رقیب حاسد اور رئیسہ شروزبری کا نہایت بے دردی سے مضحکہ اُڑایا تھا۔

(باقی باقی)

کلامِ ذکی

دل نے پھنسایا بیٹھ کر محفل سوز و ساز میں
عشق دفا پسند میں حسن حفا طراز میں

خاص تجلیاں ملیں ہر رخِ دل نواز میں
دیکھ حقیقتِ نظر جلوہ گہ مجاز میں

جھک کے جہاں جبیں ملی عرش سے وہ زمیں ملی
اوجِ کمال ہے تو بس سجدۂ بے نیاز میں

دوست کی دل سے چاہ ہو اور وہ اپنی راہ ہو
قیس رہا حقیقتاً رہگذرِ مجاز میں

وہ بھی جو میرے پاس سے روتے ہوے چلے گئے
رنگ شکست آگیا ہمتِ چارہ ساز میں

شوق عروج ہے اگر خاک میں خاک ہوکے مل
ذوقِ وصال ہے اگر ناز نہ ہو نیاز میں

جلوۂ دوست گھر مرا نور سے دوست سر مرا
طاقتِ دم زدن نہیں قدرتِ کارساز میں

غیر کے عشق کی شراب شوق سے نوش جاں کرو
چھان تو لو مگر ذرا دامنِ امتیاز میں

جذبۂ ہی کی کھٹک ہے عشقِ بتاں کی جان کی رہی
ساعتِ جنتیں وصال ہیں یک بیان یہ راز میں

پامپیائی کا دورِ آخریں

(بہ سلسلہ گزشتہ)

باب ۲

گلاؤکس قسمت کا دھنی تھا، وہ خوبرو، توانا و تندرست، دولتمند اور سا تھ ہی سمجھدار تھا، گھر کا معزز دل کا جری، اور خیالات کا پاکیزہ تھا۔

اسی تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ ایک بھاری ترکہ ملا تھا اس طرح اسکی دیرینہ خواہش کہ وہ روما دیکھے پوری ہوئی تھی اور اب وہ اس عشرت آباد شہر میں دل کھول کر لطف اُٹھا رہا تھا۔

لیکن اس کا ہدفِ نظر بلند نہیں تھا، ایک ناتجربہ کار، امیر، بالیاقت، نوخیز جوان کو جس کا نہ کوئی رہبر ہو نہ کوئی منزلِ مقصود، جو کچھ ایسے آدمی کو ہونا چاہئیے ویسا ہی گلاؤکس تھا۔ روما میں اسکے مکان پر نکمے آدمیوں کا جمگھٹا رہتا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضرور تھا کہ صنعت و حرفت کے دلدادہ اسکے مکان کے ثناخواں بھی تھے اس عہد کے مشہور صناع اور مصوروں کی کاریگری سے اس کا مکان آراستہ تھا، پمپیائی میں اس کا مکان نہایت اعلیٰ پیمانہ پر نفیس دستکاری سے سجا ہوا تھا۔

چونکہ شاعری اور ڈراما سے اسے دلچسپی تھی اسلئے اسکے مکان کی دیواروں پر یونانی ڈرامے کے نظارے نقش تھے، اٹھارہ صدی بعد جب کھود کر یہ مکان بروئے زمین نکالا گیا تو جن لوگوں نے اُسے اس وقت دیکھا اُنھوں نے اس مکان کا "ڈراما پسند شاعر کا گھر" نام رکھا۔

گزشتہ باب میں بیان شدہ واقعات کے بعد گلاؤکس اس عشرت کدہ کو لوٹا۔ اور اسکے مہمان نہایت آراستہ پیراستہ کھانے کے کمرے میں جمع ہوے، اس کمرے کے سامنے چیدہ چیدہ پھولوں اور پودوں سے بھرا ہوا باغیچہ تھا۔

کمرے کا اسباب بہت قیمتی تھا، پالش شدہ میز پر چاندی کا کام بنا ہوا تھا۔ کانسے کی کوچ دبیز اور نرم زر دوز گدّوں سے منڈھے ہوئے تھے، اور ان پر گلاوکس اور اُسکے احباب متمکن تھے۔

غلام نفیس نفیس کھانوں سے بھرے ہوئے طباق لئے حاضر ہوئے۔ لذیذ انجیر برف میں لگے ہوئے، تازہ بڑی مچھلی، انڈے، شہد شراب وغیرہ میز پر چنے گئے۔ کمسن غلام ہاتھ دہلانے کے لئے چاندی کی سیلابچیوں میں معطر پانی اور ارغوانی جھالردار رومال ہر مہمان کے سامنے لے گئے، مہمان کُل پانچ تھے۔

مجسٹریٹ پانسا نے اپنا رومال نکالا جس کا کپڑا تو ایسا نفیس نہ تھا مگر جھالر دوگنی چوڑی تھی اُس نے اپنے اُس رومال سے اِس طرح ہاتھ پونچھے کہ گویا وہ حاضرین سے اپنے رومال کی خوبصورتی کیلئے داد کا خواہاں ہو۔

کلوڈیس۔ "تمہارا رومال بہت خوبصورت ہے، جھالر ایسی چوڑی ہے، جیسے کمربند"

مجسٹریٹ۔ معمولی سی چیز ہے، کہتے ہیں کہ آجکل روما میں اس کا ہی رواج ہو۔

گلاوکس نے عیش و عشرت کے دیوتا کے سامنے جسکا بت میز پر رکھا تھا۔ سر جھکا کر دُعا مانگی۔ "تیری برکتیں ہم پر نازل ہوں"۔ دوسرے مہمانوں نے بھی دُعا میں اسکی تقلید کی اور مروجہ دستور کے مطابق میز پر شراب کے چھینٹے دیکر کھانے پر ہاتھ بڑہائے۔

کلوڈیس نے مجسٹریٹ کو مخاطب کرکے پوچھا "اب جنگلی درندوں کی لڑائی کب ہو؟"

مجسٹریٹ۔ آیندہ چاند کے شروع میں۔ اس موقعہ کے لئے ہمارے پاس ایک خوبصورت جوان شیر ہے

کلوڈیس۔ لیکن اِسکے پھاڑنے کھانے کے لئے ہم آدمی کہاں سے لائیں گے، مجرم تو ہیں نہیں، کیا کسی ناکردہ گناہ شخص کو شیر کے سامنے ڈالنا پڑیگا۔

مجسٹریٹ۔ مجھے بھی کئی دن سے یہی تردد ہو۔ یہ کیسا اندھا قانون پاس ہوا ہے جسکی رو سے ہمکو اپنے غلام شیروں کے سامنے ڈالنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ یہ کہاں کی منصفی ہو کہ ہم اپنی چیز کے ساتھ بھی اپنی مرضی کے مطابق سلوک نہیں کرسکتے۔ غلاموں کے ساتھ یہ اوپری ہمدردی عام لوگوں کیلئے کس قدر دل شکنی کا باعث ہوئی ہے۔ آدمی اور شیر کی لڑائی کا تماشا لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔

کلوڈیس۔ لوگوں کے مردانہ کھیل میں دخل دینے سے بڑھ کر زیادہ بُرائی اور کیا ہوسکتی ہے؟

گلاؤکس - اس تماشہ کو پسند تو میں بھی کرتا ہوں مگر جب درندہ درندے کے مقابلے میں چھوڑا جائے لیکن جب ایک انسان جسکا گوشت پوست ہم جیسا ہی ہو، اکھاڑے میں شیر کے چیرنے پھاڑنے کے لئے ڈالدیا جاتا ہو، اُف! یہ نظارہ نہایت دہشت ناک ہو، میں تو یہ دیکھ کر کانپ اٹھتا ہوں۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اُس وقت میرا یہ جی چاہتا ہے کہ جا کے اس مظلوم کو بچالوں۔ شکر ہو کہ آیندہ تماشہ میں اس سنگدلی کا بہت تھوڑا موقع ہے۔ یہ سنکر پانسا نے کندھے ہلائے اور سلاوسٹ جو پانسا کے قریب بیٹھا تھا اور جسکی بابت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ پامپیائی بھر میں وہ سب سے زیادہ نیک دل ہے اس نے تعجب آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ دراصل جملہ مہمان میزبان کی اس گفتگو سے متعجب تھے کہ ایک عام تفریح پر اس نے ایسے مخالفانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔

گلاؤکس نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوے کہا "آپ اطالوی لوگ ایسی باتوں کے عادی ہیں لیکن ہم یونانی زیادہ رحم دل ہیں۔ یوں تو ہم بھی کھیل تماشے کے شائق ہیں۔ مگر ہم زیادہ شریفانہ کھیل پسند کرتے ہیں۔ یعنی آدمی کا آدمی سے مقابلہ۔ جب کہ ایک فریق اپنے شجاع حریف پر وار کر کے فخر کرتا ہو اور جب وہ مغلوب ہوجاتا ہو تو دوسرا متاسف ہوتا ہو لیکن میری باتیں تم نہیں سمجھتے۔ گلاؤکس کی اس گفتگو پر تھوڑی دیر کے لئے محفل پر خاموشی چھاگئی۔ سلاوسٹ نے گفتگو کا پہلو بدلنے کیلئے کہا یہ پلوان خوب پکا ہے، آپ کا باورچی یقیناً سسلی کا باشندہ ہو۔

گلاؤکس - ہاں وہ سائرکس کا رہنے والا ہے۔

کلوڈیس - میں آپ کے باورچی کی بازی لگا کر آپ سے کھیلوں گا۔ آؤ کھاتے بھی جائیں اور کھیلتے بھی جائیں

گلاؤکس - آدمی اور درندے کی لڑائی سے تو یہ کھیل ہی اچھا ہے۔ لیکن میں اپنے باورچی کی بازی نہیں لگاؤنگا۔ تمہارے پاس اسکے مقابلہ میں بازی لگانے کے لئے کوئی قیمتی مال نہیں ہے۔

سلاوسٹ - ہاں مجھے یاد آگیا تم نے وہ نیا قصیدہ بھی سُنا ہو جو مصری آئی سس (دیوی) کی مدح میں کسی نے کہا ہے حقیقت یہ ہے کہ قصیدہ لاجواب ہو۔

گلاؤکس - معلوم ہوتا ہے پمپیائی میں آئی سس دیوی کی پرستش زوروں پر ہو۔

پانسا - ہاں آجکل لوگوں کے دلوں پر اس صنم کا قبضہ ہے۔ کچھ عرصہ سے اسکے بُت سے عجیب و غریب قسم کی پیشیں گوئیاں ظاہر ہو رہی ہیں، میں اوہام پرست تو نہیں ہوں لیکن اتنا میں بھی مانتا ہوں کہ بارہا اسکی نصیحت کے طفیل میں مینے کئی مشکلات سے مخلصی پائی ہے۔ اسکے پجاری بھی بڑے زاہد ہیں، ننگے پاوں رہتے ہیں گوشت سے پرہیز کرتے ہیں اور رات کا زیادہ تر حصہ بیداری میں صرف ہوتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں آر بس نے ان پجاریوں کو بہت سے رازہائے نہاں سے مطلع کر دیا ہے۔ وہ اپنا سلسلۂ نسب مصر کے قدیم بادشاہوں سے بتاتا ہے۔ اور یہ بھی جتاتا ہے کہ اسے قدیم زمانے کے بہت سے بھید معلوم ہیں۔

کلوڈیس - اس میں تو کلام نہیں کہ قدرت نے اسے بدنظر پیدا کیا ہے۔ جب کبھی مجھے اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے یا تو میرا کوئی پیارا گھوڑا ضائع ہو گیا ہے، یا کھیل میں مجھے ہار ہوئی ہے۔

مجسٹریٹ - اگر آر بس اسقدر مالدار نہ ہوتا تو میں اپنے اختیارات کسی قدر ضرور استعمال کرتا اور اس افواہ کی صداقت کی تحقیقات کرتا کہ وہ جادوگر ہے یا نہیں۔ جادوگروں کو جلاوطن کر دینا چاہئے مگر وہ ایک امیر آدمی ہے۔ اور مجسٹریٹ کا فرض ہے کہ امیروں کی طرفداری کرے، یہ کہکر مجسٹریٹ نے حاضرین کی طرف داد کی توقع سے دیکھا۔

گلاوکس - آپ لوگ اس نئے فرقے کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں، یہ جو عیسائی کہلاتے ہیں۔

کلوڈیس - ہونہہ۔ پوچ۔ بالکل ہیچ۔ ان میں ایک شریف بھی شامل نہیں۔ ان کے پیرو غریب اور جاہل ہیں۔

پانسا - (ذرا جوش سے) الحاد کے جرم میں ان کو قتل کرنا چاہئے، ہمارے کسی دیوتا کو نہیں مانتے کسی طرح وہ میرے قابو میں آجائیں۔ بس پھر دیکھو۔

کھانے کا دوسرا دور ختم ہوا، اور مہمان کوچوں پر بیٹھ کر گانا بجانا سننے لگے، جو میزبان نے ان کی خاطر مہیا کر رکھا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد کھانے کا تیسرا دور شروع ہوا۔ طرح طرح کے پھل، مغزیات۔ مٹھائیاں لائی گئیں اور میز پر چنی گئیں، نوکروں نے بڑی بڑی بلوریں صراحیوں میں شراب بھی میز پر لگا دی (اس سے پہلے مہمانوں کو پیالے دست بدست دیئے جاتے تھے۔)

مجسٹریٹ شراب نہایت عمدہ ہے۔

کلوڈیس۔ ایک بلوری صراحی جس کا ہینڈل بل کھائے سانپ کی شکل میں تھا اور اس پر جواہرات جڑے ہوئے تھے، ہاتھ میں لیکر) اور صراحیاں کس قدر خوبصورت ہیں۔

گلاؤکس نے اپنی انگلی سے ایک بیش قیمت انگوٹھی نکالی اور کلوڈیس کی طرف بڑھا کر کہا۔

"میرے عزیز کلوڈیس۔ یہ انگوٹھی پہن کر ان صراحیوں کو ہاتھ میں لیا جائے تو ان کی خوبصورتی دوبالا ہو جاتی ہے۔ لہذا تم اسے قبولیت کی عزت بخشو معبود تم کو تندرست اور اقبالمند رکھیں۔

کلوڈیس نے صراحی اپنے غلام کے حوالے کر کے کہا "گلاؤکس! تم بڑے دریا دل ہو۔ تمہاری محبت ان چیزوں کی قیمت کو بڑھاتی ہے۔

مجسٹریٹ۔ "ہمارے میزبان کا جام صحت"، یہ کہکر اس نے دو پیالے پے در پے چڑھا لئے۔ دوسرے مہمانوں نے بھی اسکی تقلید کی۔

مُغنّی نے پھر راگ چھیڑا نو عمر گلے نے یونانی زبان میں گلاؤکس کی کہی ہوئی غزل گائی غزل کے ختم ہونے پر سب نے زور سے واہ وا، کی۔ بھلا جب میزبان کا کلام گایا جائے تو مہمان کیوں محظوظ نہ ہوں۔

کلوڈیس۔ لے تو بالکل یونانی ہے۔ اہا! اس سے مجھے ایک اور جام صحت یاد آگیا۔ صاحبان! حسین آئیونی کا جام صحت"۔

گلاؤکس۔ آئیونی! آئیونی! یہ تو یونانی نام ہے۔ میں بڑی خوشی سے یہ جام صحت پیتا ہوں۔ کوئی صاحب یہ بتائے کہ آئیونی کون ہے؟

پے ںلی ڈیس۔ "آپ کے سوال سے ظاہر ہے کہ آپ پمپیائی میں بالکل نو وارد ہیں، ورنہ آپ اسقدر بے خبر

نہ ہوتے۔ آیونی سے نا واقف ہونا شہر کی سب سے بڑی خوبی سے نا واقف ہونا ہے۔

مجسٹریٹ ۔ "آیونی بے مثل ماہ جبین ہے۔ اسکی سُریلی آواز ......

گلاؤکس ۔ "للہ مجھے بھی کچھ پتہ بتاؤ۔

لے پی دس ۔ "اچھا تو سنو ......

کلوڈلیس ۔ ٹھہرو جی، مجھے بتانے دو۔ آیونی ایک پردیسی ہے جو حال ہی میں پمپیائی میں آئی ہے۔ بانسلی ستار۔ بربط۔ ایک سے ایک بڑھ کر بجاتی ہے۔ بہت خوبصورت ہے، اس کا مکان ہر پہلو سے مکمل ہے۔ ایسا ذوق سلیم۔ ایسا قیمتی ساز و سامان۔ وہ امیر بھی ہے اور فیاض بھی ہے۔

گلاؤکس ۔ "پھر تو سیکڑوں ہی اُسکے چاہنے والے ہونگے۔

کلوڈلیس ۔ یہی تو معمہ ہے۔ شہر اُس پر پروانہ وار نثار ہے مگر وہ خود کسی کو نہیں چاہتی وہ شادی ہی نہیں کرتی

گلاؤکس ۔ تعجب ہے، تعجب! کیا ہم اُسے دیکھ بھی نہیں سکتے ہیں

کلوڈلیس "اگر اُسے آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو میں ابھی آپ کو وہاں لئے چلتا ہوں۔

گلاؤکس ۔ اگرچہ تکلف کے مارے اپنے مہمانوں کو لطف محفل اُٹھانے کے لئے تاکید کرتا رہا۔ مگر اسکے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس حسینہ کو جسکی تعریف وہ ایسے عجیب و غریب پیرائے میں سن چکا ہو دیکھنے کیلئے بیتاب ہو رہا ہو۔ سب مہمانوں نے میز پر رکھے ہوئے معبود کے سامنے پھر سر جھکایا اور گھر سے نکل کر پمپیائی کے بارونق بازاروں میں چاند کی چاندنی میں نکل کھڑے ہوئے، جوہریوں کے بازار سے جہاں دوکانوں میں جواہرات پر روشنی کا عکس پڑ رہا تھا۔ گزر کر یہ لوگ آیونی کے محل پر پہنچے، مکان آئینوں سے جگمگا رہا تھا۔ اندر دروازوں پر ارغوانی کارچوبی پردے پڑے تھے اور دیواریں قیمتی نقش و نگار سے مرصع تھیں، آیونی اپنے باغ میں تھی اور ارد گرد تعریف کناں ملاقات کا مجمع تھا۔ باغ میں داخل ہوتے ہوئے۔ گلاؤکس نے کلوڈلیس سے دبی آواز میں پوچھا "کیا آپنے کہا تھا کہ وہ ایتھنز کی رہنے والی ہو؟ کلوڈلیس نے جواب دیا نہیں وہ نیپلز سے آئی ہے"۔ نیپلز کا لفظ گلاؤکس نے تعجب سے دُہرایا۔ ان نو وارد لوگوں کے آگے بڑھنے پر سابقہ ملاقاتیوں کا گروہ چھٹ گیا۔ اور گلاؤکس کی آنکھوں نے اپنے سامنے اُس دوشیزہ کو دیکھا جسکی یاد اُس دن سے اُسکے دل میں تھی جب کئی مہینے ہوئے نیپلز کے مندر میں وہ عبادت

محسن الملک

جلد (۱) — نمبر (۳)

قیمت سالانہ صہ
ششماہی سے ر
(فی پرچہ ۸ر)

مرتبہ:- حامد بہوپالی

بابت ماہ نومبر سنہ ۱۹۲۴ عیسوی

اشارات - ایڈیٹر ۲

نغماتِ قدس حضرت شہزادہ قدسی ام برکاتہ ۳

اسوۂ حسنہ - مولینا ماہر ۹

رباعی - لسان العصر اکبر الہ آبادی مرحوم ۱۲

تجلیاتِ سہا - مولینا سہا (علیگ) ۱۳

فلسفۂ غم - مولینا ثاقب کانپوری ۱۳

درس اخلاق - مولینا محوی صدیقی ۱۷

جذباتِ مائل - محمد مکرم صاحب مائل ۱۸

مکالمۂ حسن و عشق - حضرت صدق جائسی ۱۹

غزل - ایڈیٹر ۲۰

سوز محبت - ملقب حامل صاحب (الہ آبادی) ۲۱

کلام شہید - حضرت شہید مرحوم ۲۱

محشرستانِ خیال - جناب نوبت کانپوری ۲۶

افکار عالی - حضرت عالی صفی پوری ۲۹

عالمِ تخیل - سید قمر الحسن صاحب ۳۰

بہارِ باغ - حضرت باغ حیدر آبادی ۳۴

سراب الفت - مولینا محمود الحسن صاحب (علیگ) ۳۵

اقوام کا عروج - سید عبد الکریم صاحب بی اے ایل ایل بی ۴۲

زمزمۂ نعت - محمود اعظم صاحب فہمی ترمذی ۴۸

بازگشت - محمد اسمٰعیل صاحب ہاتف ۴۹

محنت و ذہانت - پروفیسر مولوی وحید الدین صاحب سلیم ۵۳

ریاکار مجرم - مولینا مائل ۵۶

سحر و شفق - مولینا شفق ۵۹

محمود کی دہائی - حضرت تمکین کاظمی گلبرگہ ۶۰

فتح اسکندریہ - مولینا برکت علی صاحب ۶۵

اناطول فرانس - مولینا سعیدی بی اے علیگ ۷۲

اقوال زریں - عبد الغفور صاحب سعید - گلبرگہ ۷۴

پاپیا - برکت علی صاحب ۷۵

تنقید و تبصرہ - ایڈیٹر ۸۰

اشارات

۱- مجھے مسرت ہے کہ ماہ دسمبر ۲۴ء سے رسالہ "محسن الملک" کی ترتیب میں حضرت صدق جائسی نے خاص حصہ لینے کا وعدہ فرماتے ہوے آنریری ایڈیٹر کی خدمات سے رسالہ ہذا کی عزت افزائی فرمائی ہے، موصوف ہندوستان کے ایک مشہور اور فاضل ادیب ہیں، جو عرصہ سے منظر عام پر آچکے ہیں۔

۲- "نغمات قدس" حضرت قبلہ شہزادہ قدسی دام برکاتہم کے افکار جمیلہ رسالہ کے لئے باعث برکت و افتخار ہیں۔

۳- مولینا ماہر، محسن الملک کے ایک مخصوص مضمون نگار ہیں، جنکا زور قلم ناظرین سے خراج تحسین لئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

۴- شفیق محترم حضرت سہا، اور مولینا ثاقب کانپوری کے افکار زریں رسالہ ہذا کو ممتاز بنا رہے ہیں، اور میرے لئے باعث تشکر و امتنان ہیں۔

۵- جناب محوی لکھنوی ہندوستان کے مضمون نگاران میں امتیازی خصوصیت رکھتے ہیں، "محسن الملک" صاحب موصوف کا شکر گزار ہے۔

۶- بلقیس جمال صاحبہ ہندوستان کی لائق اور مشہور ادیب ہیں۔ "سوز محبت" موصوفہ کے حسن تخیل کا اچھا نمونہ ہے"۔

۷- جناب نور کانپوری، حضرت عالی صفی پوری، کی ادبیات "محسن الملک" کی زینت اور میرے شکریہ کا باعث ہیں۔

۸- "عالم تخیل" بھوپال کے ایک نوعمر متعلم کی ذکاوت طبع کا نتیجہ ہے، اور خوب ہے، ہماری کوشش ہے کہ نونہالان قوم میں ادبی روح پیدا ہو تاکہ مستقبل میں یہی ذرے جواب مہر درخشاں ہوں۔

۹- بعض ضرورتوں کی تعمیل میں ہمنے مریم ناول کا سلسلہ بند کر دیا۔

ایڈیٹر

نغمات قدس

چند سال کا عرصہ ہوا کہ بھوپال کے گنجی خانہ میں آگ لگی، سُنا کہ آتشیں سمندر موجیں مار رہا ہے ہم بھی تماشہ دیکھنے گئے، محبت کے شعلوں کی طرح آگ بھڑک رہی تھی، سارا میدان ایک حسن کا دریا نظر آتا تھا، ایک نوجوان انسان کے شباب کی طرح جوبن اُمڈا ہوا تھا گویا نور کی بارش ہو رہی تھی، ہمارا دل اس عجیب و غریب منظر کو دیکھکر دھڑکنے لگا اور ہم بحر سکوت میں مستغرق ہو گئے۔

ایک آتشیں شعلہ نے جسے دریائے حسن کی موج کہنا چاہئے ہمیں خموش دیکھکر کہا:-

اے حسن مجسم! کیوں خموش ہے؟

ہمنے کہا تمہارے حسن کی بہار دیکھکر،

موج مسکرائی اور کہنے لگی، نادان اپنے بے مثل حسن کو دیکھ ہم تو تیرے ہی حسن کے ذرات ہیں تھوڑی دیر اپنی آب و تاب دکھا کر نابود ہو جائیں گے، نیر الازد ال حسن ابدالآباد تک فضائے کائنات کو منور کرنے والا ہے۔

ایک موقع کا ذکر ہے ہم حالات سیارگان میں غور کر رہے تھے، یکایک مشتری کا برزخ پیش نظر ہوا۔ نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تصویر تھی اُس کی شان دلربائی نے ہمکو بے خود و بے ہوش کر دیا؛ اُس نورانی تصویر نے ہمکو اپنے پہلو میں لیکر اپنے دامن کی ہوا کی، ہمنے ہوش میں آکر آنکھیں کھولیں خود کو شعلۂ نور کے پہلو میں دیکھا محو حیرت ہو کر پھر بیہوش ہو گئے۔ اس نور کی تصویر نے ہمارا یہ حال دیکھکر ایک نغمہ شروع کیا جسکے ترنم سے کائنات کا ہر ذرہ وجد کرنے لگا اور تمام ستارے رقص کناں اس جگہ جمع ہو گئے اور ہر ایک ہمکو ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگا، ہم ہوش میں آئے خود کو پرستان میں دیکھا ششدر ہو گئے، اپنے کو سنبھالا، گرداگرد نورانی تصویریں تھیں، عجب منظر تھا۔

مشتری جو ہم سے قریب تھی گویا ہوئی۔

اے حسن مجسم کیوں خموش ہے؟

ہمنے کہا تمہارے حُسن کی بہار دیکھکر۔
سب ستارے ہنس پڑے، خورشید جوان سب میں زیادہ حسین اور پُرشوکت و پُرجلال تھا بولا :۔
غافل! اپنی بے مثال دلاویز حُسن کو دیکھ، ہم سب تیرے ہی حسن کے ذرات ہیں ایک مدت
پوری کرکے فنا ہو جائیں گے۔ تیرا جمال ہمیشہ باقی رہے گا۔

ایک اور موقع کا ذکر ہے، ہم سمندر میں سفر کر رہے تھے، لہروں کے تموج سے عجب لطف حاصل ہو رہا تھا یکے بعد دیگرے موجیں اٹھکیلیاں کرتی چلی آتی تھیں، ہمارا جہاز ہوا سے باتیں کر رہا تھا ہر موج ہمارے جہاز سے ٹکراتی ہوئی گذرتی اور آگے جاکر فنا ہو جاتی، اسیطرح برابر سلسلہ جاری تھا، اتنے میں ایک بڑی موج سامنے سے آتی نظر آئی جیسے ایک روئی کا پہاڑ چلا آتا ہو سب لوگ حیرت سے اس برف کی دیوار جیسی موج کو دیکھنے لگے، جہاز کے قریب آتے ہی وہ موج ایک عجب دلربایانہ انداز سے یکایک غائب ہوگئی اور ہمارا جہاز سمندر کی ایک ہموار سطح پر جا نکلا، چھوٹی لہریں برابر ہمارے جہاز کا خیر مقدم کرتی رہیں، ہم جہاز میں ایک جنگلے کے قریب کرسی بچھائے بیٹھے تھے اور نہایت خوشی و استغراق کے ساتھ قدرت کردگار کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔

ایک چلبلی موج نے ہم سے کہا :۔
اے حسن مجسم! محو حیرت کیوں ہے؟
ہمنے کہا تمھارے حسن کی بہار دیکھکر،
وہ اور اُسکے ساتھ کی کمسن و حسین موجیں مسکرائیں اور بولیں۔
بے خبر! اپنے حسن کو دیکھ، ہم سب تیرے ہی حسُن کے ذرات ہیں، ذرا سی دیر کی نمائش ہیں،
پھر فنا ہو جائینگے، تیرا حسُن دائمی و جاودانی ہے۔

ایک مرتبہ موسم برسات کا لطف اُٹھانے ہم کسی پہاڑ پر گئے، سیاہ بادلوں سے ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا بارش خوب ہو رہی تھی، ہم ایک چٹان کے نیچے بیٹھے ہوئے تماشہ دیکھ رہے تھے بادلوں کی گرگڑاہٹ سے پہاڑ سہما جاتا تھا، کبھی بجلی چمک کر روشنی پیدا کر دیتی تھی اور سبزہ زار کی فرحت خیز بہار سے آنکھیں لطف اندوز ہو جاتی تھیں، پانی برسنا ذرا کم ہوا اور بجلیوں کی پیہم جگمگاہٹ شروع ہوئی، یہ برہنہ پریاں بڑے ناز و انداز

اور عریانی کے ساتھ اپنے حسن کی جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی تھیں، ہم اس نہایت دلکش و نظر فریب سماں کو دیکھ کر بالکل از خود رفتہ ہو گئے۔

ایک بڑی طرار برقی پری نے ہمیں گدگدایا اور کہا:۔

اے حسن مجسم! چپ کیوں ہو؟

ہمنے کہا سیاہ بادلوں میں تمہارا چمکنا لپکنا جیسے سنگ کسوٹی پر سونے کی لکیریں، اور پھر یکایک اپنے حسن کی بہار دکھا کر غائب ہو جانا، ہم کو محو حیرت کئے ہوئے ہے۔

سب برقی پریوں نے زور سے ایک قہقہہ مارا اور کہا:۔

اے حسن کامل! تیرا حسن ازلی ابدی ہے، ہم سب تیرے ہی حسن کے ذرات ہیں اور بہت جلد فنا ہو جانے والی ہستیاں ہیں تو کیوں اس فانی رنگ روپ پر مٹا جاتا ہے اپنے ہی لازوال حسن کی بہار دیکھ۔

اور بہت سی طرح کے مشاہدات ہوئے جن سے معلوم ہوا کہ ہم سے زیادہ کوئی چیز حسین نہیں، کائنات کا ہر ذرہ ہمارے ہی بے مثال حسن کا جلوہ ہے، پس اپنے حسن و جمال سے مسرور اور اپنی خوبی و جمال پر شادماں ہو کر شکر حق بجالائے، اور سمجھ گئے کہ قادر مطلق نے ہم کو سب سے اشرف سب سے افضل، سب سے بہتر بنایا ہے، اور ہمارے ہی ناقص ذرات سے یہ کارخانۂ عالم بنا ہے، تمام عالم کی بادشاہت و خلافت ہمارے ہی لئے ہے، اور کائنات کی ہر چیز ہمارے تابع فرمان ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وسخر لکم الشمس والقمر، وسخر لکم اللیل والنہار، سخر لکم البحر،

ہمارا فرض ہے کہ قادر مطلق کے اس بے نہایت فضل و کرم کا شب و روز شکر ادا کریں اور طاعت و بندگی سے ایک دم کیلئے بھی منہ نہ موڑیں۔

قدسی غفرلہ

اسوۂ حسنہ

جذبات کا توازن قائم رکھنا، فطرت انسانی کے لئے بے انتہا مشکل کام ہے، یہی سبب کہ فضاء عالم میں مدتوں تاریکیاں پھیلی رہیں۔

ابتدائی دور میں طاقت ور ہستیوں نے اپنا اقتدار بڑھالیا تھا، اور ان میں طاقتوں کا مغرورانہ تخیل جذبات کا توازن قائم نہ رکھ سکا، یہاں تک کہ کمزور اور ناتواں مخلوق پر اُنکی چیرہ دستیاں شروع ہوگئیں۔

طاقتوں کی رعونت نے ان کی دماغوں میں یہ خیال مسلط کر دیا تھا کہ ہمارا حق ہے کہ ہمارے حقوق کے احترام میں کمزور طبقہ کی پیشانیاں جھکتی رہیں۔

یہی ناپاک اور مغرورانہ تخیل تھا جس نے صنف نازک کے حقوق پر ضرب لگائی اور دوسری طرف غلامی کے وجود کو پیدا کیا۔

غلاموں کی دردناک حالت نہ مقننین روما مٹا سکے اور نہ حکماء یونان کی تعلیمات ان کی مظلومیت کی حامی رہیں۔

آغازِ تمدن سے ہی یہ طبقہ دلخراش مصائب میں مبتلا کیا گیا، نہ ان کو حقوق انسانیت میں حصہ دیا گیا اور نہ ان کو کبھی اقتدارِ مرضی حاصل ہوا۔

بہیمانہ اقتضائے طبعی راتدن ان سے سخت محنت لیتی تھی اور ادنیٰ قصور پر اُن مجسمۂ مظلومیت کے لئے وحشیانہ سزائیں تجویز کیجاتی تھیں۔

مالک کا اشارۂ ابرو اُنکی حیات و ممات کا فیصلہ کر دیا کرتا تھا اور عموماً کمزور و بیمار غلام صحراؤں کے ہلاکت بیز دامن میں بحالتِ کس مپرسی بھیجدیے جاتے تھے، نظارہ ہائے جفاکیشی کا یہ ادنی واقعہ ہے کہ روما میں ایک شخص ہلاک ہوتا ہے۔ اور ۴۰۰ غلاموں کے پیراہن زندگی چاک کر دیے جاتے ہیں

غلام کے ہاتھ سے ایک پرندہ کی موت عطس کے وحشیانہ جذبۂ انتقام کو یہاں تک برانگیختہ کرتی ہے کہ آستانۂ سطوت وجبروت سے اس کے قتل کا فرمان جاری ہوتا ہے۔

یہ دردناک حالت اُس دور کے لئے ہی مخصوص نہ تھی۔ بلکہ عہد موسویت میں بھی اس مظلوم طبقہ کے ساتھ عام ہمدردی نہیں کی گئی، اور نہ عہد عیسویت ہی کی برکات سایہ گستر رہیں۔ چنانچہ مسٹر باسورتھ سمتھ کہتا ہے کہ موسیٰ نے عادات و رسوم ملکی مثل .... اور غلامی کو جیسا پایا ویسا ہی رکھا اور مسیح نے اُس وقت خاص خیال چھوڑ دیا اور سلطنت روم قدیم کی سخت برائیوں کو مثل ...... اور غلامی کو برابھلا نہ کہا۔"

صنف نازک کے حالات بھی نہایت ابتذال اور پستی کی حالت میں تھے، بحیثیت مجموعی قدیم یونان میں عورت کا مرتبہ نہایت پست تھا، اسکی زندگی کا دور غلامی میں بسر ہوتا تھا ردما بھی اسکے احترام میں کوئی قدم نہ بڑھا سکا۔

یورپ نے مدتوں اسکو عقوبت میں گرفتار رکھا حتیٰ کہ وہ اسکے جسم میں روح کے ہونے سے ہی انکار کرتا رہا کراسٹیم بحوالۂ اقوال علماء مسیحی عورت کی تصویر ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

(۱) عورت ایک بلا ہے جس سے گریز ممکن نہیں، یہ ایک خانگی فتنہ ہے اور مہلک سحر غرضکہ دنیا تاریک ہو رہی تھی، اور صحیفۂ اخلاق کے اوراق میں سیکڑوں شکنیں پڑی ہوئی تھیں، مراسم قبیحہ کا سیلاب بڑھ رہا تھا، اور سیئات کی ظلمتوں نے فضائے عالم کو گھیر لیا تھا۔

جنگ و جدل کی قیامت خیزیوں سے عرب ہولناک مصائب میں مبتلا تھا اور باہمی مظالم وسفاکیوں سے حیات بشری تنگ تھی۔

چوری، زنا، جھوٹ، اولادکشی کا بازار گرم تھا، کہ کوہ حرا کی چوٹیوں سے ایک برق آسا آواز نے ایک غلغلہ انگیز صدا نے قوت سامعہ کو بیتاب کردیا۔ اور رسول اکرم کے اُسوۂ حسنۂ کی تعلیمات نے دنیا کی کایا پلٹ کردی۔ متکبرانہ فطرتوں میں رحم و ہمدردی کے جذبات بھر دیئے اور خود غرضانہ طبیعتوں میں فیاضانہ سلوک کی روح پیدا کردی۔

جو خونخوار ہاتھ وحشیانہ رعونت سے کمزوروں پر اُٹھا کرتے تھے اب وہی ہاتھ شفقت و

تلطف کے ساتھ بڑھنے لگے، جذبات میں معدلانہ توازن قائم ہونے لگا، جس سے معاشرت کی سطح نظر فریب بن گئی اور تمدن کا تختہ نزہت فزا ہوگیا، معصوم طبقہ پر بیرحمانہ شقاوت کا باب یہ ارشاد سنا کر ختم کیا گیا۔ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ
نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ خِطْاً كَبِيْرًا

زنا کے متعلق یہ رہنمائی کی گئی کہ:۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَاۗءَ سَبِيْلًا

اسیطرح مغرورانہ تخیل نہایت پیارے اسلوب کے ساتھ یہ کہکر ہٹایا گیا:۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ
الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا

والدین کے احترام حقوق میں یہ جملے دُہرائے گئے:۔

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ
وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا

جھوٹ، تہمت ریا، غرضکہ بد اخلاقی کا ایک ایک داغ چہرۂ انسانیت سے دور کیا گیا، اور تہذیب و اخلاق ہمدردی، فیاضی ورحم وغیرہ کی تعلیمات سے انسانی جسم کا گوشہ گوشہ منور کر دیا گیا

صنف نازک جنکے حقوق کا دست رنگیں مفلوج کر دیا گیا تھا جنکی ہستی امتیاز انسانی سے عریاں سمجھی جاتی تھی، "فرمان ایزدی کے اس ترانۂ جانفزا سے

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ

مردوں کے دلوں میں اُن کے وقار کے نقوش مرتسم کر دیے گئے۔

غرض کہ جب دنیا بد اخلاقی اور ابتذال کی خلیج سے نکل آئی اسکے ظلمت کدۂ قلب میں نورانی شعاعیں پڑ چکیں، اور ہمدردی بنی نوع انسان کا کیف دماغوں پر چڑھ چکا یعنی تبلیغ رسالت اپنا کام کر چکی اور "اکملت لکم دینکم" کا نغمہ صفیر قدسیت سنا چکا۔ تو اُس پیکر نور کو مظہر نور قدسیت میں جذب ہونے کا اشتیاق بے چین کرنے لگا، زمانہ وصال کے حسیات کا تموج قلب اطہر کو گھیرنے لگا۔

مشتاق نگاہیں جلوۂ محبوب ازل میں ڈوبنے لگیں اور رفیق اعلیٰ کی حضوری کا صہبائے شوق دل وجگر کو بیخود کرنے لگا۔

لیکن اس عالم وجدانی میں بھی، اس ذوق بیتابی میں بھی اصلاح حال امت کا خیال تھا، ہجرت کا دسواں، اور تبلیغ رسالت کا بائیسواں ۲۲ سال تھا کہ ذوالجلال اکبر نے جو کام سپرد کیا تھا وہ آپ انجام دے چکے اور مسلمانان عالم کو دعوتِ حج دی گئی۔

۱۰ ذی الحجہ کو آپ نے منیٰ میں نزولِ اجلال فرمایا اور مشتاقان دیدار جمال جوق جوق حاضر ہو گئے اس وقت آپ کی مطہر زبان ناصحانہ خطیبانہ انداز سے اسطرح متحرک ہوئی:-

"لوگو! غالباً میں اسکے بعد اس جگہ تم سے نہ ملوں گا، جسطرح اس ماہ اور اس دن کی تم حرمت کرتے ہو اسیطرح ایک دوسرے کا خون کرنا اور مال لینا حرام ہے یاد رکھو کہ تمہیں اُس ازلی وابدی ہستی کے حضور میں حاضر ہونا پڑے گا اور تمہارے افعال کا محاسبہ ہوگا۔

لوگو! جس طرح عورتوں پر تمھارے حقوق ہیں اسیطرح عورتوں کے حقوق تم پر بھی ہیں، اُن کے ساتھ نرمی اور مہربانی کا سلوک کرو، وہ خدا کے حکم سے تمھارے تصرف میں آئی ہیں اور اسکے حکم سے وہ تم پر حلال ہوئی ہیں۔

یاد رکھو! کہ جائز کاموں میں طلاق خدا کو سب سے ناپسند ہے۔

اپنے غلاموں کا خیال رکھو، جیسا تم کھاؤ ویسا ہی اُن کو بھی کھانے کو دو اور جو کام تم اُن سے لو اُس میں تم بھی اُن کے ساتھ شریک ہو، تم میں سے جو شخص اونکو مارے اُس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ آزاد کر دیا جائے۔

یاد رکھو! غلاموں کے ساتھ بدسلوکی بہشت سے محروم کرتی ہے، تبارک و تعالیٰ کے نزدیک غلاموں کی آزادی سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں ہے۔

لوگو! سنو اور سمجھو کہ سب مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں، اور تم سب برابر ہو، کسی مسلمان بھائی کی چیز بلا استرضا جائز نہیں ہے۔

خبردار! ناانصافی نہ کرنا میں تم میں ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ اگر تم اس پر عمل کروگے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے وہ "خدا کی کتاب" ہے۔

جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ اُن لوگوں کو جو اس وقت یہاں موجود نہیں مطلع کردیں"

اس الوداعی ناصحانہ سلک مروارید میں خصوصیت کے ساتھ صنف نازک اور قابل رحم غلاموں کی نسبت توجہ دلائی گئی

یہی ہستیاں ایسی تھیں جنکی شرائین مظالم وسفاکی سے خونبار رہا کرتی تھیں اور قوموں اور حکومتوں نے ان کے حقوق کو پامال کرڈالا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس طبقہ کے حقوق کا بار بار اعادہ کیا گیا۔

دنیا میں عموماً ایسی ہستیاں گزری ہیں جنہوں نے فلسفۂ اخلاق کے باریک سے باریک خط وخال دکھانے کی کوشش کی ہے مگر خود نمونہ نہیں بنے۔

انہیں لوگوں کے حق میں کہا گیا ہے۔ اتامرون بالبر وتنسون انفسکم

لیکن وہ نفس قدسی وہ ہستی اکمل جو کہتا تھا وہ کرتا تھا اور جن فرائض کی تبلیغ کرتا تھا، اس پر خود بھی عامل تھا،

کاشانۂ نبوت میں ازواج مطہرات کے ساتھ جس حسن سلوک، رفق وکرم، خلوص ومحبت اور لطف ومعاشرت سے اپنا مبارک دورِ حیات ختم کیا ہے۔ اُسکی تصفیہ کے لئے حضور اقدس کی لائف پڑھو اور خانگی روحانی مسرتوں کے واقعات دیکھو!

وہ ہستئ اعظم جانتی تھی کہ دنیا نے اس طبقہ کے ساتھ جذبات میں معدلانہ توازن قائم

نہیں رکھا ہے اس لئے اُن کے حقوق کی سختی کے ساتھ حمایت کی ہے۔

ایک موقع پر ارشاد فرمایا گیا ہے "خیارکم خیارکم لنساءکم" یعنے تم میں اچھے وہی ہیں جو اپنی عورتوں کے ساتھ اچھے ہیں۔

مساوات حقوق کی نسبت رب العالمین کے اس حکم کی تبلیغ فرمائی گئی "ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف" (جو حقوق مردوں کے ہیں ویسے ہی عورتوں کے مردوں پر ہیں)

غلاموں کی دردناک حالت کا احساس اور اُنکی دور زندگی کی کیفیات نے بے حد متاثر کردیا تھا وہ ذاتِ رفیع جو دنیا میں مساوات کی تعلیمات قدسی کے لئے مبعوث فرمائی گئی تھی اُس نے اِس مظلوم طبقہ پر خاص طور پر توجہ کی اور فرمایا "ماخلق اللہ شیئاً علی وجہ الارض احب الیہ من العتاق" (زمین پر خدا نے کوئی ایسی چیز نہیں پیدا کی ہے جو اسکو غلاموں کے آزاد کرنے سے زیادہ پیاری ہو)

شفقت و رافت کی انتہائی حد تھی کہ کہیں جذبات کو ٹھیس نہ لگے اور حقارت و ذلت کا تخیلہ غمگین نہ کرے۔ تسمیہ غلام سے تخاطب ناگوار ہوتا تھا اور ہدایت تھی کہ غلام کو غلام کہکر نہ پکارا جائے بلکہ لڑکا اور لڑکی کہکر پکارا جائے۔

وسعتِ کرم کا یہ حال تھا کہ آپ غلام کو آزاد کرتے تھے لیکن وہ آستانۂ نبوت سے ہٹنا پسند نہیں کرتا تھا۔ حضرت خدیجہؓ زید کو خدمت مبارک میں بھیجتی ہیں اور آپ انھیں آزاد کرتے ہیں مگر وہ مفارقت گوارا نہیں کرتے۔

آپ کی جب وفات قریب ہوتی ہے تو اسامہ بن زید کے ہاتھوں میں عساکر اسلامیہ کا جیش دیئے جانے کی وصیت فرماتے ہیں۔

حضرت انس بیان فرماتے ہیں کہ میں آستانۂ نبوت پر دس برس حاضر رہا ہوں مگر اس عرصۂ کثیر میں مجھے اُف تک نہیں کی گئی اور نہ یہ فرمایا گیا کہ تو نے یہ کام کیوں کیا اور یہ کیوں نہیں کیا گیا۔

حلقہ بگوشان رسالت کا متفقہ قول ہے کہ ضروریات زندگی کے تمام کاروبار آنحضرت ؐ خود ہی کرلیا کرتے تھے اور ہمکو موقع نہیں دیتے تھے۔

انہیں تعلقات قدسیہ کا اثر تھا کہ حضرت فاطمہؓ اپنی کنیزہ کے ساتھ چکی پیسنے میں مصروف رہتی تھیں اور اسی کا فیضان تھا کہ خلیفہ دوم (حضرت عمرؓ) جنکی سطوت وجبروت سے دنیا لرزتی ہے جن کے جیوش نے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیے تھے، جب بیت المقدس تشریف لیجاتے ہیں اور بیت المقدس کی دیواروں تک پہونچ جاتے ہیں تو لوگوں کو یہ نظارہ حیرت میں ڈالدیتا ہے کہ آپ کا غلام اونٹ پر سوار ہے۔ اور آپ مہار شتر لئے ہوے رہ پیمائی کررہے ہیں۔

تاریخ اسلام میں غلاموں کے روحانی ارتقا، اعزاز و احترام اور اوج ثروت وجلال کے واقعات بکثرت نظر آتے ہیں۔

جب حضرت بلالؓ حبشی داعی اجل کو لبیک کہتے ہیں تو حضرت عمرؓ کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتا ہے ؎

اُٹھ گیا آج زمانہ سے ہمارا آقا
اُٹھ گیا آج نقیب حشم پیغمبر

ماہر

رباعی

خاطر مضبوط دل توانا رکھو
امید اچھی خیال اچھا رکھو
ہوجائیں گی مشکلیں تمہاری آسان
اکبر! اللہ پر بھروسا رکھو

اکبر مرحوم

تجلیاتِ سہا

یہی تو وقت ہے اے اشکِ خوں کچھ کام کر جانا
خوشا قسمت کہ اُس دامن پہ ہاتھ آئے بکھر جانا

چھٹا ہر روز کے طعنوں سے بے مہری کے شکووں سے
مرے مرنے کو اُس نے خوب قصہ مختصر جانا

نہ چھیڑ اے التفاتِ یار اب عادت بگڑتی ہے
خفا کر دے نہ پھر تجھ کو مرا حد سے گزر جانا

ہمیں تو دل کے بہلانے سے "مطلب" ہوں نہ ہوں ایفا
کئے جا جتنے وعدے جی میں آئیں پھر مکر جانا

بناتا ہوں نشیمن شاخسارِ برقِ سوزاں پر
سمجھتا ہوں، فروغِ زندگی الفت میں مر جانا

سہاؔ یعنی وہ بیچارہ، کہ شاید یاد ہو تم کو
کسی کے سر سے رنج و غم کا اک طوفاں گزر جانا

سہا

فلسفۂ غم

زندگی غم کا اپنی اب نہ ماتم کیجئے،
روح کو لذت کشِ غمہائے پیہم کیجئے

دیکھئے مضمر ہے اس میں برہمیِ کائنات
سوزِ غم اور سوزِ الفت کو نہ باہم کیجئے

انقلابِ رنج و غم سے لیجئے عبرت کا درس
عیش کی گھڑیاں ہیں جتنی صرفِ ماتم کیجئے

دیکھئے ہاں پھر مجھے ترچھی نظر سے دیکھئے
کیجئے ہاں پھر فضا کا دل کو برہم کیجئے

کاہشِ دل بڑھ گئی ہے وسعتِ محدود سے
ظاہری عالم سے پیدا اور عالم کیجئے

ہو چکا اب چارۂ ناکامیِ غم ہو چکا
اس دلِ اندوہگیں کو صرفِ ماتم کیجئے

مٹ گیا، اچھا ہوا، اک حشر در آغوش تھا
منتشر ذراتِ دل کو اب نہ باہم کیجئے

مبتلائے کشمکش ہو جائے گی جانِ حزیں
دل کو کیفیاتِ پنہاں کا نہ محرم کیجئے

بندِ پردہ پھر شکایتہائے بیرنگی بجا
پہلے دل کو رازِ بستہ کا محرم کیجئے

اضطرابِ قلبِ مضطر کا یہی ہے اک علاج
دل کے شیرازے کو ثاقبؔ آپ برہم کیجئے

سید ابو محمد ثاقب کانپوری

درسِ اخلاق

(سلاطینِ اسلام کی زندگیوں میں)

خلیفہ منصور اور محسن بن زائدہ

کوفہ کا ایک خارجی مذہب، خلیفہ منصور کی حکومت برباد کرنے کی کوشش میں رہا کرتا تھا اور اکثر فتنے پیدا کرتا رہتا۔ لیکن کچھ ایسا چالاک، عیار اور شریر تھا کہ باوجود کوشش حکومت کی پولیس کے قبضہ میں نہیں آتا تھا۔ منصور نے حکم دیا کہ جو اُسے گرفتار کر کے لائے گا اُسے ایک لاکھ درہم یعنے تقریباً ۲۵ ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ اور ملزم تلوار کے گھاٹ اتارا جائے گا۔ اس اعلانِ انعام نے ہر شخص کو مجرم کا جویا بنا دیا اور لوگ کھوئی ہوئی دولت کی طرح اُسے ڈھونڈھنے لگے ایک روز وہ چھُپ کر بغداد میں کسی طرف کو جا رہا تھا کہ اُسکے ایک ہموطن (کوفی) نے دیکھ کر پہچان لیا۔

۲۵ ہزار روپیہ کا انعام ایسا نہ تھا جس سے کوئی ہاتھ دھو لیتا، اس کوفی نے وطنیت کے جذبے کو طاقِ نسیاں پر رکھ لپک کر خارجی کو پکڑ لیا۔ اور پکارا۔ دوڑو دوڑو یہ باغی ہے۔ یہ کہنا تھا کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سُنائی دی۔ گرفتار کرنے والے کوفی اور مجرم خارجی نے دیکھا کہ سردار محسن ابن زائدہ چلا آرہا ہے۔ سردار محسن عباسی حکومت میں بڑا معزز رئیس اور نامور سردار تھا۔

مجرم خارجی محسن کو دیکھکر پکارا "مجھے پناہ دیجئے خدا آپ کو اپنی پناہ میں لیگا"

عربی سردار نے فوراً گھوڑا روک لیا۔ اور پوچھا "کیا بات ہے"؟

"گرفتار کرنے والا" :- جناب والا! یہ امیر المومنین کا زبردست مجرم ہے، اور بغاوت جیسے جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ اسکو گرفتار کرنے کا حکم ہے، اور ملکی و شاہی فرض میں ادا کر رہا ہوں امیر المومنین کا حکم عالی ہے کہ جہاں ملے گرفتار یا قتل کیا جائے۔ اور اسے گرفتار کرنے والے کے لئے ایک لاکھ درہم انعام ہے۔ جناب خیال کر سکتے ہیں کہ میں کیونکر اس کو چھوڑ سکتا ہوں۔

محسن - ہم کہتے ہیں کہ چھوڑ دو -

پھر اپنے ایک غلام سے مخاطب ہو کر حکم دیا -

تم اپنی سواری پر سے اُتر کر اسکو سوار کر لو اور ہمارے گھر پہونچا دو -

گرفتار کرنے والا (چلّا کر) لوگو دوڑو - اور میرا ساتھ دو ، یہ شخص امیر المومنین کے باغی مجرم کو چھڑا کر لے جانا چاہتا ہے

محسن - جاؤ ، امیر المومنین سے کہدو کہ ، یہ باغی مجرم ہمارے پاس ہے ہم ذمہ دار ہیں -

محسن ایک نامور سردار تھا ، اسکے مقابلے میں ایک غیر معروف اجنبی کوئی کی کون سن سکتا ہے

چاروناچار چھوڑنا پڑا -

محسن نے خارجی کو لیکر اپنے گھر کا راستہ لیا - اب اس لالچی انعام طلب کے لئے اسکے سوا چارہ کار نہ تھا کہ سیدھا دربار خلافت میں پہونچے اور حضرت امیر المومنین سے فریاد طلب ہو -

غرض یہ شخص قصر خلافت پر پہونچا - اطلاع دی گئی - اور یہ دربار شاہی میں بلا لیا گیا غریب ناکام آرزو نے پُرحسرت سارا قصہ حضرت خلیفہ کے گوش مبارک تک پہونچا دیا -

ظاہر ہے کہ ایسے سخت مجرم کو جسے گرفتار کرنے کا اتنا بڑا بادشاہ اسلام حکم دے رہا ہو اور اسکی ریشہ دوانیوں سے تنگ آکر اسیری کے لئے ایک لاکھ درہم کے انعام کا اعلان ہوا ہے اور آج ایک سرداریوں بچا کرے جائے اور کہدے کہ جاؤ اور خلیفہ سے کہدو آپ کا مجرم ہمارے پاس ہے خلیفہ کو سنکر تاب ضبط نہ رہی ، فوراً فرمان جاری ہوا کہ محسن ہمارے حضور میں حاضر کیا جائے - فوراً فرمان خلافت کی تعمیل کی گئی اور محسن بن زائدہ کو جا کر حکم سنایا گیا کہ حضور خلیفہ ابھی بُلا رہے ہیں محسن کو حکم پہونچا تو وہ سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے - اُس وقت اُسنے اپنے غلاموں ، عزیزوں ، دوستوں گھر والوں اور بال بچوں کو غرض اپنے تمام متعلقین کو یاد کیا - سب بلائے گئے محسن نے کہا : -

میں تم سب کو خدا کی قسم دیکر وصیت و تاکید کرتا ہوں کہ اس شخص کو کبھی کوئی تکلیف نہ پہونچے

اسکی ہر قسم کی خبر گیری اور خیال رکھا جائے کہ ہم نے اسکو پناہ دی ہے

یہ وصیت کرکے وہ دربار خلافت کو روانہ ہوا محل میں اطلاع دی گئی۔ اسنے جاتے ہی نہایت ادب سے خلیفۃ المسلمین کو سلام کیا، اور آداب بجالایا،

منصور غصہ سے بھرا ہوا تھا، اسنے کچھ جواب نہ دیا اور یہ کہا۔ کیوں تمھاری یہ جرأت کہ ہمارے دشمن اور مخالف کو پناہ دیتے ہو۔ اور اس دلیری کے ساتھ۔

محسن۔ جی ہاں اے امیر المومنین یہ قصور تو ضرور ہوا ہے۔

منصور۔ اور کہتے ہو کہ جی ہاں۔!

منصور کے غصے کی آگ اور زیادہ بھڑک اٹھی، دربار کانپ رہا تھا کہ دیکھئے کیا حکم ہوتا ہے مگر محسن کی پیشانی پر بل تک نہ تھا، اسنے اپنی فطری دلیری سے کام لیا اور کہا:۔

محسن۔ یا امیر المومنین! بارہا حضور کے زمانے میں میری آزمائش ہو چکی ہے۔ میں نے کیسے کیسے مصائب اٹھائے ہیں۔ کتنی بار اپنی جان پر کھیل گیا ہوں۔ کئی مرتبہ اس اپنے عزیز فرمانروا کے لئے اپنا خون بہایا ہے۔ حضور کو معلوم ہے کہ کیا کیا ملک کی خدمتیں کی ہیں کیا اب بھی میرے خدمات اس قابل نہیں کہ ایک گنہگار کو پناہ دے سکوں اور میری خاطر وہ رہا کردیا جائے لوگوں کے سامنے اسنے مجھسے پناہ مانگی ہے اور وہ محض اس خیال سے کہ میں بھی امیر المومنین کا خاص غلام اور خدمت گزار و جاں نثار ہوں۔ اسے جاں بخشی کی امید نہ ہوتی تو کیوں مجھ سے پناہ کا طالب ہوتا۔ میری حمیت اور غیرت متقاضی نہ ہوسکی کہ ایک جان سے مایوس مجرم یوں حضور کا ایک جاں نثار خادم سمجھ کر طالب اماں ہو، مجھے اپنی نجات کا ذریعہ بنائے اور میں چشم پوشی کروں۔ اس سے بڑھ کر میری اور کیا ذلت ہوسکتی ہے، بہر حال اب تو میں پناہ میں لے چکا اب میں حاضر ہوں حضور جو چاہیں کریں، میرا سر حاضر ہے، جو بارہا حضور پر فدا ہونے کیلئے اس سے پہلے بھی پیش کیا جاچکا ہے۔

محسن کی پُر اثر تقریر اور اُسکے دلائل ایسے نہ تھے جن کو سنکر ایک غیور بادشاہِ اسلام کے دل پر اثر نہ ہوتا، اور اُسکا انصاف ایسے جاں نثار کی خدمت کا اعتراف نہ کر کے حقوق خدمت کو محض آتشِ غضب کی بے پناہ شعلوں میں خاکستر بنا دیتا۔

منصور کے دل میں محسن کی تقریر اپنا کام کر گئی، اسنے گردن جھکا لی، اور دیر تک غور کرتا اور سوچتا رہا، اتنی دیر میں اُس کا غصہ فرو، بلکہ مبدل بہ حلم ہو گیا تھا اب سر اُٹھا کر خلیفہ نے کہا:-

خلیفہ: محسن! جاؤ ہم بھی اُسے تمہاری خاطر پناہ دیتے ہیں اور قصور معاف کر کے رہائی دیتے ہیں مگر اسے تاکید و ہدایت کر دو کہ ہماری مخالفت سے ہاتھ اُٹھائے اور شورش و فساد کا وطیرہ ترک کرے محسن ایسے ہلکے ظرف کا سردار نہ تھا کہ اتنی بات سنکر خوشی کے مارے پھول جاتا اسنے پھر جرأت سے کام لیکر کہا۔

محسن۔ حضور والا! اگر امیر المومنین کا یہ منشاء عالی ہو کہ میری پناہ کا اثر دونا ہو جائے اور لوگ یہ جانیں کہ محسن ایک معمولی آدمی نہیں بلکہ حضرت خلیفہ کا خاص بندۂ کرم ہے تو بہتر یہ ہو کہ اس مجرم کو کچھ اکرام و انعام بھی مرحمت فرمایا جائے، یہ ایسا ہو گا کہ حضور نے جان بھی دی اور مال بھی۔

منصور۔ اچھا ہم اُسے پچاس ہزار درہم بھی عطا کرتے ہیں، اب تو تم اور تمہارا پناہی خوش ہوا۔

محسن۔ یا امیر المومنین۔ خلفاء کے صلے بھی اتنے ہی عظیم الشان ہونا چاہئیں جتنے بڑے اُس کی رعایا کے جرائم ہوں اس شخص کا قصور بہت بڑا ہے۔ لہذا انعام بھی اُسی پلہ کا ہونا چاہئے

منصور۔ اچھا جاؤ، ہم نے ایک لاکھ درہم عطا کئے، ابتو خوش ہوے۔

محسن۔ حضور والا! اسی وقت ملنا چاہئے، بھلائی کے کاموں میں دیر اچھی نہیں۔

درباری محسن اور منصور کی تقریر بڑی حیرت سے سُن رہے تھے، منصور نے حکم دیا کہ اسی وقت روپیہ دیدیا جائے۔

اُسی وقت خلیفۃ المسلمین کے حکم کی تعمیل ہوئی، روپیہ حاضر کیا گیا محسن نہایت متانت اور وقار مسرت و افتخار کے ساتھ روپیہ لدوا کر اپنے گھر کو روانہ ہوا، تمام دربار محو حیرت تھا، کہ یہ کیا معاملہ ہے اور ہر متنفس خوشی سے بیخود و سرشار کہ واہ! اللہ نے ہم کو کس حلیم، نیک دل، منصف مزاج، رعایا پرور

اور حقوق شناس فرمانروا کی رعایا ہونے کی عزت دی ہے اور ہر شخص بزبان حال خدا کی اس نعمت اور عطیۂ گراں پر شکر پیرا تھا۔

محسن نے اپنے گھر پہونچکر اُس باغی خارجی کو جس کا دل امید و یاس کی کشمکش سے مجروح و نیم بسمل ہو رہا تھا جسکی جان انتظار اجل میں آدھی گھل چکی تھی غلبۂ غم سے چہرے پر آثار مُردنی ہویدا تھے، اُس کے خیال کے بالکل خلاف جاں بخشی کا مژدۂ روح افزا سُنایا۔ اور کہا اے شخص لے انعام تجھے مبارک ہو، اب بادشاہوں کے خلاف کوئی کوشش نہ کرنا۔

خارجی پر اس بذل و عطا کا یہ اثر ہوا کہ وہ جانی دشمن ہمیشہ کے لئے خلیفہ کا جاں نثار دوست بن گیا۔ اور خلیفہ کے اخلاق کی یہ داستان آج تک تاریخ کے صفحات پر بصد فخر و مباہات زبان حال سے سُنا کر ہم کو اخلاق کا مبارک سبق دے رہی ہے۔

مسلمانو! خدا تم کو یہ ہوش دے کہ غیر اقوام کی کورانہ تقلید کے بجاے اپنے اسلاف کے اُن زرّیں کارناموں سے سبق حاصل کرو جو تاریخ کی کتابیں اپنے آغوش میں لئے ہوے ہیں۔ اور زمانہ کا معلم تمکو اُن کے یاد رکھنے اور پڑھنے پڑھانے کی تاکید کر رہا ہے +

محوی صدیقی پروفیسر عثمانیہ کالج
اورنگ آباد (دکن)

جذبات مائل

منزل عشق کا تو عزم اور یہ بے نوائیاں، ایک تو دشت خار زار اُس پہ برہنہ پائیاں
میرے ہی دم کے ساتھ ہیں انکی بھی کج ادائیاں عشق نہو تو کیا کریں حسن کی خود نمائیاں
شیخ و فقیہ سے کہو امن کا دور جا چکا اُسکی نگاہ ناز کو آگئیں فتنہ زائیاں
دونوں کے اجتماع نے عشق کا روپ لے لیا کچھ مرے دل کے ولولے کچھ تری دلربائیاں
یہ بھی مقدرات ہیں" خیر بلا سے کیں تو کیں عمر نے بیوفائیاں یار نے کج ادائیاں
مائل نغز گو تجھے داد نہ دیں تو ظلم ہے یہ تری نغمہ سنجیاں یہ تری خوشنوائیاں

مائل

مکالمہ حسن و عشق

شرم کی بات نہیں کچھ تمہیں اپنی ہی قسم
کیا کہا پھر تو کہو اہل وفا تم ہو کہ ہم

آنکھ تو چار کرو میری طرف تو دیکھو
میں بھی کچھ عرض کروں تم تو نہ ہو گے برہم

آج چھیڑا ہے اگر مجھکو تو انصاف ہی شرط
ورنہ جو چاہے وہ کہہ لو تسلیم ہے خم

بےزباں مجھکو نہ سمجھو فقط اتنا ہے خیال
تم خجل ہو گے کروں گا میں اگر ذکرِ ستم

کچھ زباں سے نہ کہا تم نے مرے منہ پہ مگر
تم مبادا ہوے مغموم تو ہوگا کسی غم

مسکراتے ہوے اُس آفتِ جاں نے یہ کہا
جو ترے دل میں ہو کہہ تجھ کو مرے سر کی قسم

عرض کی میں نے کہ غیروں پہ نہیں چشمِ کرم؟
ہنسکے فرمایا یہ سچ ہے تو وفادار ہیں ہم

عرض کی میں نے کبھی چشمِ کرم مجھپہ نہ کی
ہنسکے فرمایا کہ ناداں ہے یہی عین کرم

عرض کی میں نے کیا کیا نہ ستم مجھپہ ہوے
ہنسکے فرمایا کہ "عاشق ہے تو کر شکرِ ستم

عرض کی میں نے میں کس منہ سے کروں شکرِ جفا
بولے "جس منہ سے کہ کہتا ہے مجھے ظلم شیم

عرض کی ہوگا مرا عقدۂ دل وا کب تک
بولے جسوقت کہ زلفوں سے مری دور ہو خم

عرض کی میں نے غمِ عشق ستاتا ہے بہت
ہنسکے فرمایا کہ دے کاش خدا سب کو یہ غم

عرض کی میں نے خطِ شوق کا لکھا نہ جواب
بولے کر شکر کہ تیرے نہ کٹے ہاتھ قلم

عرض کی میں نے "پیوں خونِ جگر میں کب تک
ہنسکے فرمایا یہ جب تک کہ ترے دم میں ہے دم

عرض کی ہجر میں روتے ہوے اک عمر ہوئی
ہنسکے فرمایا کہ اے وائے بحالِ شبنم

قیدِ ہستی سے جو چھٹنے کا کیا میں نے سوال
بولے کچھ دن ابھی رہو اور گرفتارِ الم

عرض کی میں نے کہ ہے حسرتِ پابوس بہت
بولے پھر خاک میں ملیے صفتِ نقشِ قدم

عرض کی رحم کی امید پہ کب تک میں جیوں
بولے اسکے لئے کہہ سکتے نہیں کچھ ابھی ہم

عرض کی بس ہے مجھے ایک محبت کی نگاہ
بولے کس کس پہ کریں ہم نگہِ لطف و کرم

عرض کی میں نے تو کیا رحم نہ کھاؤ گے کبھی
ہنسکے فرمایا کہ ہاں اسکی تو امید ہے کم

عرض کی میں نے کہ ہے بار گراں تن پہ یہ سر
ہنسکے فرمانے لگے تجھ کو مرے سر کی قسم

عرض کی حسن کے جلوے مرے دل میں دیکھو
بولے کیا خوب ترے دل کے بھی محتاج ہیں ہم

عرض کی میں نے یہ سب ہے مری تقدیر کا پھیر
ہنس کے فرمایا کہ پھر کر گلۂ بخت دژم

حسن سبز اب تو ہے مرغوب مجھے میں نے کہا
ہنسکے فرمایا کہ ناداں یہ ترے حق میں ہے سم

عرض کی اب تو جگر میں نہیں اک بوند لہو
ہنسکے فرمایا کہ کر اور خطِ شوق رقم

ڈبڈبا آئے مری آنکھوں میں آنسو تو کہا
تجھے پہنتا ہے انہیں باتوں سے سارا عالم

عرض کی میں نے مرے دل میں ہے گہرا اک زخم
ہنسکے فرمایا کہ پھر ہوگا رہینِ مرہم

عرض کی میں نے شب ہجر ہے بس یا میں ہوں
بولے کر شکر ہے کوئی تو شریکِ غم و ہم

پوچھا دکھلاؤ گے اعجاز مسیحائی کب؟
ہنس کے فرمایا جب آئے گا لبوں پر ترا دم

عرض کی میں نے دم نزع تو آؤ گے ضرور
ہنسکے فرمایا کہ ہاں شاہِ ولایت کی قسم

صدق جائسی

غزل

خلش ہائے محبت کے کہیں نشتر نکلتے ہیں
نکلتے ہیں تو جانِ ناتواں لیکر نکلتے ہیں

حیاتِ جاوداں قربان اُنکی عقل و حکمت پر
جو بزم عشق سے درسِ فنا لیکر نکلتے ہیں

مجھے یہ دھن کہ کچھ بھی ہو مگر میں اُنکو دیکھونگا
اُنہیں یہ ہٹ کہ ہم پردے سے کب باہر نکلتے ہیں

سبق آموز ہے آزاد ہونا، اُن غریبوں کا
جو بیچارے قفس سے جان دے دیکر نکلتے ہیں

الٰہی خیر ہی کرنا مرے صبر و تحمل کی
کہ اب نالے مرے امکان سے باہر نکلتے ہیں

قیامت ہے کہ اُسکی بزم میں ہم ایک حسرت سے
جو حسرت لیکے جاتے ہیں وہی لیکر نکلتے ہیں

تہ شمشیر جب حامدؔ سرِ تسلیم جھکتا ہے،
کہیں پھر جا کے ارمانِ دلِ مضطر نکلتے ہیں

ایڈیٹر

سوزِ محبت

شام کی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ ناز آفریں شاہزادی نازؔ اپنی زہرہ زیب سہیلیوں کے جھرمٹ میں باغ بہشت آفریں میں اُتری، نرگس نے آنکھیں کھول دیں، غنچوں نے مسکرا کر خیر مقدم کیا، اور حسین بلبلیں چہکتی ہوئی پیشوائی کو بڑھیں، شہزادی نازؔ دل گداز سبزہ کو خرام ناز سے پامال کرتی ہوئی آہستہ آہستہ گوہر فروش فوارے کے قریب جا کر سبزہ کی زمردیں چادر پر خاموش لیٹ گئی۔ اُسکی بلوریں پیشانی کی تابش فوارے کی سیمیں تقاطر پر مرتعش تھی، اُسکے بکھرے ہوئے گیسو کھلے ہوئے متجلی شانوں سے گزر کر سبز ملبوس سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے، اُسکی پرتو پذیر آنکھوں میں تاثرات شفق سے ہلکا قرمزی رنگ چھایا ہوا تھا، اور اُس کے فطری انداز بے اختیاری میں ڈوبے ہوئے تھے۔

اُسکے دلفریب رخسار باغِ حُسن کے شگفتہ و شاداب پھول تھے جس پر اُسکی شرگیں آنکھیں مسکرا رہی تھیں، شہزادی نازؔ کی حسین سہیلیوں کے قہقہوں کی گنگا جمنی آوازیں اور پاؤں کے نازک زیورات کی سُنہری جھنکاریں فوارے کے ترشح میں محلول ہو کر ایک روح نواز نغمہ سُنا رہی تھیں!! ہوا کے جھونکوں کے ساتھ شہزادی نازؔ مسکرائی اور دھیمے سروں میں ایک سامعہ نواز راگ چھیڑ دیا۔ شہد کی مکھیاں اُسکی ہم نوا اور اُسکی ہم آواز تھیں، وہ گا رہی تھی اور "بہشت فریب" کا گوشہ گوشہ مترنم اور متبسم ہو رہا تھا، دفعتہً شہزادی کو محسوس ہوا کہ اُسکے نغموں کے ہمراہ کوئی شخص بانسری بجا رہا ہے، وہ رُکی بانسری بھی خاموش ہوگئی۔ اُسکی بلوریں پیشانی پر ایک سیمیں شکن نمودار ہوئی اُسکے متجلی لب مسکرا دیے اور وہ دوبارہ گانے لگی۔

بانسری پھر بجنے لگی اور شہزادی نازؔ کا دل بے چین ہوگیا۔ آخر وہ اُٹھی اور باغ کی گلگوں روشوں سے گزر کر مرمریں احاطہ سے باہر آگئی نقشیں دیوار کے نیچے ایک حسین نوجوان جوگی کھڑا تھا اُسکی سفید اور لانبی انگلیوں میں سُنہری بانسری کانپ رہی تھی جسکے پردوں سے خوش آیند نغمے نکل نکل کر فضا کو مبہوت بنا رہے تھے

وہ بانسری بجا رہا تھا اور اسکی نازک ہستی سراپائے موسیقی و ترنم بنی ہوئی تھی، کیف انگیز آنکھوں میں حسرت کے سُرخ سُرخ ڈورے کھنچے ہوئے تھے اور روشن پیشانی کی نورانی شکنوں سے سستی جیسا سوگ برس رہا تھا۔ نازؔ ٹھٹکی، جوگی کی نگاہیں بلند ہوئیں، آنکھیں چار ہوگئیں اور حسین جوگی زبردست چیخ کے ساتھ نازؔ کے مرتعش قدموں میں آرہا۔

(۲)

حسین شہزادہ نیازؔ مہ فریب شہزادی نازؔ کا شہرۂ حُسن سُن کر اس حُسن کی دیوی کا غائبانہ پرستار بن چکا تھا، وہ شہزادی نازؔ کی شمع حُسن کا نادیدہ پروانہ اور خیالی تصویر کا پجاری تھا۔ سنگلاخ محبت کی دشوار گذار گھاٹیاں اُس کے پائے عشق کے نیچے سے سرسبز چمن کی طرح گزر چکی تھیں، وہ محبت کے تمام مدارج طے کر چکا تھا اُسکی آنکھیں لمعات عشق سے درخشاں اور اس کا سینہ تجلیات محبت سے روشن اور منور تھا اب اُس کا دل اُس جلی ہوئی راکھ سے مشابہ تھا جیسیں صرف ایک چنگاری جھلملا رہی ہو، اس کے سوختہ دل میں ایک تمنا یعنی "دید ناز" روشن اور ضیا پاش تھی، آخر اُس نے جوگی کی شکل اختیار کی اور نازؔ کی بارگاہ حسن میں پہونچ کر سرِ نیاز خم کر دیا۔ نازؔ کے معصوم دل پر محبت کا ایک زبردست تیر پڑا اور کیوپڈ نے ایک کامیاب قہقہہ لگایا جسکی صدائے بازگشت نے نازؔ اور نیازؔ کی آتشِ محبت اور زیادہ مشتعل کر دی نازؔ نے نیازؔ کا "تہدیۂ تمنا" بصد خوشی قبول کر لیا۔ اور دونوں ایک دوسرے کے یکساں دیوانے اور ایک سے پروانے ہوگئے، دونوں کو کائنات عالم میں ایک دوسرے کے جلوے کے سوا کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔

(۳)

آہ! میری دنیا اندھیر، اور میری کائنات میں سوائے تاریکی کے کچھ نہیں۔ میرا دل ہمیشہ کو بے چین اور میری روح روز آخر تک کو ملتہب کر دی گئی۔ میں محروم آرزو اور ناکام تمنا ہوں، میں گل برباد ستم اور غنچۂ پامالِ جفا ہوں۔

اے قدرتوں والے خدا اب میری حالتِ زار پر رحم کر کب تک ایسے ستم سہوں اور کہاں تک یہ درد و غم جھیلوں۔ اُف میری آنکھوں کے سامنے ان دونوں کے درمیان "عہد وفا" ہوگیا اور ناز نے نیاز کا تھدیہ تمنا کس ذوق و شوق سے قبول کرلیا۔ آہ!! اُف!! یہ آنکھیں، یہ ستم، یہ قیامت کبریٰ دیکھنے کو موجود رہیں۔ اُف! وہ شہزادی ناز جس کی محبت کب سے میرے سینہ کو سوزاں اور میری آنکھوں کو گریاں بنائے ہوئے تھی، اس آسانی سے نیاز کی ہوجائے اور یہ حسرت نصیب آنکھیں ناکام و نامراد اس سنجوگ منظر کو دیکھتی رہ جائیں! غضب غضب! ستم! ستم! اچھا! اچھا! میں بھی سمجھا، میں نے اپنا فرض پہچان لیا، میں اُن کے اتفاق کو توڑنے کی پوری کوشش کرونگا۔ اور ہاں کامیاب ہوکر رہوں گا، ناز میرے لئے ہے، وہ میری ہوگی اور میں اُس کا۔ . . . . "

حسین شہزادہ نیاز کا دفا کیش دوست ٹھاسُنسان جنگل کے ایک بے برگ و بار درخت کے نیچے بیٹھا، اپنے عالم خیال سے گفتگو کررہا تھا، وہ استقامت سے مسکرایا اور اٹھ کر تیزی سے گھنی جھاڑیوں کی جانب چل دیا۔

" آہ! نیاز! تم اس بُری طرح علیل ہو۔ نمعلوم تم کیوں بیمار ہوگئے، تم نے مجھے بلایا ہے، بہتر ہے میں جلد از جلد پہونچنے کی کوشش کرونگی اس طول طویل رستہ کو پل مارتے ہوئے طے کروں گی اور میرے نیاز! تمہاری خدمت میں حاضر ہوجاؤں گی۔ آہ! او بیماری کے ظالم دیوتا! تجھی ایسی ہی نازک اور خوشگوار ہستی کو اپنے ستم کے لئے تختۂ مشق بنانا تھا۔ آہ! آہ!

شہزادی ناز مرتفع حوض کے قریب ایک زرنگار کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ دلفریب چہرہ آماجگاہ حسرت اور غزالیں آنکھوں میں آنسو کانپ رہے تھے۔ اس کے بلوریں شانے کو نازک ہاتھ کے لمس سے ایک ہلکا سا جھٹکا لگا اُس نے سر اُٹھایا اور اپنی عزیز سہیلی گاما کی لوچ دار صندلیں کلائی نرمی سے پکڑ کر اُسکی جادو فریب آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

ناز! میری سمجھ میں تو یہی آرہا ہے کہ میں تنہا جاؤں۔ آہ گاما! مجھپر ایک لمحہ ایک سال سے

زیادہ بھاری گزر رہا ہے، اور ایک ایک منٹ کی دیر مجھے بے تاب کر رہی ہے۔
گاما، نہیں شہزادی تنہا نہیں کم سے کم یہ خادمہ ضرور ہمراہ رہیگی" ناز " نہیں وفادار گاما نہیں، میں اکیلی ہی جاؤں گی میں تنہا جاؤں گی، ہاں میں اُس تک اکیلی ہی پہونچوں گی "۔
ناز کے سیمیں جسم کو حرکت ہوئی وہ کھڑی ہوگئی اور دم زدن میں گاما کی نگاہوں سے بجلی کیطرح غائب ہوگئی۔ گاما کے سر میں چکر سا آنے لگا۔ اُسکے کمزور دماغ کے ہیجان نے اُسکے بلوریں جسم کو سراپاے اضطراب بنادیا اُسنے اپنے سفید گول بازو سے ناز کی کرسی پکڑلی اور زمیں پر بیٹھ گئی اُس کے جسم کی رگ رگ میں بجلی دوڑ رہی تھی۔ اُسکی مے گوں آنکھیں سوگوار تھیں اور نازک دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔
" اُف ناز بجلی کی طرح پہونچے گی اور آہ! پھر وہ ہوگا جسکے خیال ہی سے میری رگ رگ سُلگ اٹھتی ہے۔ آہ! اے نیاز کی چشمانِ تحیر نواز! تم نے میرے نازک دل کے ساتھ کیا ظالمانہ برتاؤ کیا اگر نیاز، ناز کا ہونے کو تھا تو تم نے میرے سینہ میں آتش محبت کیوں مشتعل کی! بے رحم نیاز! گاما کے نازک دِل کو بسمل بناکر ناز کو شرف زوجیت بخشنے کا ارادہ ہے۔ اور وہ گاما جس نے اپنا دل، اپنی روح، اپنا خیال تیری اک نگاہ غلط انداز پر صدقے کردیا اس بے دردی سے محروم آرزو کردی جاے گی۔ آہ! میں نے تیری بیماری کی "من گھڑت" خبر اس لئے ناز کو دی کہ وہ میری ہمراہی میں تجھ تک پہونچنے کی کوشش کرے اور میں اُسے ایک دور دراز ملک کے ریگستان کی آتشیں فضا کی نذر کردوں! مگر آہ "تیر از کمان جستہ" اُف میں نے اتنی دیر کردی ہاں جلد چلوں، اور کسی طرح تم دونوں کے مابین نفاق کا بیج بودوں اور نیاز تجھے حاصل کرکے "کامگار آرزو" کا لقب پاؤں "

(۵)

شہزادی ناز جب پہونچی تو اُسکے مخملیں پاؤں صحرائی کانٹوں کی رگڑ سے لالہ زار ہو رہے تھے۔

اُس کا ملبوس پارہ پارہ اور اُسکی عنبر بار زلفیں خاک آلود تھیں اُسکے سیمیں شانوں پر گرد کی ایک تہ جمی ہوئی تھی اور اُسکی صہبائی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے کھنچے ہوئے تھے۔ ناز باغ ارم کے عظیم الشان قصر کے صدر دروازہ کی جانب بڑھی اس باغ میں شہزادہ نیاز صرف ہما کے ساتھ رہتا تھا۔ باغ کے پھاٹک پر ہما خاموش کھڑا تھا، اُس کا جسم ایک آذری مجسمہ سے مشابہ تھا، اور اُسکی سنجیدہ نگاہیں دیوا کے ایک نقش پر منجمد تھیں، ناز کو دیکھ کر وہ آہستہ آہستہ بڑھا اور سر جھکا کر ادب سے پوچھا کیا آپ تنہا تشریف لائی ہیں" ناز" ہما میں کچھ نہیں جانتی، مجھے سب سے پہلے بتلاؤ کہ شہزادہ کا کیا حال ہے، نیاز کہاں ہے، للہ بتاؤ کہ اُس کی علالت نے اب کیا شکل اختیار کی! ہما کاش تیرے لب نیاز کا مژدۂ صحت سنائیں"۔ ہما چونک اُٹھا" نیاز بیمار" وہ بڑبڑایا۔ اُسکی صبیح پیشانی شکنیں نمودار ہوگئیں۔ مگر فوراً ہی چونک اُٹھا۔ اُسکی آنکھوں میں تبسم کی ہلکی جھلک نمایاں ہوئی فوراً ہی اُسکے ہونٹوں پر یاس کی پھپڑیاں جم گئیں، اُسکے آنسو رخساروں پر ڈھلنے لگے۔ اُس نے ایک دردناک آہ کے ساتھ کہا، ہما" آہ شہزادی ناز! . . . . . نیاز . . . . . وہ . . . اب ہم خاکی ہستیوں میں کہاں شہزادی وہ ملکوتی تھا اُسکی مقدس اور پاک روح نے اس ناپاک دنیا میں رہنا پسند نہیں کیا، آہ شہزادی وہ شام بھی ہمیشہ یاد رہیگی۔ جب اس گنج بے بہا کو سپرد خاک کیا اور اس نازک جسم کو منوں مٹی کے نیچے دبا دیا! آہ شہزادی ہم صبر کر چکے تھے مگر آپ کو دیکھکر یہ حادثہ تازہ ہوگیا۔

آہ نیاز! معصوم دل شہزادی نیاز!! اُسکے آنسوؤں کی فراوانی سے حسرت برسنے لگی اور وہ بے تابی سے رونے لگا۔ شہزادی ناز کے ہونٹ اچانک سفید پڑ گئے اُسکی آنکھوں سے آگ کے دو شعلے نکل کر فضا میں منتشر ہوئے "آہ نیاز" کی ہولناک چیخ اُسکے ہلالیں لبوں سے کانپتی ہوئی نکلی اُسکا بلوریں جسم ایکبار کانپا اور پتھر پر زور سے جا پڑا۔ اُسکی نیلی پُتلیاں خانۂ چشم میں زور سے گردش کرنے لگیں اور اُسکی مہ فریب پیشانی کے گرد یاس کا ایک دھندلا ہالہ پڑ گیا۔ ہوا کا ایک سرد جھونکا اس کی نزہت فردوس لٹوں کو پتھر کی سفید سطح پر منتشر کرکے ہوگزرا اور وہ اُس سادہ پھول کی طرح رہ گئی جسکی خوشبو کھیچ گئی ہو۔ . . . . . .

ارم کے باغ کا پھاٹک کھلا اور حسین شہزادہ نیاز پردۂ ابر سے اچانک نکل آنے والے آفتاب کی طرح برآمد ہوا

ہما اپنی بے نور اور کشادہ آنکھیں لئے ہوئے باغ کی دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ اُسکے روشن رخساروں کے گرد غم کا گہرا دھندلکا محیط تھا اور اُسکی حسین آنکھوں میں زمانہ ماضی کی آرزوئیں ایک قطرۂ اشک کی صورت میں کانپ رہی تھیں۔ نیاز نے ایک مستفسرانہ نگاہ اسکی بے نور آنکھوں پر ڈالی اور ایک دردناک آہ کے ساتھ نازکی مرمریں لاش کے قدموں میں جا پڑا۔ اُسکی صہبائی آنکھوں سے ایک شعلۂ سوزاں نکلا۔ اُسکی نازک لبوں پر نیلاہٹ دوڑ گئی۔ ایک بلند آہ نے نیاز کی روح شہزادی ناز کے قدموں کے فردوس عشق میں پہونچا دی اور ایک آبدار آنسو اُس کے مژگان دراز پر کانپتا رہگیا۔ "کاش حسین شہزادی نازمیں تجھے فریب سے ہلاک نہ کرتا اور اُس رحیم شہزادی کو جسکی چشم کرم نے مجھے اتنا بڑا کیا تھا اپنے ہاتھوں سے قتل نہ کرتا، ہما کے زرد ہونٹوں سے نکل رہا تھا۔

(۶)

صحرا کی جانب قدموں کی ہلکی سرسراہٹ ہوئی اور گاما سفید ملبوس میں ایک سوگوار بیوہ کیطرح نمودار ہوئی اس کا چہرہ سفید بادلوں سے مشابہ تھا اُسکی سیاہ آنکھوں میں بجلیاں کوندرہی تھیں اُسکے زعفرانی رخساروں میں دریائے نیل کی طرح خون کا مدوجزر ہورہا تھا۔ اُسکی گنھری اور دراز زلفیں چاروں طرف بے پروائی سے اڑ رہی تھیں اسکی نازک ترین ہستی ایک اُجڑا ہوا باغ معلوم ہوتی تھی وہ آہستہ آہستہ بڑھی، اور اس دلگداز منظر کو دیکھکر دفعتہً ساکت ہوگئی۔ اُسکی بے بصر آنکھیں اس نظارہ پر منجمد رہگئیں اور وہ سراپائے تحیر!! دفعتہً اسکے قدموں کو ہلکی سی جنبش ہوئی وہ بڑھی اور زور سے دونوں لاشوں کے قدموں میں گر پڑی۔ اُسکی آنکھیں کیف طمانیت سے مسکرا اٹھیں اور اُسکی [illegible] زبان آہستہ آہستہ ان الفاظ کو ادا کرنے لگی آہ نیاز! اگر مجھے تیرے اس حسرت نصیب انجام کی خبر ہوتی تو میں ہرگز تیرے حصول کی آرزو نہ کرتی اور بصد مسرت ناز کے سپرد کردیتی۔ آہ! رحمدل شہزادے نیاز! بدنصیب گاما کا قصور معاف کر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تو نے گنہگار اور شرمسار گاما کو بخشدیا کیونکہ میری روح پر ایک سکون آمیز نشہ طاری ہوتا جارہا ہے بیشک تو نے مجھے معاف کردیا ہوگا کیونکہ جس دنیا میں خدا نے مجھ جیسی بدخصلت ہستی پیدا کی ہے اُسی میں تجھ سا رحمدل انسان بھی بھیجا تھا، . . . . . رحمدل شہزادی ناز . سیاہ . دگاما تیرے حضور میں حاضر ہوتی ہے، کاش تیرے لبوں کا ایک ہلکا سا تبسم جو عفو تقصیر کے جوش میں پیدا ہو جائے بے وفا گاما کی سیاہی اعمال دھو ڈالے۔ اچھا اے ناپاک دنیا کی [illegible]! اے صبح کی [illegible] پاش روشنی! اور

اے شام کی نزہت فروش تاریکی گاما کی معافی کی دعا کرنا۔ الوداع اے پُرفن حیلہ جو دنیا الوداع "

(۷)

سنگِ مرمر کا ایک سفید اور سربلند شوالہ باغِ ارم کے شمالی حصہ میں صبح کی روشنی اور شام کی تاریکی کا جلوہ گاہ بنا رہتا ہے۔ اسکے اندرونی حصہ میں دو مرمریں مجسمے صدر میں نصب ہیں جن کے پیچھے حسین گاما کا مجسمہ ساکت کھڑا ہے۔ ان مجسموں کے گلابی لبوں پر قرمزی مسکراہٹ خندہ زن رہتی ہے اور ان کی حیات خیز آنکھوں سے طمانیت برستی رہتی ہے۔

صبح شام ہما ارم باغ کے شرقی کمروں سے نکل کر معبد میں جاتا ہے اور گھنٹوں مجسموں کے سامنے سربسجود رہتا ہے۔

نہیں معلوم کہ اُسنے کتنی مرتبہ ان خاموش مجسموں پر معطر پھول تصدق کئے، کسے خبر ہے کہ اسکی پُرشکن پشیانی اُن کے سامنے کتنے دنوں گھسا کی! کون جانتا ہے کہ اسکی حسرت بار آنکھیں کتنی مدت تک ان کے سامنے اشک انگیز اور گوہر ریز رہیں اور کون واقف ہے کہ اس کے خشک لب ان کے سامنے کب تک عفوِ تقصیر کے ملتجی رہے، یہاں تک کہ انقلابِ زمانہ نے اس کی بہارِ شباب کو خزانِ شب سے بدل دیا اُس کی ناوک فریب کمان ہوگئی، اسکے مرمریں جسم پر جھریاں پڑگئیں، اس کا گلابی رنگ زرد سیاہ آنکھیں سفید، اور صبیح پتلیاں روتے روتے بے نور ہوگئیں اور وہ لذتِ بصارت سے محروم رہ گیا۔ تاہم صبح و شام وہ ایک موٹی گول لکڑی کے سہارے ٹٹولتا ہوا انداز پر معبد میں جاتا اور مقررہ وقت تک پشیمانی فریب میں شائقِ عفو رہتا!! عرصہ تک وہ ملتہب اور مضطرب رہا اور اُسکے اضطراب کو کوئی لمحہ کم نہ کرسکا۔

صبح کی نورانی تاریکی میں ہما معبد میں محوِ گریہ تھا، اچانک اُس نے نازؔ اور نیازؔ کو اپنے پس پشت کھڑا دیکھا نیازؔ نے بڑھ کر اسکی کمر پر ہاتھ رکھدیا اور کہا۔ ہما تیری نجات ہوگئی تونے اتنی جفا کشی کی ہے کہ تمام فرشتے تیرے لئے رو رہے ہیں، اگرچہ تونے اپنی آنکھیں قربان کردیں مگر تیری بصارت احتیاط سے محفوظ ہے۔ اور تیری منتظر ہے نازؔ نے مسکرا کر کہا " بلاشک نیاز سچ کہتا ہے۔ ہما تو دیوتا ہے۔ جلد آ!! ہماری آنکھیں تیرے دیدار کو بے چین ہیں " اچانک ہما خواب سے چونک اٹھا کمرے کی روشنی کی ایک چمک اُسکی بے نور آنکھوں پر پڑی اور

اس کے لب مسکرا پڑے۔

(۸)

صبح کو جب نوکر اپنے مضطرب آقا کی تلاش میں شوالہ میں گئے تو اُسے خاموش مجسموں کے قدموں میں بے جان پڑا پایا۔ بے نور آنکھوں سے طمانیت برس رہی تھی۔ اُسکے سفید بالوں کا جھنڈ ہوا سے ہل رہا تھا اور اسکے لبوں پر تبسم کھیل رہا تھا +

بلقیس جمال

کلام شہید

غضب میں ڈالدیا آپ نے گلے ملکے
یہاں مزاج ہی اب اور ہو گئے دل کے

میں اپنے دل کی اُمنگوں کو آپ روتا ہوں
نکل رہے ہیں اب آنکھوں سے ولولے دل کے

فسانہ ہائے حوادث ہر اک سے کہنا ہے
جواب کے خیر سے پہونچے قریب ساحل کے

کیا ہے قتل اک ایسی نمود ہستی کو
کہ اب مزاج ہی ملتے نہیں ہیں قاتل کے

سر نیاز بھی ہے ساتھ اور کفن بھی مگر
کسی سے سیکھ لوں آداب اُنکی محفل کے

ہم اس مزاج شناسی میں خود کو بھول گئے
مگر نہ اہل ہوے اب بھی تیری محفل کے

شہید! آج زمانہ نے خوب دیکھہ لئے
تماشے آپ کے، الطاف تیغ قاتل کے

شہید مرحوم

محشرستان خیال

کس کو دماغ دید تھا عالم سوز و ساز میں
جب کہ رہین بیخودی میں تھا حریم ناز میں

جسکی صدائے مست سے جھوم رہی ہی کائنات
کون سا نغمہ بھر دیا پردۂ دل کے ساز میں

تیرے اسی کرم پہ ہے میری حیات منحصر
جلوے کی ہیں جو بارشیں حسنِ نظر نواز میں

کہتے ہیں اسکو انقلاب کچھ بھی رہا نہ اب اثر
آہِ جگر خراش میں نالۂ دل گداز میں

دیکھ لے مڑ کے کاش تو اپنی نگاہِ مست سے
کون یہ سجدہ ریز ہے تیرے حریم ناز میں

دیکھا جو تجھکو جلوہ بار سجدہ میں گر پڑا وہیں
کچھ بھی رہا نہ امتیاز عالم سوز و ساز میں

خرمنِ صبر و ہوش کو پھونکدے آج سوزِ غم
کوٹ کے بھر دے بجلیاں نالۂ دل گداز میں

اُسکے فریب حسن سے چاروں طرف تھا اک سکوت
ہوش بھلا تھا کس کو نورؔ اُسکے حریم ناز میں

نورؔ کانپوری

افکار عالیہ

لب تک نہ ہلنے پائیں یہ حال ناتواں ہو
اب ضعف چاہتا ہے دلکی جگہ زبان ہو

نالہ سے پہلے پہونچیں تا عرش دلکی آہیں
رستہ میں ہو مسافر منزل پہ کارواں ہو

جو مدعائے دل تھا اب وہ ہی مدعی ہے
کسکے لئے ہو شیون کس کے لئے فغاں ہو

کیا مورد ستم اب میں عمر بھر رہوں گا
امید سے زیادہ کیوں مجھ پہ مہرباں ہو

اب تک بھی ہوش میں ہوں افسانہ دلکا سن لو
قابو میں پھر نہ میرے شاید مری زباں ہو

آوارگی قسمت صبح وطن بنی ہے
غربت کی شام عالیؔ اب دیکھئے کہاں ہو

عالیؔ صفی پوری

عالمِ تخیل

جب میرے خیالات کی دنیا صرف ایک تخیل پر مصروفِ خیال ہو جاتی ہے تو وہ وقت بھی کیا دلچسپ ہوتا ہے۔ اُس وقت جب کہ میرے تخیلات کا دائرہ سمٹ کر ایک ہی مرکز کی طرف راجع ہو جاتا ہے، تو میرے قلب میں ایک بے نہایت وسعتِ تخیل صرف اسی مرکزی دائرہ میں چکر کھانے لگتی ہے۔

آہ! اُس وقت جب کہ میں اپنے دماغ کو کسی پیکرِ حُسن کے خیالات سے اُس کے نورانی لمعات سے منور اور روشن دیکھتا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرا روں روں اُس کی اِس تخیلِ جلوہ سوزی سے جل رہا ہے۔

اُس وقت میری جان دنیاوی غم و آلام اور مصائب سے چھُٹ کر ایک نہایت ہی وسیع میدان اور پُرفضا بہاریں مصروفِ رقص و خرامِ مست میں محو نظر آتی ہے۔ ہاں ہاں وُہ میری امیدیں ہیں اور میرے دلِ حرماں نصیب کے ارمانوں کی بہار اور آرزوؤں کا انبوہ ہے جو تیرے خیال کے ہمراہ ہے اور وہ تیرے خیال اور میرے دل کے واسطے ایک پنہانی رشتہ ہے، اور میرے رنجور دل کے لئے باعثِ شفا۔ آہ یہ میری جانِ حزیں کے لئے کیمیائے حیات ہے۔

اے حسن کی دیوی تو میرے دل و دماغ کو اپنی نورانیت اور حُسن کی معصومیت سے منور کر دے اے دوشیزہ تو آ اور میرے خوابوں کو زریں بنا دے۔ آہ! تیرا دل فروز، جاں فروغ حُسن میری عملی اور تاریک دنیا کی زندگی کے واسطے چراغِ راہ ہے، میری تاریک اور ظلمت سے معمور دنیا کا اُجالا اور مہتاب ہے۔

اے کہ تو میری جان کی مالک ہے اور میرے دل کے لئے باعثِ تسکیں۔

وہ وقت بھی کیا مسرت سے معمور ہوتا ہے جب کہ تیرا حسن صرف میرے تخیل کے باریک پردہ میں جلوہ نما ہوتا ہے اور اُس کا پرتو میرے دل و دماغ کو روشن کر دیتا ہے۔

آہ! اُسکی روشنی میرے تاریک ارمانوں اور تمناؤں کی دنیا کو روشن بنا کر ایک نا محدود اور بے انتہا میدانِ تمنا میں صرف ایک ہی زریں اور منور پیکر کے لئے گامزن کرا دیتی ہے۔

اے محوِ خرام! تجھے اپنے شباب کی قسم کہ تو اپنی رفتار سے اپنے متزلزل قدم سے اپنی مست خرامی سے اپنی اٹھکیلیوں سے میرے دل کو پامال نہ کر تیرا ہر ہر قدم اُن سوتے ہوئے خیالوں کو جگا دیتا ہے جو دل کی گہرائیوں میں محوِ خواب ہیں، تیرے ہر قدم سے میرے دل میں ایک ہجوم خیال پیدا ہوتا ہے اور تیرے قدموں کے نیچے پامال۔

سیکڑوں آرزوئیں، ہزاروں ارمان پر باندھ کر آتے ہیں اور تیری ایک گردش چشم اُن کو تڑپتا اور بے قرار چھوڑ جاتی ہے۔ تیری ایک نگاہ غلط انداز بے خودانہ طور سے میرے ہر رُویں رُویں سے اپنا خراج نظر وصول کر لیتی ہے۔

تیرے لباس کی وہ خوشبو جو حقیقی طور پر اب خوشبو ہوئی ہے جب کہ وہ تیرے جسم نازک و معطر سے مس ہو کر عطر آگیں ہو گئی ہے۔ ایک آوارہ حُسن کے لئے ایک دور افتادہ کے لئے ایک ایسی محویت ہے جو اسکو ہمیشہ کے لئے بیدار کر جاتی ہے مگر آہ! کون جانتا ہے کہ یہ بیداری کس لئے ہے، اور یہ محویت کیسی؟ !!

اُس وقت جب کہ تیرا حسن مستور کسی للچائی ہوئی نظر والے سے بے اختیارانہ طور پر دوچار ہو جاتا ہے تو وہ تیری شرمگیں آنکھیں، تیری اضطرابی کیفیت ایک حُسن کے شیدا کے سامنے ایک فریضۂ جمال کے روبرو ایک اضطرابانہ حالات سے حسن بے حجاب کا منظر کھینچ دیتی ہیں۔ آہ! کون بتا سکتا ہے کہ حُسن بے حجاب میں کیا لطف ہے، اُف! کون بتا سکتا ہے کہ اُس منظرِ حجاب پوشیدگی کو کیا کہا جائے جسکی آغوش میں ہزاروں ادائیں جسکی کیفیت میں ہزاروں تمنائیں کھیل رہی ہوں خدا ہی جانتا ہے کہ وہ حالت کیا دلچسپ ہوتی ہے جب کہ ایک طرف کیفیت مضطرب سے شرم کھڑی کھلکھلا رہی ہو اور دوسری طرف ایک شان سے کامیابی کھڑی مسکرا رہی ہو

ہاں ہاں !! تیری سریلی اور شیریں آواز میری روح کے لئے باعث افزائش ہے۔ یہ بھی بالکل سچ ہے کہ تیری صدائے دلچسپ میرے دل کی گہرائیوں میں ایک روح ہوکر پہونچتی ہے اور وہاں سے پھر میرے خون میں ملکر میرے سارے جسم کو اپنا ہم نوا بنا لیتی ہے۔

تیری آواز وہ آواز جو کہ ہزاروں نغمات اور لاکھوں ترنمات سے کہیں زیادہ فوری و دلچسپ اثر رکھتی ہے، میرے لئے باعث حیات ہے لیکن خدا کے واسطے اُسکو اپنے خشم سے جس سے کہ عالم کا ذرہ ذرہ خشمگیں آنکھوں سے مجھے دیکھتا ہے اور روے زمین کی ہر شے ختنے کہ میرا دل بھی مجھسے پھر جاتا ہے نہ ہم ساز نہ کر کہ اُس میں میری بربادی کا راز پنہاں ہے۔

تو مجھے دیکھ کہ اسی میں میری حیات معاشقہ کا راز پوشیدہ ہے لیکن للہ! میں تیری خشمگیں آنکھ کی برداشت نہیں کرسکتا کیونکہ تیری آنکھ کا شعلۂ خشم میری جان کے میرے جسم کے جلانے کے لئے کافی اور بہت کافی ہے۔ آہ! تیرا وہ تغافل ظاہری جس پر ہزاروں مصنوعی لطف و کرم نثار ہوں کیا ہی دل خوش کن ہے۔ ہاں وہ تیرا تغافل نہیں بلکہ عین عنایت ہے۔ لیکن میں یہ بات بھی تجھسے نہ کہوں گا کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ تو اس سے بھی احتراز کرنے لگے۔

رحمت ہے اُس وقت و حالت اور کیفیت پر جب کہ میں تیرے ضیا تبسم میں اپنی تاریک روح کو منور دیکھوں اور اُس منظر دلچسپ سے اپنے دل مجروح کو تسلی دے لوں۔

آہ! حقیقت یہ ہے کہ عشق کا علاج اگر ہوسکتا ہے تو یہی! بقول ؎

حالتِ دیدۂ گریاں بہ طبیبے گفتم
گفت یکبار بہ بوس آن دہن خنداں را

کون کہہ سکتا ہے اور کون سُنا سکتا ہے کہ شیرینی اور لذت ستم کیا ہے حالانکہ واقعہ یہی ہے کہ روح کے انبساط اور افزائش کا سر خفی اسی تبسم روح افزا کے لمعات میں مستتر ہے۔

اے تصویر محبت یہ سوال کرنا تجھی سے موزوں اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "تیرا تبسم

کیا معنی رکھتا ہے "کیا یہ آواز خندہ کیا یہ آواز دلفریب اُس دہن تنگ سے جسکو عدم کہتے ہیں نہیں آتی، اگر یہ عدم سے آتی ہے تو کیا یہ معجزہ نہیں ہے۔ ؟

اے حُسن کی دیوی! تیرا صا ئقہ تبسم فضاء عالم کو اپنی دلچسپ آواز سے ایسی آواز سے جو کسی طرح نغمات روح افزا اور زمزمہ سنجی اور خوش لحنی سے کم نہیں جسوقت مملو کر دیتا ہے تو ہوا انتہائے مستی اور خود رفتگی سے سر پٹکنے لگتی ہے اور دنیا کو تیرے اور تیری آواز کے لئے تنہا اور خاموش چھوڑ دیتی ہے اور نظام عالم کی مصروفیتیں تا اختتام صدا بے حس و حرکت ہو جاتی ہیں۔ اے حسن کی شہزادی تیرے اختیارات اتنے وسیع تیرے احکامات ایسے پُر اثر ہوتے ہیں کہ دنیا کی تاریخ تیرے کارناموں کا ادنیٰ مرقع ہے۔

ہاں ہاں!! اے محبوبہ وہ تو ہی ہے کہ نظام عالم تیری عصمتوں تیری عفتوں سے قائم ہے۔ اے صنم خوش لقا! وہ تو ہی ہے کہ تیرے ایک فقرے سے ایک جملے سے بڑے بڑے فلسفی قابل سے قابل حکیم ماہر سے ماہر منطقی اپنے اقوال کو اپنے استدلال کو مسترد کر دیتے ہیں۔ اور تیرے تکلم دلربا کے آگے بصد عجز سر کو خم کرتے ہیں، تیری ہر بات اُنکے آگے وحی کے برابر وقیع اور فرض کے برابر قابل عمل ہوتی ہے۔

جب کبھی کہ تیری آواز پردے اور چلمنوں کے پیچھے سے آجاتی ہے تو مجھے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ آواز فضا میں منتشر ہو کر اپنے ساتھ میرے دل کو بھی پیچیدہ کر کے اُڑا لیجائے گی۔ لیکن جب مجھے ایک تڑپ اور کسک محسوس ہو کر رہجاتی ہے اور میں ایک استعجاب کیفیت میں ششدر رہجاتا ہوں۔ خدا کے واسطے تو ہی بتا کہ یہ کیا ہے ؟

اے پیکر حسن!!! اے مجسمۂ جمال!! اُسوقت جب کہ میں تیرے بالمقابل کھڑا ہوتا ہوں اور میری نظریں کبھی تیرے مصحف رخ اور عذار زیبا پر ہوتی ہیں، اور کبھی تمکنت حسن سے تیرے قدموں پر۔ تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو اِس وقت تاجدار خوباں ہے اور میں ایک

گدائے حسن نیری ہر ادا سے معشوقیت اور محبوبیت ہویدا ہو رہی ہوتی ہے اور میں دیدۂ حسن سے اپنی قسمت پر تفریں کرتا ہوتا ہوں،

اور پھر تو ایک شان برنائیت اور زیبائیت مصروف خرام ہو کر میری نظروں سے اور مجھ سے پوشیدہ ہونا چاہتی ہے .... اُف ... کیا کہوں کہ مجھے کیا محسوس ہوتا ہے، ہاں مجھے اس کے اعادہ سے اس تکلیف کے اُس کرب کے بیان کرنے سے معذور رکھو کہ میں اسے بیان نہیں کر سکتا کہ وہ کیسی تکلیف ہے۔ ہائے وہ دنیا کی تکالیف ایسی ہی برتر ہے جیسے کہ تیرا حسن وجمال دنیا کی خوبصورتی سے۔

اے نازنیں! ذرا ٹھیر کہ میں جی بھر کر تیرا نظارہ بخ کرلوں ارے یہ تیرا جانا نہیں ہے مگر قضا کا بلاوا ہے۔ اے کاش تو ذرا ٹھیرے تاکہ میں اپنے تخیل کو باکام اور مکمل دیکھ لوں۔

ذرا ایک دفعہ اور مڑ کر دیکھ لے .... ہاں ایک بار اور .... آہ! یہ ...... ستم ... اُف! کیا کروں ....

قمر الحسن

بہار باغ

نہ کوئی مدعیِ خوں بہا ہو میرے قاتل سے
قضا شمشیرِ قاتل پر یہ لکھ دے خونِ بسمل سے

خدا معلوم اس پردہ میں کس نے ساز چھیڑا ہے
صدائے نغمہ پیہم آرہی ہے جنبشِ دل سے

اُٹھایا آپ نے اُٹھا، بٹھایا آپ نے بیٹھا
نہ اُٹھا میں کبھی دل سے نہ بیٹھا میں کبھی دل سے

یہ وہ منزل تھی جس میں رات دن کیاں اتری تھیں
سبق لیں آ کے دل والے مرے اُجڑے ہوئے دل سے

وہی بنتا ہے شب کو برگِ گل پر قطرۂ شبنم
اگر آنسو ٹپکتا ہے کوئی چشمِ عنادل سے

کوئی محمل نشیں ممکن ہے اس رستہ سے گذرا ہو
مرے احباب اتنا پوچھ دیتے گردِ منزل سے

ہوا کیا وصل میں روٹھے ہو کیوں ناراض ہو کس سے
شکایت باغ سے ہے یا گلہ ہے باغ کے دل سے

باغ حیدرآبادی

سرابِ الفت

"خداوندا یہ محبت کی مدعی فانی مخلوق کسقدر احمق اور سادہ لوح ہے"۔ (شیکسپیر)

سعید اور نسیمہ دونوں ایک ہی خاندان کے چشم وچراغ، اور ایک ہی سال بلکہ ایک ہی ماہ کی پیدائش تھے۔ کنبہ میں جب لڑکا اور لڑکی ایک ہی زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں تو والدین کی اکثر یہ خواہش ہوتی ہے کہ ابتدا ہی سے اُن دونوں کو منسوب کردیا جاوے۔

سعید کے والدین کے دلوں میں بھی یہ خیال تھا جسکا اسکے والدین نے کبھی تذکرۃً اظہار بھی کیا لیکن طرفین سے صاف طور پر گفت وشنید کی نوبت نہ آسکی۔ سعید اور نسیمہ دونوں اپنے گھروں میں پرورش پاتے رہے۔ دونوں بچے شکل وصورت کے اچھے تھے اور لڑکی اپنے کنبہ کی لڑکیوں میں سب سے زیادہ شکیل اور خوش انداز تھی۔ سعید بھی ابتدا ہی سے ہوشیار اور نیک بچہ تھا اسنے اپنے بچپن کا زیادہ حصہ ننھیال میں بسر کیا تھا۔ اسلئے وہ اپنے ننھیال کے عزیزوں سے زیادہ مانوس تھا۔ سعید کے والد ایک ریاست میں ملازم تھے اور ان کی آمدنی گھر کے اخراجات کے لئے بالکل کافی تھی، لیکن چونکہ دونوں کے گھروں کے خرچ الگ الگ ہورہے تھے اس لئے زیادہ خوشحالی سے بسر نہ ہوتی تھی۔ سعید کے والد ہمیشہ اصرار کرتے رہے کہ اپنے متعلقین کو بھی ملازمت پر لیجائیں اور سب ایک ہی جگہ ملکر رہیں لیکن سعید کی والدہ کو اپنا میکہ اسقدر عزیز تھا کہ انہوں نے اپنا نقصان گوارا کیا اور وہاں سے جانا پسند نہیں کیا۔ ایکبار سعید کے والد رخصت لیکر وطن آئے اور ہوشیار بچہ کی تعلیم وتربیت کی خرابی کو نہ دیکھ سکے، اصرار کرکے اپنے ہمراہ لے گئے ریاست میں جہاں ملازم تھے تعلیم کا بڑا خرچہ تھا، اور پڑھنے والے بچوں کی بڑی سرپرستی اور ہمت افزائی کیجاتی تھی سعید وہاں پہونچکر انگریزی اسکول میں داخل ہوگیا اور خوب محنت اور شوق سے پڑھنے لگا سعید کی والد کو اسکی تعلیم وتربیت کی بیحد فکر تھی اسکول کے علاوہ خانگی طریقہ پر بھی اسکو مذہبی اور اخلاقی تعلیم دیتے رہتے تھے جو اُسکے لئے اسکول کی تعلیم سے زیادہ مفید تھی۔ اور حقیقتاً ماں باپ کے آغوش شفقت میں جو ابتدائی تعلیم وتربیت بچے کو ملجاتی ہے اُس کا مفید اثر ساری زندگی میں نمایاں رہتا ہے۔

ایسی تعلیم سے ماں باپ کی اخلاقی خصوصیات پیدا ہوئی ہیں۔ مذہب کی محبت اور جوش اُس کے دل میں اس سے جاگزیں ہوتا ہے۔ تنہا اسکول کی تعلیم بچوں کے لئے ہرگز کافی نہیں، عام طور پر دیکھا گیا کہ جن بچوں کو گھر کی ابتدائی تعلیم نہیں ملی اُن میں آگے چلکر بہت سی اخلاقی برائیاں پیدا ہوگئیں عزیزوں سے بیگانہ، مذہب سے بھی بے پروا ہو گئے، اور نفسانیت اور خودغرضی میں زیادہ ہو گئے سعید کی خوش قسمتی تھی کہ اپنے والد کی زیر تربیت رہ کر اسکو کچھ تعلیم اخلاقی اور مذہبی ملگئی، جسکا اثر اس میں اب بھی نمایاں ہے۔ مگر افسوس کہ سعید زیادہ دنوں تک اُس حقیقی تعلیم سے مستفید نہ ہوسکا وطن کے آنے سے دو سال بعد ہی اُسکے والد کو ایک دور و دراز سفر کرنا پڑا اور وہیں اُن کا انتقال ہوگیا۔ سایۂ پدری کا سر سے اُٹھ جانا اولاد کے لئے اکثر تباہی کا مرادف ہوتا ہے۔ اور سعید کی زندگی میں بھی یہ واقعہ بڑا انقلاب پیدا کردیتا لیکن اُسکے والد کی نیک نیتی اور بزرگی کا اثر تھا کہ خدا نے اُسکے مختصر خاندان پر اپنا فضل رکھا اور اسکے شیرازہ کو منتشر نہ ہونے دیا۔ سعید کے بڑے بھائی نے جو گریجویٹ ہونے والے تھے اپنی تعلیم کو نامکمل چھوڑکر اپنے کنبہ کی سرپرستی اور کفالت اختیار کی اور اُسی ریاست میں ایک معقول عہدہ پر ملازم ہوگئے۔ سعید کی زندگی میں بظاہر حالات کوئی تبدیلی نہیں ہوئی صرف اسکی طبیعت پر اس صدمہ کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ وہ ان کے انتقال کے بعد زیادہ نرم دل اور مسکین ہوگیا اور عرصہ تک اس سے متاثر رہا۔ سعید کی والدہ اور بہنیں والد کے انتقال کے بعد خود بھی وطن رہی تھیں اس پر بھائیوں کی جدائی کیوں نہ بیقرار کرتی۔ بڑے تقاضے اور اصرار سے بھائیوں کو بلایا اور ان کے دیدار سے آنکھوں کو ٹھنڈا کیا۔ سعید تقریباً تین ماہ وطن میں رہا، اب اُسکی عمر کا تیرہواں سال تھا، اور چودھویں صدی کے بچے اس عمر میں خاصے سمجھدار ہوجاتے ہیں اور سعید تو نہایت ذہین اور بہتر بچہ تھا، انگریزی کے ساتویں درجہ میں پڑھ رہا تھا، وہ کیوں نہ باشعور اور سمجھدار ہوتا۔

یہی زمانہ تھا کہ سعید کے معصوم دل میں نسیمہ کا خیال پیدا ہوا۔ سعید نے نسیمہ کا ذکر اکثر سنا تھا وہ یہ کہ وہ دونوں ہم عمر ہیں اُسکے کان اپنے والد مرحوم کے اُس خیال سے بھی آشنا تھے۔ ان باتوں کے ساتھ وہ جب کبھی نسیمہ کا نام سنتا تو اُسکے دل میں ایک گدگدی سی پیدا ہوجاتی تھی اُسے وہ

نام خود بخود اچھا معلوم ہوتا تھا۔ سعید کو زیادہ تر ننھیال میں رہنے کا اتفاق ہوا ددھیال کے عزیزوں سے وہ ناآشنا تھا اور سلسلۂ اسکول اب تک نسیمہ کے دیکھنے کا اتفاق نہوا تھا۔ اور نہ اُس نے کبھی اُسکی خواہش کی اُس دوران قیام میں اتفاق سے ایک تقریب کے سلسلہ میں اپنے ددھیالی عزیزوں میں جانے کا موقع ملا، اور وہاں اُسنے پہلی مرتبہ نسیمہ کو دیکھا نسیمہ گو اُسکی ہم عمر تھی لیکن اُس سے عمر میں بڑی معلوم ہوتی تھی۔ ویسے بھی لڑکے اور لڑکی کی نشو و نما میں فرق ہوتا ہے۔ لڑکیاں لڑکوں سے جلد ہوش سنبھال لیتی ہیں جس عمر میں لڑکے بچے اور ناسمجھ خیال کئے جاتے ہیں اس عمر کی لڑکیوں سے کہیں زیادہ ہوش اور سمجھ کی توقع کی جاتی ہے نسیمہ طبیعت کے لحاظ سے سعید سے مختلف تھی سعید کے مزاج میں سنجیدگی اور تکلف زیادہ تھا۔ اور نسیمہ اتنی ہی شوخ اور تیز طبیعت تھی۔ باوجود اس اختلاف طبیعت کے خدا معلوم کیوں سعید کو اُس سے اسقدر غیر معمولی اُنس پیدا ہوگیا کہ وہ گھنٹوں نسیمہ کے یہاں بیٹھا۔ سب بچے ملجاتے۔ سعید سے کہانیوں کی فرمائش ہوتی اور اُسکی کہانیاں سب شوق اور دلچسپی سے سنتے تھے، سعید کو بڑے اچھے قصے یاد تھے جو اُس نے انگریزی کتابوں میں پڑھے تھے نسیمہ بھی اُن کو بڑی دلچسپی سے سنتی تھی۔ اکثر وہ اثنائے قصہ میں اپنی مخصوص شوخی طبع کے ساتھ سعید کو چھیڑتی اور وہ ایسے موقع پر خاموش ہو جاتا تھا۔ ہفتہ بھر سعید کا وہاں قیام رہا۔ اور اس عرصہ میں سعید کے دل میں نسیمہ کے خیال نے اُنس سے ترقی کر کے محبت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مگر سعید ابھی کم عمر تھا۔ اسکو اس کا احساس نہ ہو سکا۔ وہ یہ جان سکا کہ یہ بچے اور طفلانہ جذبات جن کو آج وہ نہایت سادگی کے ساتھ اپنے دل میں جگہ دے رہا ہے کسی وقت جا کر اُسکے لئے انتہائی جانکاہی اور کلفت کا باعث ہونگے۔ سعید کا دل تو وہاں سے آنے کو نہ چاہتا تھا لیکن مجبوراً اُسکو واپس آنا پڑا۔ سب بچوں کو اسکے جانے کا کم و بیش رنج ہوا جس سے خود نسیمہ بھی مستثنیٰ نہ تھی، اکثر وہ سعید اور اُسکے دلچسپ قصہ کو یاد کر کے اپنے بہن بھائیوں میں اُن کا ذکر کر لیا کرتی تھی۔

سعید وطن سے واپس چلا گیا اور جاکر اپنی تعلیم میں مصروف ہو گیا، گو اُسکا ماحول بدل چکا تھا تعلیمی مشاغل بھی درپیش تھے۔ بہت سی دلچسپیاں تھیں کھیل کود وغیرہ کی مہیا تھیں لیکن نسیمہ کی یاد اُسکے دل سے نہ جاتی تھی۔ وہ اکثر اُس کا خیال کرتا۔ کبھی کبھی کتاب پڑھتے ہوئے جب اُس کا خیال آتا تو کتاب بند کر دیتا۔ اور کچھ متفکر سا ہو جاتا۔ کچھ دیر اُسکی یہ حالت رہتی اور پھر پڑھنے میں مشغول ہوجاتا

رفتہ رفتہ سعید کو وطن کی یاد کم ہونے لگی اور نسیمہ کا خیال بھی اُسکے ساتھہ کچھ کم ہوگیا۔

دو سال بعد سعید کو پھر وطن جانے اور نسیمہ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ نسیمہ کی حالت میں بڑی تبدیلی ہوگئی تھی، وہ کسی طرح آزاد اور بے تکلف نہ تھی اُسکی شوخی میں بھی متانت کا رنگ پیدا ہوگیا تھا۔ وہ سعید سے عزیزانہ محبت اور اُنس کے ساتھہ ملی اور اُسکے برتاؤ سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ سعید کے ساتھہ اُسے کچھ زیادہ خصوصیت ہے۔ سعید خود بھی اُس سے بے تکلفی کے ساتھہ نہ مل سکا۔ اور تقاضاے عمر کے لحاظ سے بھی یہ مناسب نہ تھا۔

شریف گھرانوں میں جب لڑکے اور لڑکیاں سمجھدار ہوجاتے ہیں تو گھر کے بڑے اُنکی باہمی بے تکلفی خلاف احتیاط سمجھتے ہیں۔ اس مرتبہ کے قیام میں سعید، نسیمہ سے چند بار ہی ملا۔ لیکن اُسکی نگاہوں سے کچھ ایسے شوق و محبت کا اظہار ہوتا تھا کہ بعض وقت نسیمہ بھی اُس سے متاثر ہوکر کچھ شرما جاتی تھی سعید کچھ روز قیام کے بعد پھر واپس ہوگیا۔ اور اپنی تعلیم میں مصروف ہوگیا۔ نسیمہ کی محبت اب اُسکے دل میں غیر معمولی طور سے نشو و نما پا رہی تھی۔ اور وہ خدا جانے کن کن تمناؤں میں اور امیدوں کے ساتھہ اُسکی آبیاری کر رہا تھا۔ وہ کسی آنے والے خوشنما دن کا منتظر تھا۔ اور بظاہر اُسکو کوئی نا امیدی کی وجہ بھی نہ تھی۔ اکثر وہ خدا سے دعا کرتا کہ خدایا نسیمہ کو میری شریک زندگی بننے کے لئے مخصوص کردے۔ اُسکے خیال میں نسیمہ ان تمام خوبیوں کا مجسمہ تھی جنکو وہ صنف لطیف کی ایک فرد میں دیکھنا چاہتا تھا، وہ اس مجسمہ کی پرستش کرنے کے لئے تیار تھا، لیکن فی الحقیقت سعید محبت کی رسم و راہ سے ناواقف تھا، ورنہ وہ اس قدر سادہ دلی کے ساتھہ مطمئن نہ رہتا۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ قسمت کا راستہ کبھی صاف اور بے خطر نہیں ملا۔ راہِ محبت کو ہزارہا مصائب اور خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، دنیا میں بہت کم سچی محبت بار آور ثابت ہوئی ہے۔

سعید انٹرنس کی تیاری کر رہا تھا، اور اپنے کلاس کے ممتاز طلبا میں اُس کا شمار تھا اسکی کامیابی بھی بالکل یقینی تھی، امتحان کے چند ماہ باقی تھے کہ اسکے خاندان میں ایک نہایت حسرتناک واقعہ ہوا جو سعید کے لئے پیام مصیبت سے کم نہ تھا، رضیہ جو اُسکے رشتہ کی بہن تھی ناگہاں نمونیا میں مبتلا ہوئی اور چند ہی دن میں ختم ہوگئی۔ سعید رضیہ سے بہت مانوس تھا! در رضیہ بھی اس سے بہت

ہمدردی، شفقت اور محبت سے پیش آتی تھی، سعید کے دل پر اُس کے مرنے کا بہت صدمہ ہوا اور عرصہ تک وہ اُس سے متاثر رہا۔ رضیہ مرحومہ اپنے خاندان ہی میں ایک نہایت قابل گریجویٹ سے منسوب تھیں۔ جو اسی سال وکالت کا امتحان دینے والے تھے۔ اور جنکے انتظار میں انکی شادی ملتوی ہو رہی تھی۔ رضیہ کی اس جواں مرگی نے دنیا کی بے ثباتی اور بے کیفی کا کس قدر حیرت انگیز ثبوت دیا۔ سعید ان معاملات میں بیحد اثر پذیر طبیعت رکھتا تھا، وہ قدرت کی اس بے نیازی کو دیکھکر لرز گیا اسنے خیال کیا کہ آہ انسان کی زندگی کسقدر اتفاقی اور ناپائدار ہے اسکی تمناؤں اور آرزوؤں کی بنیادیں کیسی کمزور ہیں۔ زمانہ کی ذراسی ستم ظریفی اسکے مستقبل کی روشنی مسرت کو یاس و حرمان کے طوفان غم کے ساتھ کسقدر جلد بدل دیتی ہے۔

مرحوم رضیہ کی نسبت جس سے ہو رہی تھی وہ اُس سے پروانہ وار محبت کرتا تھا اور خود رضیہ کو بھی اُس سے اتنی ہی محبت تھی۔

اُن کے مرنے سے اس بدنصیب کی کیا حالت ہوگی جو صرف رضیہ کی آرزو میں زندہ رہنا چاہتا تھا، وہ اپنے مستقبل کو محض اسلئے خوشگوار بنانا چاہتا تھا کہ وہ رضیہ کے مستقبل سے وابستہ ہے رضیہ کا خیال اسکے دل میں تمناؤں کا ایک طوفان برپا کر دیتا تھا۔ اور رضیہ اُسکی زندگی میں سب سے زیادہ محبوب چیز تھی، سُنا گیا ہے کہ مرحومہ کے انتقال کے بعد اسکی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی۔ اہل خاندان کو فکر پیدا ہوئی کہ جلد سے جلد اسکی دلشکستگی اور افسردگی خاطر کو دور کرنے کا سامان کیا جائے۔ ورنہ ایک روز اسکی زندگی سے ہاتھ دہونے پڑیں گے۔

ڈاکٹروں نے بھی اسکی عام صحت کی طرف تشویش ظاہر کی۔ تبدیل آب و ہوا اور سیر و تفریح کا مشورہ دیا گیا، مگر رضیہ کی موت کا صدمہ اسکے دل سے کم نہ ہوتا تھا، باوجود تمام تدابیر کے اُس کی صحت اور حالت درست نہ ہو سکی۔ بالآخر خاندان کے بزرگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کی شادی کیجائے اور جلد کیجائے۔ تاکہ مرحوم رضیہ کے مرنے کا صدمہ جو اس کے دل پر ہے اس میں تخفیف ہو اور اسکی طبیعت میں سکون پیدا ہو، شرقی خاندانوں میں بزرگوں کا حکم بالکل ناطق ہوتا ہے۔ نوجوانوں کی قسمت کے فیصلے بھی بالکل اُن کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ اور جب ایکبار وہ صادر ہو جاتے ہیں تو پھر

سے پر نظر ثانی کی بھی توقع نہیں ہوسکتی۔ قسمت نے اس موقع کے لئے خاندان ہی میں ایک لڑکی کو طیار کر رکھا تھا اور جو ہمہ صفت موصوف تھی، قرعۂ انتخاب نسیمہ کے نام پر پڑا۔ زمانہ کی نیرنگیاں کیسی عجیب و غریب ہیں۔ ایک ہی واقعہ ہے جو ایک شخص کے لئے انتہائی خوش نصیبی کا موجب ہوتا ہے۔ اور دوسرے شخص کی امیدوں اور آرزوؤں کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ گفت و شنید کے تمام مراحل چند ہی روز میں طے ہوگئے۔ لڑکی تو شریف خاندان کی ایک بے زبان ہستی تھی اسے بھلا چون و چرا کا کیا موقع تھا۔ خود لڑکے کو جو اپنی محبوب منسوبہ کی یاد میں زندگی گزارنا چاہتا تھا بزرگوں کے حکم سے سرتابی کی مجال نہ تھی۔ نسبت طے ہوگئی، اور دفعتاً خاندان میں مشہور ہوئی۔ بلکہ کچھ روز بعد تاریخ شادی کا بھی تعین ہوگیا

سعید رضیہ کے انتقال کے بعد ہی سے سمجھ رہا تھا کہ اسکو جلد ہی ایک اور بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑیگا، اس نے اس خبر کو بڑی عجیب افسردگی اور خاموشی کے ساتھ سنا، اسکی خرمن آرزو کے لئے یہ خبر ایک برق بلا تھی جسنے ایک لمحہ کے اندر اسکے تخیل کی اس خوشنما عمارت کو برباد کر دیا۔ جسکو اُس کا محبت بھرا دماغ کئی سال سے تیار کر رہا تھا۔ بقول غالب۔

بس ہجوم نا امیدی خاک میں ملجائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ لاحاصل میں ہے

سعید کا اس صدمہ سے جو حال ہوگا وہ ظاہر ہے، اب تک تو اُس نے اپنی محبت کو پوشیدہ رکھا تھا کسی متنفس کو یہ گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ نسیمہ سے اسقدر مجنونانہ محبت رکھتا ہے۔ نسیمہ کی تصویر اُسکے صفحۂ دل پر نقش ہے۔ سعید نے اپنے بے تکلف اور عزیز ترین دوستوں سے بھی کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ محبت کو بالکل ایک روحانی قوت سمجھتا تھا۔ جس کا اثر خاصتاً صرف محبوب تک پہونچنا چاہئے اُس کے خیال میں محبت کو اظہار کی ضرورت نہ تھی۔ خود نسیمہ بھی اپنی اس سحر انگیزی سے اتنی ہی بے خبر تھی۔ اُسکو یہ احساس پورے طور پر نہ تھا کہ اُس نے سعید کے پُرسکون دل میں کیسا تلاطم پیدا کر رکھا ہے اور سعید کو اُس سے کس درجہ الفت اور محبت ہے۔ یہ تو ضرور ہے کہ وہ محسوس کرتی تھی کہ سعید سے اُسکو ایک قلبی تعلق اور دلی موانست ہے لیکن اس شوریدگی اُلفت سے وہ ناواقف تھی۔ اسے یہ کیا معلوم تھا کہ سعید نے اکثر راتیں اسکے خیال میں اختر شماری کر کے بسر کی ہیں اسکے خطوں کو آنکھوں سے لگایا ہے اور اُسکے الفاظ کو آنسوؤں سے تر کیا ہے

نسیمہ کی تحریریں جو اسکو اتفاقاً کہیں ملگئی ہیں وہ اُن کو بحفاظت بطور یادگار چیزوں کے رکھتا ہے ۔ اسے کیا خبر تھی کہ اسکا رومال جو اتفاق سے سعید کے ہاتھ لگ گیا تھا اُسکی عزیز ترین چیزوں میں شمار ہوتا ہے جسکی زیارت اور تقبیل وہ روزانہ اپنا فرض سمجھتا ہے ۔ اگر نسیمہ محبت کی اس کارفرمائی سے واقف ہو جاتی ۔ تو اس درجہ خالی آزادی نہ رہ سکتی ، اور غالباً وہ اس بے زبانی اور بیچارگی کے ساتھہ اپنی قسمت کے فیصلہ کو بھی تسلیم نہ کرتی ۔ لیکن یہ اک خیال ہے ، ممکن ہے کہ صحیح ہو ۔ خود سعید کا خیال یہ نہ تھا ۔ وہ سمجھتا تھا کہ نسیمہ کو اسکی آشفتہ سری کا ضرور احساس تھا ، اور اُسکے عقیدۂ کشش محبت کے مطابق اُسے ہونا بھی چاہئے تھا ، اُس کا قول تھا کہ ”محبت خود اپنا رستہ پیدا کرتی ہے“ اُسے جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو اس نے نسیمہ کو بالکل بے بس اور لاچار خیال کرکے قطعی الزام نہیں دیا ۔ بلکہ وہ اس اضطرابی کیفیت کیساتھہ جس میں انسان کا توازن عقلی قائم نہیں رہتا ، تیار ہو گیا کہ سوسائٹی کے اس ناحق فیصلہ کے خلاف علم بغاوت اُٹھائے اور حتی المقدار صدائے احتجاج بلند کرے ۔ مگر جب اسکے جذبات میں سکون پیدا ہوا اور طبیعت کا ہیجان کم ہوا تو اُس نے صورت معاملہ کی پیچیدگیوں پر غور کیا ۔ اور اپنی بیچارگی نسیمہ کی بےبسی اور اپنی اس اضطراری حالت ، سوسائٹی کے قوانین ، اور سوسائٹی کے رسم ورواج حکومت کی آہنی زنجیروں سے زیادہ سخت ہیں ، اُن کی دیواریں قیدخانوں کی دیواروں سے زیادہ مستحکم ہیں ۔ حکومت کے احکام سے سرتابی ممکن ہے ، لیکن سوسائٹی کے فیصلہ سے سرتابی نہیں ہوسکتی ، بدنامی رسوائی اور انگشت نمائی ۔ اور تمام اخلاقی سزائیں وہ برداشت کرسکتا ہے اگر اُس کا تعلق محض اُسکی ذات سے ہوتا ۔ مگر افسوس کہ وہ تنہا کچھہ نہیں کرسکتا ۔ وہ اپنی زندگی کا مختار ہے ۔ لیکن ایک دوسری ہستی کی مستقبل کے انتخاب کا اُسکو کچھہ حق نہیں ، وہ اپنے ہیجان جذبات میں اپنی آنکھوں سے جوئے خوں بہاسکتا ہے لیکن ان جذبات کا اظہار وہ اخلاقی حیثیت سے نہیں کرسکتا ، اگر اُس اظہار سے دوسرے کی عزت وآبرو پر حرف آتا ہو ۔ محبت خود کوئی قابل اعتراض چیز نہیں اگر وہ خالص اور قلبی ہے ، محبت واردات قلبی کے پاک مجموعہ کا نام ہے ۔ وہ ایک روحانی کشش ہے جس کا تعلق ذوق نظر اور بصیرت کے ساتھہ ہے ۔ محبت ایک امانت الٰہی ہے جو انسانی روح کو ودیعت کی گئی ہے ، سچی محبت جسمانی تعلق سے بے نیاز ہے ۔ دو سچے قلوب

بغیر جسمانی قربت کے بھی محبت کر سکتے ہیں۔ محبت"

یہ خیالات تھے جو سعید کے ناکام تمنا دل کے ساتھ سکون واطمینان بخشی کا باعث ہوئے۔ "میں نسیمہ سے اب بھی محبت کر سکتا ہوں۔ اس میں جسمانی تفریق مانع نہیں۔ وہ قائم رہ سکتی ہے اور رہیگی کیونکہ اس کا تعلق قلب روح کے ساتھ ہے نسیمہ اب دوسرے شخص کی منسوبہ ہے، اسکی شادی بھی ہو جائیگی اور خدا کرے کہ یہ شادی اسکے لئے ہزاروں دنیوی برکتوں کا باعث ہو لیکن میری پاک اور سچی محبت کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔

کیا یہ ممکن ہے کہ نسیمہ بھی مجھسے ایسی ہی محبت کرتی رہیگی، میرے عمیق و پر تاثیر جذبات کا اثر فضا میں جذب ہو کر اس تک پہونچتا رہے گا، محبت کس قدر پرکیف ہو جاتی ہے جب کہ محبوب کے دل میں بھی اسکے جذبات اسیطرح موجزن پائے جاتے ہوں۔ مگر ہاں مجھے اسکی حاجت ہے۔ میری محبت کوئی غرض نہیں ہوگی میں محبت کا تبادلہ محبت بھی نہ چاہوں گا، میں نسیمہ کی مطمئن قلب و دماغ کو اپنی آشفتہ سری کے اظہار سے بے چین کرنے کی کوشش نہ کروں گا۔ اور اگر میں ایسا کروں تو میں ایک اخلاقی گناہ کا مرتکب ہونگا۔ کیونکہ نسیمہ اب آزاد نہیں۔ اسکی زندگی میں انقلاب ہو گیا اسکی محبت بھی منقسم ہو جائے گی۔ اور مجھے اس میں سے اخلاقی طور پر کوئی حصہ نہ ملنا چاہئیے" سعید اس پریشان خیالی میں منہمک تھا کہ اس کا خیال سوسائٹی کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اس نے عالم بے تابی میں کہنا شروع کیا۔

" لیکن۔ آہ! سوسائٹی نے مجھپر کیسا ظلم کیا اسکی ناحق شناسی اور ستم ظرازی کسقدر جانسوز ہوتی ہے اسکی آہنی زنجیریں آزاد روحوں کو ابدی قید میں کس طرح مقید کر دیتی ہیں، اسکے فیصلے خود سری زور ظلم و ستم کے کیسے افسوسناک مرتفع ہوتے ہیں۔" وہ دوسروں کی آنکھوں سے ہمارے لئے محبوب کا انتخاب کرنا چاہتی ہے" اگر یہی ستم ظرازیاں قائم رہیں اور اسکے فیصلے ایسے ہی غلط ہوتے رہے تو سمجھ لو کہ اسکی تہذیب کی دیواریں سطح آب پر کھڑی ہوئی ہیں۔ اسکا ایوان تمدن شکستہ ہو کر تباہ ہونے کے قریب ہے لیکن ابھی موقع ہے کہ اسکی اصلاح ہو سکے قبل اسکے کہ آنے والی نسلیں اسکے منہدم نشانات سے عبرت حاصل کریں

ور تاریخ اُس کا فسانہ سناے۔

سوسائٹی کے رسم و رواج کا قوم کی زندگی اور اخلاق پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ قومی زندگی کے قیام کیلئے
ن کی اصلاح ناگزیر ہے۔ ہماری تہذیب دیرینہ تنگ خیالی اور تعصب کے خیالات سے اثر پاکر تاریک ہے
ہر درت ہے کہ رفتار زمانہ کے ساتھ اسکی رسم و رواج میں اور طریقۂ معاشرت میں معقول اصلاحیں ہوتی رہیں اُنکے
وامین کو زیادہ وسعت نہیں دی جاے گی۔ اُن کو جذبات انسانی کا احترام کرنا پڑے گا۔ وہ قلبی حیات کا
پاس کرنے پر مجبور ہوگی۔ انسانوں کے لئے شریک زندگی کا انتخاب خود اُنکی آنکھیں کرینگی۔ جس سے دنیا میں
لیسے افسوسناک واقعات نہ پیدا ہو سکیں گے۔ یہاں پہونچکر اُسنے یہ شعر پڑھا۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی ''

ان واقعات کو کئی سال گزر گئے ہیں وہ باتیں اب افسانہ ہوگئیں۔ سعید نے دوسرے
سال انٹرنس پاس کیا اور اب ایک مشہور کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اسکے مزاج میں بہت کچھ
افسردگی پیدا ہوگئی۔ اُسنے شادی نہ کرنے کا تہیہ کر لیا تھا مگر اب نہیں معلوم وہ کہاں تک قائم ہے۔ کبھی کبھی
اُسکے دوست اُسے چھیڑ کر گذرے ہوے واقعات کو تازہ کر دیتے ہیں اُس وقت وہ گزشتہ زمانہ کو یاد کرکے
عجب حسرت سے غالب کا یہ مشہور شعر پڑھتا ہے ؎

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوے

نسیمہ اپنی متاہل زندگی میں مطمئن ہے۔ وہ اپنے عزیز شوہر کی مطیع الامر ہے اور باوفا بیوی ہے
اُسکو سعید سے اب بھی وہی خصوصیت چلی جاتی ہے۔ لیکن سعید کے دل میں محبت کی وہ ہنگامہ آرائی باقی
نہیں۔ مرور ایام نے ان کو سرد کر دیا ہے۔ وہ جب کبھی نسیمہ کو دیکھتا ہے تو گزشتہ باتیں خواب پریشاں کی طرح
اُسے یاد آجاتی ہیں۔ نسیمہ کو اب تک بھی اُس ہیجان جذبات اور پریشانی کی خبر نہیں۔ جو کسی زمانہ میں سعید
کے دماغ میں طوفان تخیل برپا کر دیا کرتی تھی۔ میں جب سعید کی سرگزشت پر خیال کرتا ہوں تو بیساختہ انسانی
فطرت کے ماہر پروفیسر شیکسپیر کا یہ قول یاد آجاتا ہے "خداوندا! یہ محبت کی لالچی فانی مخلوق کسقدر احمق ہے"۔

(محمد حسن صاحب تقی (بی۔ اے))

اقوام کا عروج

یہ عام طور پر مشہور ہے کہ اولاد مجموعی طور پر اپنے والدین سے مشابہ ہوتی ہے لیکن تفصیل میں اختلافات پائے جاتے ہیں، مثلاً ایک بچہ اپنے باپ سے ضرور مختلف ہوتا ہے اور دونوں ہستیاں کبھی بالکل یکساں نہیں ہو سکتیں۔ اختلافات کے دو اقسام ہوتے ہیں، فطری اور اکتسابی۔ فطری اختلافات قدرت کے ہاتھوں سے پیدا ہوتے ہیں اور یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ فطرت کا مقتضیٰ یہی ہے کہ بچہ اپنے باپ سے مختلف ہو قد میں فرق ہو یا رنگت میں جسم میں فرق ہو یا صورت میں۔ بخلاف اسکے اکتسابی اختلافات ان واقعات کے تحت میں ظہور پذیر ہوتے ہیں جو باپ اور بیٹے کی زندگی پر موثر ہوں ماحول کے اثر سے بیٹا اپنے باپ سے لمبا ہو سکتا ہے یا چھوٹا۔ موسم کے اثر سے رنگت میں سیاہی آسکتی ہے یا سفیدی۔

قدیم سائنس داں خیال کرتے تھے اور عوام کا اب بھی خیال ہے کہ باپ جو خصائل اختیار کر لیتا ہے وہ اولاد میں فطری طور پر منتقل ہو جاتی ہیں۔ اگر باپ کسی ورزش سے قوی یا کسی حادثہ سے مضروب ہو جائے تو اولاد میں اسکی قوت یا ضعف کا اثر کسی نہ کسی حد تک نمودار ہو جائے گا۔ اور اولاد کا باپ سے زیادہ قوی یا باپ سے زیادہ ضعیف ہو جانا ایک فطری امر شمار کیا جائے گا۔

اس مسئلہ پر جس قدر غور و فکر کیجائے اُسیقدر اس خیال کا غلط ہونا ثابت ہوتا جاتا ہے مثلاً صدیوں سے نوع انسان نے چلنا۔ بولنا اور بہت سی باتیں سیکھ لی ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی باپ سے اولاد میں وراثتاً منتقل نہیں ہوتی۔

واقعہ یہ ہے کہ حافظہ کی ترقی اور خاصہ بہائمہ کی کمی کے سبب انسان ؟ بمقابلہ دوسرے جانوروں کے فطرت پر کم دارومدار رکھتا ہے اور اکتساب کی اسکو بہت ضرورت ہے۔ ہر بچہ کو وہ تمام کام از سر نو سیکھنے ہوتے ہیں جو اسکے آباؤ اجداد نے سیکھے تھے۔ بچے جاہل مطلق پیدا ہوتے ہیں بولنا یا چلنا تک قدرت اُن کو نہیں سکھلاتی۔ ہر ایک وہیں سے شروع کرتا ہے جہاں سے اُس کے باپ نے شروع کیا تھا اور وہاں سے شروع نہیں کرتا جہاں اسکے باپ نے ختم کیا ہو جو خصلتیں والدین سے اولاد میں منتقل ہوتی ہیں وہ بالکل ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی والدین میں ہوں۔ یعنی جو باتیں باپ میں فطرۃً موجود ہوں وہی ورثتاً

منتقل ہو سکتی ہیں لیکن جو باتیں وہ اکتساب کرتا ہے اولاد کا ترکہ نہیں ہو سکتا - اگر کسی بچہ کا باپ بمقابلہ اسکے دادا کے زیادہ سیاہ رنگت کا ہو تو بچہ کی رنگت بمقابلہ دادا کے باپ سے زیادہ مشابہ ہوگی اور جن جن باتوں میں باپ اور دادا میں اختلافات ہوں انہیں باتوں میں بیٹے اور باپ میں بھی اختلافات پائے جائیں گے - اور یہ سلسلہ نسلاً بعد نسلاً جاری رہتا ہے - اسی اصول کی بنا پر ہم حیوانات اور نباتات کی مختلف اجناس خود پیدا کر لیتے ہیں -

سائنس کے لئے سب سے زیادہ حل طلب مسئلہ یہ ہے کہ اولاد والدین سے فطرۃً کیوں مختلف ہوتی ہے، اس سلسلہ میں کئی اصول قائم کئے گئے ہیں لیکن یہ موضوع اب تک بحث طلب ہے - اس امر کی کثیر شہادت موجود ہے کہ جو کچھ اختلافات رونما ہوتے ہیں، ان کا سبب جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کوئی ایسا امر نہیں ہوتا جو والدین کی زندگی سے بچہ کی پیدائش سے پہلے متعلق ہو - بلکہ یہ اختلافات تو خود بخود پیدا ہو جایا کرتے ہیں - اس مسئلہ پر ایک طویل بحث درکار ہے لیکن مختصر طور پر صرف چند واقعات کا تذکرہ کافی ہوگا - کتے بلی اور سور کے بچوں کا مشاہدہ کیا جائے تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ بچے ماں باپ سے اور خود آپس میں ایک دوسرے سے کئی باتوں میں اختلاف رکھتے ہیں انکی رنگت جسامت، صورت، اور طبیعت میں فرق ہوتا ہے - کتے کا ایک بچہ باپ سے بہت کچھ مشابہ ہوگا - دوسرا ماں سے - تیسرا خاندان کے کسی اور فرد سے اور چوتھا کسی سے بھی مشابہ نہ پایا جائے گا - چوں کہ تمام بچے یکساں حالات و واقعات کے اثر میں پیدا ہوئے ہیں اس لئے یہ کہنا پڑیگا کہ یہ اختلافات خود بخود پیدا ہو گئے، ماں باپ کی اچھی یا بُری صحت انکی خوراک یا انکی زندگی کے کسی اور واقعہ کا اثر اختلافات کا باعث نہیں ہو سکتا - کیونکہ ایسی صورت میں تمام بچوں میں اختلافات کا یکساں ہونا ضرور تھا -

اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے دوسری مثال یہ لی جائے کہ مغربی ساحل افریقہ میں بخار ایسی عام چیز ہے جس سے کوئی فرد محفوظ نہیں رہ سکتا - ہر شخص میں اس بلا کے مقابلہ کی قوت مختلف ہوتی ہے - کوئی اس سے بہت متاثر ہو جاتا ہے اور کوئی معمولی طور پر اس کے اثر کو قبول کرتا ہے لیکن مقابلہ تقریباً ہر شخص کو کرنا ہوتا ہے اور اکثر بچے ضائع ہو جاتے ہیں - اگر والدین کی مصیبتوں کا اثر اولاد میں وراثتاً

منتقل ہوتا رہے تو بچے ضعیف ہوتے ہوتے نسل ہی کو منقطع کردیں گے، اب ظاہر ہے کہ تفرق فطری نہ ہونے ہی کی وجہ سے ہر بچہ اپنے ساتھ بخار کے مقابلہ کی قابلیت خود لاتا ہے۔ مگر چونکہ ضعیف افراد مقابلہ کی تاب نہین لاسکتے اسلئے صرف وہی باقی رہجاتے ہیں جو اس بلا کا مقابلہ کرسکیں' اب دو صورتیں ہوسکتی ہیں یا تو رفتہ رفتہ نسلوں کا ضعیف ہونا اون کے نام ونشان کو ایک دن مٹادے یا ضعیف افراد کم ہوتے جائیں اور قومی افراد کا قیام قومی حالت کو رو بہ ترقی کردے، اب واقعات بتلاتے ہیں کہ دوسری صورت رونما ہے۔ حبشیان افریقہ میں تنزل نہ پایا جائے گا بلکہ بخار کی مدافعت اُن سے بہتر کوئی دوسری قوم مشکل سے کرسکتی ہے۔

بالکل اسی مثال کے مطابق انگریزوں میں امراض سل اور خسرہ ہندوستان میں موتی جھرہ اور پیچش کی افراط، عربوں کے لئے گرمی کی شدت۔ چینیوں کے لئے ان کے ملک کی بلائیں' غرض ہر قوم کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار رہی۔ لیکن کوئی قوم تنزل پذیر نہیں ایک عام اصول قائم کیا جاسکتا ہے کہ وہ اقوام مستحکم ہوتی جاتی ہیں جو کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوں اور اس قوم کو کسی ایسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا ہوتا اس کے ضعیف افراد جدا نہیں ہوسکتے' ان میں تنزل ہونا لازمی ہے۔ اگر حیوانات اور نباتات میں اعلیٰ اجناس کو منتخب کیا جائے تو وہی اقسام انتخاب کے قابل ہونگی۔ جنکو نگہداشت اور اعلیٰ پرورش سے تیار کیا گیا ہو۔ نتیجہ بالآخر یہی نکلتا ہے کہ وہی اقوام جنکو ناموافق حالات کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے قوی ہوجاتی ہیں کیونکہ فضلا صاف ہوجاتا ہے اور یہی مصائب قوم کے بنانے میں وہ کام کرتی ہیں جو آگ سونے کو صاف کرنے میں۔

عجیب واقعہ ہے کہ جو لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ اقوام ناموافق واقعات میں گرفتار ہیں وہ فوراً یہ نتیجہ بھی نکال لیتے ہیں اسکے افراد تنزل پذیر بھی ہونگے۔ دو میں دو جوڑکر چار بناتے ہیں اور چار میں دو کی جمع سے چھ ہوجاتے ہیں لیکن جب کئی دو کی جمع کی جاتی ہے تو وہ حاصل جمع نفی میں لے آتے ہیں یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ قوم کے افراد کو ضعیف بنایا جائے لیکن بالآخر زبردست ہی شمار کی جائے۔ اس تمام غلطی کی بنیاد یہ ہے کہ جب ضعیف بچے دیکھے جاتے ہیں تو ان کے ضعف کو والدین پر محمول کیا جاتا ہے بلکہ نفس واقعہ یہ ہے کہ بچوں کو بھی ان ہی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے جو والدین کو۔

جب یہ مسلم ہے کہ جو قومیں مصائب کا شکار ہوں وہ ترقی پذیر ہو جاتی ہیں اور جو خصوصاً غیر موافق حالات سے محفوظ رہکر نشو و نما پائیں ان میں تنزل لازم ہو تو ثابت ہو جاتا ہے کہ اولاد والدین کے ماحول سے فطری طور پر کوئی اثر نہیں لیتی، اس کلیہ میں مستثنیات بھی ضرور ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ ولایتی نسل کے کتے ہندوستان آکر اپنی خوبی کھو دیتے ہیں لیکن جو قدیم نسلیں ہیں ان کے مشاہدے سے نتیجہ نکلتا ہے کہ سلسلہ تنزل دوامی نہیں ہوتا۔ جن اقوام کو ملیریا یا اس قسم کے موسمی امراض کا ہمیشہ مقابلہ کرنا ہوتا ہے اُن کیلئے یہ چیزیں ان کے ماحول کا ایک جزو ہو جاتی ہیں۔ بلکہ یہی خرابیاں مقابلہ کی وہ قوت پیدا کر دیتی ہیں کہ یہ مصائب تنزل کا باعث نہیں ہوتے۔

انسان نے اپنے جسمانی ساخت اور قوای جسمانی و دماغی میں ارتقا کی بنا پر دنیا کی حکومت حاصل کر لی لیکن یہ ارتقا، کم ہوتے ہوتے اب بند ہو چکا ہے۔ کوئی موجودہ قوم یونانیوں سے جو دو ہزار سال قبل زندہ تھے جسمانی اور ذہنی قویٰ میں برتری حاصل نہیں کر سکتی۔

انسان نے اپنے علم میں بتدریج اضافہ سے حیوانات اور نباتات کو اپنے قابو میں لیکر وسائل خوراک میں اضافہ کیا۔ نوع انسان کے افراد میں بھی اضافہ ہوتا گیا وہ علاقے جن میں چند شکاری گذر بسر کیا کرتے تھے کاشتکاروں کے مستقل قیام کی جگہ بن گئے اور تحفظ کے خیال نے گاؤں کی آبادیاں قائم کرادیں زراعت کے بعد تجارت کا ظہور ہوا، قصبات اور بڑے بڑے شہر قائم ہونے لگے اور تہذیب کا آغاز ہو گیا۔ تمدن کے معنی وہ قومی اجتماع ہے جس سے انسان بخلاف بہائم امن و امان میں زندہ رہتا ہے، یہ بھی ضرور ہے کہ تہذیب و تمدن کی کیسی ہی ترقی کیوں نہ ہو جائے اقوام میں اکثر افراد کو ہم اُس وقت فنا ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں جب کہ وہ اوائل عمر میں دنیاوی اغراض کو پورا کرنے سے پہلے رخصت ہو جاتے ہیں +

عبید الکریم بی اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی
(علیگ)

زمزمۂ نعت

ہے حاصلِ سعی خوش بیانی ہے اصل متاعِ زندگانی
محبوب خدا کی نعت گوئی ممدوحِ خدا کی مدح خوانی

اے باعثِ فخرِ نوعِ انساں اے مایۂ نازِ اہلِ ایماں
اے نورِ تجلیِ حقیقت اے عقدہ کشائے رازِ عرفاں

اے مرکزِ عشقِ کبریائی اے مشعلِ راہِ حق نمائی
سرچشمۂ رحمت و ہدایت حاصل تجھے عرش تک رسائی

اے قلزمِ معرفت کے گوہر اے اوجِ شرف کے مہرِ انور
اے روحِ حقیقتِ رسالت اے باعثِ خلقِ ہفت کشور

اے خلقتِ دو جہاں کے حاصل اے فطرتِ کن فکاں کے حامل
ہر قول ہے تیرا شرحِ محکم ہر فعل ہے رہ نمائے منزل

اے صدر نشینِ بزمِ ارشاد اے زیب دہِ سریرِ ایجاد
اللہ کا تو رشید شاگرد کونین کا تو شفیق استاد

اے مالک و تاجدارِ بطحا بے شبہ ہے تیری ذاتِ والا
تاثیرِ خلیل کی دعا کی تصدیقِ بشارتِ مسیحا

سید محمود اعظم فہمی ترمذی

بازگشت

(ترجمہ نظم ہنری ہائن مشہور و معروف جرمنی شاعر)

۱- سمندر میں بہت دور، ڈوبنے والے سورج کی آخری اور چمکیلی کرنیں پانی کی چھوٹی چھوٹی آہستہ آہستہ لہروں سے دست و گریباں ہوتی ہوئی چمک رہی ہیں- میں ماہی گیر کی جھونپڑے کے سامنے تنہا چپ چاپ اور خیالات میں ڈوبا ہوا بیٹھا ہوں پرند ایک طرف سے دوسری طرف اُڑ رہے ہیں، یکایک اے نازنیں، اے میری پیاری میں تیری بادامی آنکھوں سے عشق و محبت کے آنسو بہتے دیکھ کر بے چین ہوگیا، بے اختیار تیری طرف دوڑا اور اپنے کو تیرے نازک نازک سفید سفید ہاتھوں تک پہونچا کر قطرات درخشاں کو اپنے ہونٹوں سے جمع کرنا شروع کیا- اُسی لحظہ سے آہ اُسی دقیقہ سے میرا جسم جل رہا ہے میری روح تیری اشتیاق میں شمع کی طرح گھُل رہی ہے پگھل رہی ہے، آہ اے عورت تو نے اپنی آنکھوں سے مجھے مسموم کر دیا-

۲- شہر اپنے مہیب قلعوں اور اُن کے ڈراؤنی برجوں کے ساتھ شام کی نیم رنگ تاریکی میں ڈوبا ہوا پیچیدہ اور مختلط الاشکال نظر آرہا ہے، دھیمی خنک ہوا سطح نہر کو زرپوش کئے ہوئے ہے سورج اپنی نورانی روشنائی کی (سینۂ ظلمت سے) ایک آخری جھلک دکھا کر اس جگہہ کا جہاں وہ یار عزیز محبوبہ دلنواز روح پرور مجھ سے رخصت، مجھ سے جدا ہوا- پتہ بتا رہا ہے-

۳- آہ پھر میں اُسی قدیم سڑک سے اور اُن ہی گلیوں میں سے ہوتا ہوا جنھیں خوب جانتا ہوں روانہ ہوا، یہاں تک کہ میں اپنی محبوبہ کے گھر کے سامنے آپہونچا-

میں سوچ رہا ہوں کہ کہیں دیواریں مجھ پہ نہ گر پڑیں اور مجھے جہاں تک جلد بن سکے یہاں سے گذر جاؤں-

۴- آہ! میں کوہ اطلس کی طرح غم و اندوہ کا ایک پہاڑ اور کدورت والم کا ایک جہان اٹھائے ہوئے ہوں میرے کاندھوں پر سے عظیم الشان بار کا اترنا مشکل ہے، میرا دل اندوہگیں مجروح و متالم ہو رہا ہے- اے قلب مغرور! تو نے ان تیرہ دنوں کو میرے لئے کیوں پسند کیا اور بخت بد کو پورے شدائد کے ساتھ کیوں

میرا رفیق و ہمنشیں بنا دیا۔

۵۔ میں نے شیطان کو پکارا، وہ فوراً حاضر ہوا، اور میں اسے دیکھکر ہکا بکا رہ گیا، یہ ایک خوبصورت جوان، احوال عالم سے آگاہ، اور اچھا خاصا ڈیپلومیٹک تھا، اس نے مسئلہ "کلیسا اور حکومت" پر بلا خوف تردید اپنے خیالات کا اظہار کیا، اس نے "ھےگل" سے زبان سنسکرت کو سیکھا تھا، اور شعراء میں سے گوئٹے کو پسند کرتا تھا، اس نے میرے "علم حقوق" کی تحصیل پر تحسین کی، وہ خود بھی مدتوں اسی کام میں مشغول رہ چکا تھا اس نے مجھے کافی اطمینان دلایا کہ "میری دوستی" اس کے لئے زیادہ سود مند نہیں ہے، پھر پوچھا کیا اس سے پہلے سفیر اسپین کے پاس ہم دونوں کی ملاقات نہیں ہوئی ہے؟ میں ذرا گہری نظر سے اسکی صورت تکنے لگا۔ کچھ دیر بعد اسکی پیشانی پر سنہری حروف میں یہ جملہ لکھا ہوا نظر آیا، "مدت سے ہم دونوں ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔"

۶۔ بہزار حسرت و افسوس میں گذشتہ دنوں کو یاد کر رہا ہوں، آہ! اس سے پہلے میرے لئے زمانہ رفیق اور دنیا پرسکون قیام گاہ تھی دن رات کس قدر خوشی اور آسودگی میں بسر ہوتے تھے آج وہ دو خرمی ماضی قریب کی متلاطم لہروں میں ڈوب گیا، اور میری آنکھوں کو ہر چیز خزاں انگیز خستگی آور، غیر موزوں اور نامناسب معلوم ہونے لگی۔ آہ! اگر کہیں بقیہ محبت مخمور میں سے ایک ذرہ بھی میرے پاس باقی نہ رہے تو پھر یہ درد مند دل کس سہارے پر جی سکتا ہے؟۔

۷۔ بے صبری نہ کرو اگر میرے تازہ اشعار سے میرے سابقہ آلام کی فریادیں سن رہے ہو مایوس نہ ہو اک ذرا منتظر رہو، وقت آئے گا کہ یہ نالے محو ہو کر میرے ضعیف قلب سے نوبہار شعر پیدا کریں گے ہموم دل تو اپنی قسمت پر شاکر رہ، بہار جسے جاڑوں نے بیچ میں پڑ کر تجھ سے چھڑا دیا ہے لوٹے گی، ابھی بھلائیاں تجھ میں باقی ہیں، ہنوز دنیا لطیف و جمیل ہے اسلئے تو ہر چیز سے خوشنود ہو سکتا ہے اور تجدید انس و محبت کر سکتا ہے۔

۸۔ دروازہ کے باہر برف برس رہی ہے، ہر چیز یخ ہو رہی ہے، سخت طوفان امنڈ رہا ہے لیکن مجھے ہولناک موسم سے ذرا سا بھی اندیشہ نہیں کیونکہ میں تو خیال یار نازنیں اور شادمانی شور انگیز فرودین کی اپنے دل میں پرورش کر رہا ہوں۔

۹۔ تیرے پاس بہت سے مروارید و الماس ہیں، اے نازنیں تیرے پاس وہ سب چیزیں ہیں جو زمانہ

ہوا و ہوس کو محرک کرتی ہیں، تیرے پاس بہت ہی خوبصورت آنکھیں ہیں، اے آیتِ لیرانی، اے نشانِ زیبائی تجھے دوسری اور کیا چیز چاہیئے؟ میں نے تیری مخمور آنکھوں کی تعریف میں ہزاروں شعر کہے ہیں جو جریدۂ عالم سے کبھی محو نہ ہونگے، اے بہشتی حور تجھے دوسری اور کیا چیز چاہیئے۔؟

۱۰۔ احباب نے مجھے خوش آیند نصیحتیں کیں نویدِ سعادت و احترامات سے مسرور کیا، مجھے اطمینان دلایا کہ اگر میں صابر رہوں اگر میں راضی برضا ہو جاؤں تو میرے تمام کام سُدھر جائیں گے، درست ہو جائیں گے، ہاں یہ لوگ مجھے اپنی حمایت کے سایہ میں جگہ دینا چاہتے ہیں، اگر یہ تمام شریف آدمی میری مزاج پرسی دلدہی نہ کرتے سہارا نہ دیتے تو میری بہت بری دُرگت بنتی میں سب سے زیادہ اس آبرومند شخص کا رہینِ منت ہوں اُسکی خدمات کبھی نہ بھولوں گا جس نے میری برباد تباہ اور بگڑی ہوئی حالت کو سنبھالے رکھا، افسوس میں اس شخص کو اپنی آغوشِ تشکر میں لے کر اپنا پورا امتنان اس پر ظاہر نہیں کر سکتا جس حالت میں کہ وہ شخص آبرومند خود میں ہی ہوں۔

۱۱۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بلند جگہ پر کھڑا ہوا ہوں۔ بہت سی خوبصورت دوشیزہ سریلی شیریں دہن بیساختہ میرے اشعار گا رہی ہیں، میں شراب ارغوانی رنگ اور شربت سُرخ پی رہا ہوں، باوجود اسکے کہ میں کسی کا قرضدار نہیں ہوں پھر بھی دل تنگی میرے گریباں سے ہاتھ نہیں کھینچتی۔ میں برلن کی آبادی کے متعلق سوچ رہا ہوں چاہتا ہوں آسماں سے پانی کے بجائے "عصارۂ لیمو" برسے اور شہر کی نہروں پر سے شراب "رن" اُبلنے لگے شہر کے باشندے اس وقت اپنے کو کسقدر خوش نصیب سمجھنے لگیں، بادہ خواران طمّاع جمع ہو جائیں، محکمۂ فوق العادۃ کے ممبر اُس نہروں کو خود ہی پی جانا چاہیں، شعرا، اور فوجی افیسر اس سرورِ غیر متوقع سے کسقدر خوش ہوں۔

۱۲۔ میں پھر ان لبانِ گلرنگ سے جدا ہو گیا اور محبت کے ان دو بازوں سے جو مجھے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہے تھے میرا تو خود بھی بہت جی چاہا کہ میں اس پر کیف حالت میں ایک دن اور بھی رہوں لیکن کیا کیا جائے ہنگامِ رحیل آ پہونچا ہے گھوڑے سواری کے لئے آ چکے ہیں، آہ سچ ہے، زندگی اسی کا نام ہے "شکایت دائمی، فراق دائمی، وداع دائمی، اے نازنین آہ! کیا ممکن نہ تھا کہ تیرا دل میرے قلب سے اس سے پہلے مربوط ہو جاتا؟ افسوس! افسوس! تیری پرنم آنکھیں اس وقت مجھے جانے سے نہیں روک سکتیں۔

۱۳۔ آہ! اب کہاں ہے، یہ لڑکی دیوانۂ شہر آشوب اب کہاں ہے! سخت طوفان میں موسلادھار بارش میں چپکے چپکے بڑبڑاتا ہوا میں اسکی جستجو میں ہر طرف دوڑ رہا ہوں، ہر جگہ جا رہا ہوں، ناگہاں میں نے

اپنے (دل) میں دیکھا قہقہہ لگاتے ہوئے (اشارے کرتے ہوئے) پیاری عزیز بھلا میں کس طرح جان سکتا تھا، کہ تو اس شاندار عمارت میں رہتی ہے۔ ؟

۱۴۔ تاریک خیالات کی طرح بہت سے گھر دور دور تک اسکے نواح میں پھیلے ہوئے ہیں میں النو (چسٹر) سمیٹے اور لپیٹے ہوئے سامنے سے گزر رہا ہوں، کلیسا کا گھنٹہ آدھی رات ہونے کی خبر دے رہا ہے، محبوب دل نواز میرا منتظر ہے راستہ کو چاند نے روشن کر دیا ہے، اور اسی کی بدولت میں خانہ جانانہ سے قریب ہو گیا ہوں، اے چاند! اے غمگسار دل باختگاں، اے شاطہ چہرۂ آسماں، اب دوسری دنیا اور دوسرے آدمیوں کے لئے نورافشانی کر اگر حرکت عاشقی کی اثنا میں تیرے پاس تک میری طرح کبھی کوئی اور شخص پہنچے تو ہرگز ہرگز تسلیت سے دریغ نہ کرنا۔

۱۵۔ سورج پہاڑ کی چوٹی کے پیچھے جا رہا ہے، بکریوں کے گلہ کی آواز دور دور سے کان میں آ رہی ہے رات کی اندھیاری جنگلوں اور باغوں پر جھکی پڑتی ہے، چاند طارم اخضر سے ہوا ے معطر کو روشن کر رہا ہے۔ جھینگر (زنجرہ) سمندر کے کنارے بول رہے ہیں سطح آب پر بعض چیزیں تیرتی ہوئی نظر آ رہی ہیں، عین اس موقع پر ملکہ آب شست وشو میں مصروف ہے اسکے سفید شانے ہاتھ اور سنہری بال، ہلکی ہلکی چاندنی میں چمک رہے ہیں۔

۱۶۔ اچھا یہ تو کہو میں جاننا چاہتا ہوں جسوقت تمہارا دل عہد شباب کی چنگاریوں میں جل رہا تھا وہ محبوبۂ دلنواز جسکی یاد میں تم اسقدر گیت گا رہے ہو کہاں تھی ؟ آہ! اے ہمدم یہ کیا پوچھتے ہو وہ شب شعلے شرارے بجھ گئے، خاموش ہو گئی، ملتہب دل ٹھنڈا پڑ گیا محزون ہو گیا، یہ نظم ایک ظرف ہے جس میں میرے عشق کی خاکستر ابدالآباد تک محفوظ رہیگی +

(ترجمہ)

محمد اسمٰعیل نف ہا

محنت اور ذہانت

محنت پہ ہے بنیاد ترقی کے محل کی — محنت پہ ہے موقوف ضیا علم و عمل کی
محنت ہی سے بازار جہاں میں ہے یہ چل پل — یہ کل نہ چلے گر تو ہو دنیا ابھی بے کل
دولت کو نہ اندھی کہو یاران ہنرمند! — محنت کا کرو تجربہ آنکھیں نہ کرو بند
دولت بھی انہیں کے لئے ہے قوت بازو — رکھتے نہیں جو ہاتھ سے محنت کی ترازو
اندھے ہیں جو کرتے نہیں محنت کا نظارا — چمکا ہے اسی اوج پہ دولت کا ستارا
ہے موج اسی ملاح کی کشتی کو چلاتی — ہاتھوں میں نہیں جس کو ذرا کاہلی آتی
کرتا اُسی گلزار کو سرسبز ہے بادل — سینچیں جسے سرگرمی محنت سے مسلسل

محنت کے لئے ذہن کی تیزی نہیں درکار — پہنچاتی ہے مقصد پہ جو محنت ہو لگاتار
محنت سے جلا عقل جوانوں کی ہے پاتی — محنت ہی ذہانت کے کرشمے ہے دکھاتی
محنت سے وہ جلوے نظر آئے ہیں جہاں میں — آئیں نہ جو ہرگز نظر وہم و گماں میں
عالم ہوں کہ موجد ہوں، مصور ہوں کہ شاعر — محنت ہی سے ہر علم و عمل میں ہوئے ماہر
کامل کبھی محنت کے سوا ہو نہیں سکتے — محنت جو کریں شیوہ تو کیا ہو نہیں سکتے
محنت نے ہر اک فن میں ہیں اعجاز دکھائے — سایہ میں ذہانت کو وہ کیونکر نہ دبائے
محنت ہی ذہانت کے لئے ہے پر پرواز — محنت ہی میں پوشیدہ ذہانت کا ہے سب راز

موجودہ ذہانت ہے اگر تم میں جوانو! — سرمایۂ نازش اُسے زنہار نہ جانو
محنت سے نہ لو کام تو جوہر ہے یہ بیکار — خنجر تو ہے لیکن نہ چلے گا دم پیکار
موتی اسے کہئے تو یہ ہے آب سے خالی — آئینہ اگر ہے تو ہے سیماب سے خالی
ہے پھول اگر یہ تو صفا اس میں نہیں ہے — ہے شمع اگر یہ تو ضیا اس میں نہیں ہے

چشمہ ہے اگر یہ تو نہیں اس میں روانی
ہے ابر اگر یہ، تو نہیں قطرہ فشانی

گر چاہتے ہو راہِ ترقی میں بڑھو تم
گر چاہتے ہو بامِ تمدن پہ چڑھو تم

گر چاہتے ہو علم میں ہو شہرۂ ایام
مشہور کسی فن میں ہو کرنا تمہیں گر نام

گر چاہتے ہو تم کہ تجارت سے ہو زردار
یا صنعت و حرفت کی ہو رمزوں سے خبردار

کرنا نہ ذہانت پہ بھروسہ کبھی زنہار
اس چشمۂ بے آب کے دھوکوں سے خبردار

محنت ہی کی منزل پہ قدم مارتے جانا
غافل جو پڑے ہوں انہیں للکارتے جانا

محنت کو ذریعہ جو ہدایت کا نہ مانو
منزل پہ سعادت کی نہ پہنچو گے جو انو

سلیم، پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی
حیدرآباد

افکارِ فکری

اے نگاہ ناز یہ کیسا اشارہ ہو گیا
موت آساں ہو گئی دشوار جینا ہو گیا

اس جنوں پر سیکڑوں دانائیاں قربان ہیں
تجھ سے خود بیں کی نظر میں جو تماشا ہو گیا

پتلیاں پھرنے لگیں آنکھوں میں آنسو آ گئے
تم نے یہ کیا کر دیا بیمار کو کیا ہو گیا؟

جب نہ تھی الفت تو ہر اک التجا مقبول تھی
اب خدا جانے دعاؤں کا اثر کیا ہو گیا،

تیرے وعدوں میں وہی وعدہ ہے جانِ زندگی
جو کسی ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا ہو گیا

مستقل لذت مبارک اے دلِ درد آشنا
زخم رستے رستے اب ناسور پیدا ہو گیا

اب تجھے فکری کے دل پر رحم آنا چاہیئے
جو کسی امید پر وقفِ تمنا ہو گیا،

فکری

ریاکار مجرم

مسٹر کریپن ہل ڈراپ کریسنٹ روڈ لندن میں رہتا تھا۔ اسکی معاشرتی حالات کچھ ایسے عجیب و غریب اور بظاہر متضاد صورتوں میں نمایاں ہوتے رہتے تھے کہ آس پاس کے رہنے والے اسکے اخلاق و اصول زندگی پر کوئی صحیح رائے نہ قائم کرسکتے تاہم گہری نگاہ رکھنے والوں نے گو بعض اوقات اسکو اپنی رائے کے خلاف بھی ایک نفس انسان کی صورت میں دیکھا، یہ یقین کرلیا تھا کہ وہ ایک بد طینت، خود غرض اور ریاکار شخص ہے جالِ وہ متوسط درجہ کی زندگی بسر کرتا تھا اور لندن کے عام طبقہ کی بعض جہتوں میں ممتاز حیثیت سے دیکھا جاتا تھا اسکی بیوی بیل المور امریکہ کے ایک مشہور تاجر پیشہ خاندان کی چشم و چراغ تھی اور اسے اپنے والدین کی طرف سے سالانہ ایک مستقل رقم بطور امداد پہونچا کرتی تھی۔

مسٹر کریپن اور مسز کریپن دونوں کی زندگی ایک عرصہ تک خوشگوار اور قابل رشک تعلقات کے ساتھ قائم رہی۔ دونوں کچھ نہ کچھ ایک دوسرے کی طبیعت سے تناسب رکھنے کے سبب خوشحالی سے بسر کرتے تھے اور کسی کو کوئی خاص شکایت کا موقع نہ تھا۔ مسز کریپن کے یکے بعد دیگرے دو بچے بھی ہوئے جو دو دو سال کے ہوکر طاعون میں ضائع ہوگئے۔ اسپر بھی زوجین کے لطف و کامرانی میں زیادہ خلل نہ ہوا اور اسیطرح انکی معاشرت باہمی کا دامن رنج و ملال کی کدورت سے پاک رہا۔

مگر ظاہر ہے کہ ان دونوں کی طرز زندگی فلسفہ کی تصویری نہ تھی جو ہمیشہ ایک ہی حکم میں رہے۔ پھر مسٹر کریپن جیسا متلون الاخلاق شخص کب تک نہ اپنے مقتضائے طبع کو ظاہر کرتا۔ آخر ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ میاں بیوی کو ایک دم اپنے تعلقات میں انقلاب کی ضرورت محسوس ہوئی اور بات بات میں رنج و کدورت کے احساس سے دونوں کو جینا دوبھر ہوگیا۔

(۲)

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس دور نامسعود کی ابتدا کس طرح اور کیونکر ہوئی مگر یہ بتانے میں ہمیں کوئی تامل نہیں کہ اس کا مآل بہت افسوسناک اور عبرت انگیز تھا۔ مسٹر کریپن جیسا کہ پہلے واقعات سے معلوم ہوا ہوگا اب اپنی بیوی کو دم بھر ساتھ رکھنا پسند نہ کرتا تھا۔ اور ہر وقت منتظر رہتا تھا کہ کب موقع پاکر اس سے نجات حاصل کردں۔ اتفاقاً بیل المور کے اعزہ نے کریپن کو لکھا کہ اب بہت دن ہوگئے ہیں ہم نے اپنی لڑکی کو نہیں دیکھا

مناسب ہو کہ جلد انتظام کر کے بھیجدو۔ اس سے بہتر زریں موقع کرپین کے لئے کیا ہو سکتا تھا، اسنے اپنے ملنے والوں اور محلہ کے لوگوں سے اس خط کا ذکر کر کے ظاہر کیا کہ اب میں عنقریب اپنی اہلیہ کو روانگی کی اجازت دینے والا ہوں اور ایک دن دھوکا دیکر "ہاسن" ایک قسم کا زہر پلا کر ہمیشہ کے لئے اُس کی زندگی کا فیصلہ کر دیا۔

ظاہر ہے کہ جرم کا ارتکاب اتنا دشوار نہیں جتنا اس کا چھپانا۔ کرپین کو اخفاے واردات میں بڑی مشکلات پیش آئیں مگر اسنے استقلال سے کام لیا، اور مقتولہ کی نعش اپنے مکان کی ایک کوٹھری میں دفن کر کے مشہور کر دیا کہ وہ امریکہ روانہ ہوگئی اور کچھ عرصہ کے بعد یہ بھی کہ اسکا انتقال ہوگیا، اب کرپین تھوڑے دن کے لئے اس تنہائی میں آزاد اور خوش تھا، جیسا پہلے اپنی بیوی کے ساتھ۔ اس پاس کے شناسا لوگ بھی بڑی حد تک اس خبر سے مطمئن ہوگئے تھے اور سر دست کسی کو اسکی بیوی کے معاملہ میں کوئی کاوش نہ تھی۔

(۳)

فطرت کے اصول و قوانین کچھ اس درجہ صحیح معیار کے ساتھ مرتب و نافذ ہیں کہ کبھی ان میں ذرا فرق نہیں ہوتا، حکومتیں درہم و برہم ہو جاتی ہیں اور ان کے قوانین بھی زمانے کے ساتھ بدل جاتے ہیں اور زمانوں کے آداب ماند و بود بھی، مگر فطری اصول معیشت اور قدرت کے بنائے ہوئے قانون میں نہ کبھی کوئی تبدیلی ہوتی ہے نہ ترمیم ہر مجرم اور تعدی پیشہ بجائے خود یہ سمجھتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اُسکی زیادتیاں ابنائے نوع کے ساتھ ہمیشہ رہینگی اور وہ خود ان کی پاداش میں کوئی نقصان نہ اُٹھائے گا مگر کیا اس کا یہ خیال اور اسکو بروئے کار لانیکی تمام کوششیں سودمند ہیں؟ واقعات جو کچھ اس کا جواب دیتے ہیں اس کا اعادہ تحصیل حاصل ہے۔

بس اس حالت میں جب کرپین کو یقین آگیا کہ اب کوئی صورت اسکی توقعات کے خلاف ظاہر نہ ہوگی اور غالبًا مجبور ہوگا کہ اپنے اس اصول کو بدل دے۔ مسز کرپین کے اعزہ عرصہ تک اس سے جدا رہنے اور اسکی نسبت قابل اطمینان خبر نہ پانے سے مشکوک ہوگئے۔ اور انہوں نے اسکاٹ لینڈ کی ایک مشہور تفتیشی جماعت سے رجوع کیا جو خفیہ طریق سے جرائم کا پتہ لگانے میں بہت کامیاب ثابت ہو چکی تھی اور طے کر لیا کہ کتنا ہی روپیہ کیوں صرف ہو، جب تک کہ حقیقت حال کا انکشاف نہ ہوگا چین سے نہ بیٹھیں گے۔

اس جماعت کے ہوشیار رکن صورت واقعہ معلوم کرنے کے لئے لندن آئے اور کرپین سے

لئے مگر اب اسنے یہ کہکر ان کی تسلی کرنا چاہی کہ یہ قصہ جو میں نے بیوی کے مرنے کا مشہور کر رکھا ہے غلط ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود مجھکو چھوڑکر چلی گئی ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ آجکل وہ کہاں ہے اسنے یہ بھی بیاں کیا کہ پہلے واقعہ کی شہرت میں مصلحت تھی کہ لوگ یہ کہکر مجھے بدنام نہ کریں کہ مسز کریپن اپنے شوہر کو چھوڑکر چلتی ہوئی"۔

بات بالکل معقول تھی اور یہ خیال اسکی صحت کی کافی تائید کرتا تھا کہ عزت وحمیت کے کریپن کو اس غلط شہرت پر مجبور کیا ہوگا۔

کیونکہ کوئی شوہر اپنی نسبت ایسی بدنامی گوارا نہیں کرتا۔ جاسوس اسکے کہنے پر اعتماد کر لیتے اور اسطرح سارا معاملہ رفت و گزشت ہوچکا ہوتا اگر کہیں کریپن اپنے ایک دوست مسٹر اتھیل کو جسے وہ پہلے ہی اندرونی خیالات سے آگاہ کرکے اپنا ہمخیال و رفیق بنا چکا تھا ساتھ لیکر لندن سے چلا نہ جاتا۔

اب وہی کریپن پھر خطرہ میں تھا جسنے پہلے اپنے عزم استقلال، مزاج اور ہر قوت اعصاب کی جرأت انگیزی کی بدولت کتنے ہی سخت ترین حوادث کا باآسانی منہ پھیر دیا تھا، یہ مان لینے میں کوئی تامل نہیں ہوسکتا کہ اگر وہ سکوت و خاموشی کو سپر بنائے ہوے اپنے مکان میں رہنے پر قانع ہوتا تو اس کا راز ایسی آسانی سے افشا نہ ہوتا اگر وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا، کیونکہ قدرت کا جذبہ انتقام اندر ہی اندر اپنا کام کر رہا تھا اور اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہئے تھا۔ آخر کریپن کے نامبارک جذبات مجرمانہ جو قتل کے ارتکاب اور جرم پوشی کی غیر معقول کوشش میں اسکو بہت کچھ گرما چکے تھے، دفعتہً سرد ہوگئے اور وہ بالکل مجبور ہوگیا، اور اس وجہ سے عقل سے بیگانہ کہ اپنے لئے کوئی نیک راے نہ قائم کرسکا۔ یہ اسکی پہلی مگر نہایت فاش غلطی تھی جسکے مہلک نتائج اسکی جان لیکر رہے۔

(۴)

کریپن جسوقت اتھیل کے ساتھ لندن سے جہاز پر روانہ ہوا تو اس کا ارادہ پیرس کا تھا، اور اُسکے ساتھ سامان میں صرف ایک ہینڈ بیگ تھا، اسنے آغاز سفر سے پہلے اپنے آپکو ایک لڑکی کی شکل میں تبدیل کرلیا تھا، وہ خلقی طور پر کوتاہ قامت تھا، اور جسم ولباس کی معمولی

تبدیل و تحریف اسکو ایک کمسن لڑکی کی صورت میں بدل سکتی تھی۔ مسٹر ایتھل چونکہ بلند قامت اور دیر جسم کا شخص تھا، اور اسکی شکل و شباہت سے بھی وجاہت نمایاں ہوتی تھی اسلئے اسنے کرپین کے مشورہ سے اپنا مفروضہ نام "جان رابرٹ" رکھا۔ اور خود کو کرپین کا باپ ظاہر کیا۔

اثنائے سفر میں سامان کی قلت اور ان دونوں کی بعض حرکات جو عموماً لوگوں کو شک میں ڈال سکتے تھے کپتان کے لئے وجہ شبہ ہوگئیں اور اسنے آثار و قرائن کو معمولی تفحص کے بعد اور زیادہ شک انگیز پاکر فوراً ایک بے تار کا پیام لندن پہونچایا یہاں پولس اپنے گم شدہ مجرم کی خبر معلوم کرنے کے لئے پہلے ہی سے منتظر تھی پتہ لگتے ہی، دو ہوشیار کانسٹبل چل کھڑے ہوے اور دونوں ملزموں کو منزل مقصود پر پہونچنے سے پہلے گرفتار کرلیا۔

ہنوز تحقیقات نامکمل تھی اور صرف قیاسات و شبہات آخری فیصلہ کے لئے کافی نہ تھے اسلئے مزید کارروائی کی غرض سے ملزم لندن پہونچائے گئے اور تکمیل تفتیش کے بعد مقدمہ لندن کی عدالت سشن سے رجوع ہوا۔ مجسٹریٹ نے تمام امور پر غور کرنے کے بعد مسٹر ایتھل کو بری کیا اور کرپین کو پھانسی کا حکم سنایا۔

دور جدید کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ زہر دہندہ فرقہ کا پہلا مجرم تھا جو وائرلیس ٹیلیگرافی کے ذریعہ سے گرفتار ہوا۔

ابو الولا محمد زکریا مائلی

از شفق — نومبر ۲۴ء

سحر و شفق

سب سانحۂ بیت پیمبر ہے نظر میں وہ قافلۂ بے سر و بے پر ہے نظر میں
جو سن نہیں سکتا تھا وہ منظر ہے نظر میں بے جرم کی گردن تہِ خنجر ہے نظر میں
اب تک وہی ہنگامۂ محشر ہے نظر میں

ٹھانی ہے کہ اس راہ میں جو ہو وہ لٹا دوں دل چیر کے دنیا کو جگر اپنا دکھا دوں
مفلس ہوں، تہی دست ہوں نادار ہوں کیا دوں جی میں ہے کہ میخانہ کا میخانہ لٹا دوں
دریا دلیِ ساقیِ کوثر ہے نظر میں

خود آنکھ سے اپنی یہ غضب دیکھ رہا ہوں ناکامیِ قسمت کا سبب دیکھ رہا ہوں
پہلے جو نہ دیکھا تھا، وہ اب دیکھ رہا ہوں الطاف جو ہیں غیر پہ سب دیکھ رہا ہوں
ساقی یہ ترا شیشہ و ساغر ہے نظر میں

جاگا ہے جو سو جانے کے صدقہ میں مقدر دیکھا ہے یہی خواب خوش آیند برابر
تکیہ سرِ شوریدہ کا ہے زانوئے دلبر مجھ خاک نشیں کا ہے دماغ آج فلک پر
کسرے کا محل پھونس کا چھپر ہے نظر میں

اشکوں سے بہت مزرعۂ امید کو سینچا لیکن نہ ہوا پر گلِ مقصود سے کیسا
رونے سے بھی افسوس کہ نکلا نہ نتیجہ سُن سُن کے مرے درد کو نالی نہ پسیجا
او بت انہیں باتوں سے تو پتھر ہے نظر میں

ناچار ہے، مجبور ہے، ہر طرح طلب گار اچھے نہیں کچھ عشق فسوں ساز کے آثار
سیدھی نہ ہو تقدیر تو تدبیر ہے بیکار الٹا ہی جواب آتا ہے خط کا مرے ہر بار
جب دیکھئے تحریر مقدر ہے نظر میں

ہر چیز کو دیکھو مگر انصاف سے دیکھو، قدرت ہے خدا کی جدھر انصاف سے دیکھو
یہ قول شفق یہ نظر انصاف سے دیکھو برعکس نہیں ہے اگر انصاف سے دیکھو
ہر آئینہ اگر سحر سکندر ہے نظر میں (شفق)

محمود کی دُہائی

شام کے ۷ بجے تحصیلدار صاحب محمود نگر پہونچے، چونکہ یہ پہلا دورہ تھا اس لئے آپ نے پہونچتے ہی گھوڑے سے اُتر کر محمود نگر کا معائنہ شروع کر دیا۔ بارش کا موسم ہونے کی وجہ سے ڈیرے نصب نہیں کئے گئے تھے بلکہ تحصیلدار صاحب کے قیام کے لئے ایک چاوڑی میں انتظام کیا گیا تھا چاوڑی ایک پُرانی وضع کی دیہی عمارت تھی جسکی حقیقی تعریف "مسقف چاردیواری" ہو سکتی تھی، صاحب تحصیل کو بہت ناگوار گزرا کہ بحیثیت تحصیلدار ایک دیہی عمارت میں قیام کریں، چپراسی سے کہنے لگے یہاں کوئی عمارت چاوڑی کے سوا نہیں ہے"؟

چپراسی، حضور اسکے سوا ایک نہایت ہی عمدہ بنگلہ قریب ہی ہے مگر اس میں آسیب ہونے کی وجہ سے وہاں کوئی بھی نہیں ٹھہرتا اور اگر کوئی جاکر ٹھہر جاتا ہے تو ایک دو گھنٹے کے بعد جاڑے بخار، پیچش میں مبتلا ہو کر نکلتا ہے یا وہیں سرد ہو جاتا ہے۔

صاحب تحصیل" اچھا ہمارا سامان وہیں لے چلو، چپراسی، حضور خدا کے لئے ایسا ارادہ نہ کریں، آپ کے ساتھ ہی ساتھ ہم پر بھی آفت آئیگی" اس نعرہ پر انڈر گریجویٹ تحصیلدار صاحب کو تاب نہ رہی زمیں پر پاؤں پٹک پٹک کر فرمانے لگے "ول تم لوگ ڈرتا ہے تو تم بنگلہ میں نہیں رہنا ہم رہیگا" مجبوراً صاحب کا سامان چاوڑی سے نکال کر بنگلہ میں رکھا گیا جب تک کہ بنگلہ میں سامان نہیں رکھا گیا صاحب سگار کا دھواں اُڑاتے ہوے چاوڑی کے سامنے ٹہلتے رہے، ٹھیک ۸ بجے چپراسی نے آکر اطلاع دی کہ بنگلہ میں سامان پہونچا دیا صاحب نے فوراً بنگلہ کا رُخ کیا، چاوڑی سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلہ پر ایک خوشنما انگلش فیشن کا بنگلہ نظر آیا جس کا کمپونڈ بھی وسیع تھا مگر صاحب کو یہ دیکھکر افسوس ہوا کہ کمپونڈ میں اسقدر وسعت ہونے کے باوجود کوئی ٹنیس کورٹ نہ تھا، تحصیلدار صاحب جب گیٹ میں داخل ہوے

تو انکو بنگلہ کے بالکل سامنے ہی ایک نیب کا بڑا سا درخت نظر آیا جسکے نیچے ایک بوڑھا فقیر کمبل بچھائے اونگھ رہا تھا، جو آواز سنکر اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک فراشی سلام بھی کیا، صاحب تحصیل نے ایک اٹھنّی اس کی طرف پھینک کر دریافت کیا کہ تم یہاں کب سے رہتے ہو؟ بوڑھا کہنے لگا میں ایک ایسی جگہ کا متلاشی تھا جہاں مجھے کوئی نہ ستائے چنانچہ کئی سال کی مسافرت کے بعد جب میں محمود نگر پہونچا تو یہ ویران بنگلہ مجھے پسند آیا، مجھے بنگلہ میں ٹھہرنے کی تو اجازت نہ ملی مگر بنگلہ کی محافظت ضرور مل گئی، چنانچہ ۴۰ سال سے اسی درخت کے نیچے رہتا ہوں؟ اپنے چھوٹے سے جملے کا اتنا بڑا جواب سنکر صاحب میں دوسرا سوال کرنے کی جرأت نہ رہی۔ خوشنما "برساتی" پہنے رنگین ہال سے گزر کر صاحب نے بنگلہ کا معاینہ فرمالیا، ہر ایک کمرہ موزوں اور عمدہ پایا ڈرائنگ روم سے نکل کر ڈائننگ روم کے بالکل مقابل ہی بڈروم کے بیچ میں صرف ایک ہال حائل تھا، آپ نے تھوڑی دیر وارنڈے میں چہل قدمی کی اور پانچ چار اردو انگریزی اخبار ہاتھ میں لئے بڈروم پہونچ گئے، کھڑکیوں کے شفاف آئینوں میں سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی عجیب لطف دے رہی تھی، تحصیلدار صاحب نے اس روح افزا سین کا تھوڑی دیر تک نظارہ کیا اور پھر تمام دریچے کے بولٹ چڑھا دیئے دروازوں کو بھی بند کر دیا پلنگ کے قریب اسٹول رکھ کر اس پر لیمپ رکھدیا اور خود لیٹ کر اخبار کا مطالعہ کرنے لگے۔

ہمارے نیم یوربین تحصیلدار تقریباً (۲۸) برس کی عمر کے ہونگے ابتدائی تعلیم اپنے وطن دہلی میں پائی شریف اور امیر گھرانے سے تھے، اس لئے ابتدائی تعلیم اچھی ہوئی (۱۸) برس کی عمر میں علیگڈہ کالج بھیجے گئے، مگر وہاں اخلاق پر کچھ ایسا اثر پڑا کہ صرف فیشن کے دلدادہ اور پڑھنے سے متنفر ہو گئے (۲۲) برس کی عمر میں ایف اے میں کامیاب ہوئے۔ اور ایک سال وطن میں رہکر انگلینڈ تشریف لے گئے دو سال انگلینڈ میں بھی گذرے گر افسوس کہ بجائے تعلیمی ڈپلوما کے گھوڑدوڑ اور کرکیٹ، ہاکی وغیرہ کے تمغوں سے اپنے کوٹ کو زینت دی اور صرف (کنٹوپ) کا دُم چھلہ

لیکن ایسے ہوئے، بھوت پریت، جن پری، وغیرہ کے قائل نہ تو بچپن ہی میں تھے اور نہ بڑے ہوکر رہے، اعلیٰ تعلیم نے ان تخیلات سے بری کردیا تھا، یہی وجہ تھی کہ ہمارے نوجوان دوست نے تمام ملازمین کو چاوڑی میں جاکر سونے کی اجازت دی اور خود تنہا بنگلہ میں سونے کی ٹھان لی۔

تمام دن کا سفر اور خواہ مخواہ آواز بنا کر ملازمین کو گالیاں دینے کی تکان نے ایک کالم کے مطالعہ کا بھی موقع نہ دیا۔ تحصیلدار صاحب نے چھاتی پر اخبار رکھ آنکھیں بند کرلیں معلوم نہیں نیند میں تھے یا ہوشیار کہ ایک دم سرہانے کا دروازہ کھلا، اور ایک نہایت ہی حسین عورت سرخ رنگ کی ساڑھی اوڑھے بال کھولے سیدھی پلنگ کے پاس آکر کھڑی ہوگئی، تحصیلدار صاحب اُٹھ بیٹھے، عورت سے مخاطب ہونا چاہتے تھے کہ اسنے

"محمود کی دُھائی"

کہکر ایک چیخ ماری اور تحصیلدار صاحب کانپ گئے، اب دیکھتے کیا ہیں کہ نہ عورت ہی ہے اور نہ اسکے آنے کی کوئی علامت، دروازہ حسب سابق بند ہے، بولٹ چڑھا ہوا ہے اور خود بدولت پلنگ پر لیٹے ہوئے ہیں، اخبار چھاتی پر ہے، صاحب تحصیل نے اسکو اپنی ضعیف الاعتقادی پر محمول کیا اور یہ صرف ہندوستانی الاصل ہونے کا اثر سمجھا گیا۔

صاحب تحصیل نے پھر اخبار پڑھنا چاہا مگر پڑھا نہ گیا، اسی طریقہ سے چھاتی پر اخبار رکھکر لیٹ گئے۔ کوئی ۱۰ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ پھر دروازہ کھلا اور وہی نوجوان حسین عورت ایک عجیب مغموم انداز سے سامنے آکر کھڑی ہوگئی، تحصیلدار صاحب نے بہت جی داری کی فوراً اُٹھکر ہاتھ پکڑ لیا مگر ان کو یہ محسوس ہوا کہ وہ ایک برف کی سل کو چھو رہے ہیں اُس ہاتھ کی سردی سے جسم کپکپا گیا اور تمام جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے، اور عورت نے بھی

"محمود کی دھائی"

دی، تھوڑی دیر کے بعد تحصیلدار صاحب نے دیکھا کہ وہی پلنگ ہے، وہی اخبار، وہی آپ ہیں

اور وہی بند کمرہ، اب تو آپ کو یقین ہوگیا کہ یہ اس بوڑھے فقیر کی شرارت ہے جو درخت کے نیچے رہتا ہے۔ اسنے شاید دروازوں میں اس قسم کے اسپرنگ رکھے ہیں کہ وہ کسی خاص بٹن کے دبانے سے کھل جائیں اور اسی عورت کو یہاں پر خود لاتا ہے، اس خیال نے اس قدر طیش دلایا کہ آپ فوراً اٹھ کر فقیر کے پاس جا پہونچے بوڑھا فقیر آدھا کمبل بچھائے اور آدھا اوڑھے سو رہا تھا سرہانے ایک رسی اور دو تین مٹی کے برتن کچھ چندیاں رکھی ہوئی تھیں، صاحب تحصیل نے پہلے دو تین لاتین فقیر کے رسید کیں اس کو کھڑا کر کے اسی نیب کے درخت سے باندھ دیا اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر خود اطمینان کے ساتھ آکر لیٹ رہے،

اب بالکل اطمینان تھا کیونکہ ان کو یقین تھا کہ یہ سب شرارت اسی فقیر کی ہے۔ ابھی دس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ پھر ایک دھماکا ہوا اور دروازہ کھلا اور وہی سرخ پوش حسین عورت سامنے آکر کھڑی ہوگئی تحصیلدار صاحب اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور اس عورت کو مخاطب کر کے کہنے لگے کہ اس طریقہ سے کیا فائدہ؟ میں کوئی فرنگی محل یا ندوۃ العلما کا تھی نہیں ہوں جو تم سے خوف کروں خیر اسی میں ہے کہ چپکے سے چلی جاؤ ورنہ تمہاری بھی وہی گت بناؤں گا جو تمہارے بدمعاش فقیر کی بنا چکا ہوں مگر سرخ پوش عورت نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ صرف تحصیلدار کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے دروازہ کی طرف چلی اور ہمارے تعلیم یافتہ دوست بھی پیچھے ہوگئے، تحصیلدار صاحب کو دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ وہ ہال ہی ہے اور نہ ڈائننگ روم صرف پختہ سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں اور سرخ پوش بردا‌شتہ قدم سیڑھیاں چڑھ رہی ہے۔ پچاس ساٹھ سیڑھیاں چڑھ کر صاحب تحصیل نے دیکھا کہ ایک دروازہ نہایت ہی مضبوط نصب ہے اور اس پر ایک حبشی چوڑا تیغہ برہنہ لئے کھڑا ہے۔ سرخ پوش بلا پس و پیش حبشی کی دونوں پاؤں کے درمیان سے نکل گئی اور ہمارے نوجوان دوست گھبرا گئے سرخ پوش نے صاحب تحصیل کی گھبراہٹ دیکھ کر

"محمود کی دھائی"

دی، اور تحصیلدار صاحب نے آنکھیں کھولیں تو خود کو چارپائی پر پایا، اب تو جناب کے دل و دماغ نے جواب دیدیا۔ ہزار ہزار سوچتے ہیں کسی طرح صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچتے۔ اسی اثنا میں پھر سرخ پوش سامنے آکھڑی ہوئی، اور چلنے کا اشارہ کرنے لگی اور یہ بھی ساتھ ہو گئے۔ سیڑھیاں تو خیر بے باکانہ طے کیں مگر حبشی کے پاس پہونچکر جان پر بن گئی۔ آنکھیں بند کیں اس منزل ناہموار کو بھی طے کیا۔ اب دیکھتے کیا ہیں کہ

محمود کی دُھائی

ایک مختصر صحن ہے اور اُس کے سامنے ایک دالان جسمیں بالکل مغلی وضع کا فرش کیا ہوا ہے صدر میں ایک قالین بچھا ہوا ہے اور ایک رحل پر کلام اللہ کھُلا ہوا رکھا ہے، یہاں پہونچ کر سرخ پوش نے کہا تم کیا چاہتی ہو

تحصیلدار، میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو۔ ممکن ہو تو میں تمہاری مدد کردوں۔

سرخ پوش، میں ایک مدت سے اس بنگلہ میں مقید ہوں تم نے سنا ہوگا کہ اس گاؤں کا تعلقدار محمود نامی تھا مجھے اُس سے نسبت ہوگئی مگر چند روز کے بعد اسکو یہ خیال پیدا ہوگیا کہ میں کسی اور کو چاہتی ہوں اور اسنے ایک بنگالی جادوگر کے ذریعہ میری روح کو یہاں مقید کردیا ہے۔ اب میری رہائی کا یہ طریقہ ہے کہ تم سورۂ کہف تین بار اُلٹا پڑھو تو میں اس بلا سے نجات پاسکتی ہوں۔ تحصیلدار صاحب نے کہا ہش جادو کوئی چیز نہیں۔ روح مقید نہیں ہوسکتی یہ صرف جاہلوں کی باتیں ہیں سرخ پوش:۔ ذرا تم سامنے کے کمرے میں جاکر غسل کرلو اور پھر سورۂ کہف تین بار اُلٹا پڑھو تو تم کو معلوم ہوجائے گا۔ اتنا وقت نہیں ہے کہ میں تم سے بحث کروں۔ صاحب تحصیل نے غسلخانہ کا رخ کیا اور نہا دھوکر سیدھے دالان میں پہونچ گئے، پہلے تو آپنے دس برس کے بعد کلام اللہ دیکھا تھا دوسرے یہ کہ آخر سے شروع کرکے شروع میں ختم کرنا بڑی ہی دقت پیش آئی۔ مگر ذی ہمت نوجوان نے دو مرتبہ پڑھ لیا۔ تیسری مرتبہ جب شروع کیا تو اقسام اقسام کی خوفناک آوازیں سُنائی دینے لگیں اور سرخ پوش بھی سامنے ہی کانپتی ہوئی نظر آئی۔ مگر صاحب تحصیل نے کسی بات کی بھی پروانہ کی دو تین آیات اور باقی ہونگی کہ ایک تراقے کی آواز ہوئی اور نوجوان تحصیلدار بیہوش ہوگئے۔

صبح جب چپراسی وغیرہ چاروں سے اُٹھکر بنگلہ کی طرف چلے تو دیکھا کہ نہ بنگلہ ہے اور نہ فقیر ہی البتہ ایک درخت کے نیچے راکھ کا ایک ڈھیر ہے اور اسپر صاحب تحصیل پڑے ہوئے ہیں۔ سامان ایک طرف رکھا ہوا ہے تحصیلدار صاحب کو ہوش میں لایا گیا۔ اس ہوش ربا سانحہ نے صاحب تحصیل پر وہ اثر کیا کہ دیر تک حواس قائم نہ رہے۔ محمود نگر کے بڈھے لوگوں کو بلوا کر دریافت کیا تو انہوں نے یہی کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ یہاں محمود نے کسی کو قید کیا تھا اور وہ قیدی آسیب بن گیا، اسکے سوا ہم کچھ نہیں جانتے۔

تحصیلدار صاحب نے اکثر لوگوں کو اسکی اطلاع دی اور بیسیوں آدمیوں نے اکثر راکھ کے ڈھیر کو دیکھا مگر کوئی بھی صحیح رائے قائم نہ کرسکا۔ کیا یہ واقعہ "بھوت پریت" "عملیات" پر ایقان رکھنے والوں کے تخیل میں ہیجان نہ پیدا کریگا۔؟

تمکین الکاظمی (از گلبرگہ)

فتح اسکندریہ

سنہ ۶۴۱ء میں اسلامی فوجوں نے عمرابن العاص کی زیرکمان شہر سکندریہ کا رخ کیا۔ اسلامی فتوحات کی دھاک حملہ آوروں سے میلوں آگے چلتی تھی۔ گورنر سکندریہ نے نہایت دوراندیشی کی کہ وہ خود آیا اور امیرلشکر سے صلح کا خواہاں ہوا۔

عہدنامہ (۱) یہ امان ہے جو عمرابن العاص نے اہل مصر کو ان کی ذات۔ ان کی جان ان کے مال کے لئے دی۔ یہ امان ان سب کے لئے ان کے جزکے لئے اور تمام لوگوں کے لئے۔

(۲) اس عہدنامہ پر نہ کچھ بڑھایا جائے گا، نہ اس سے کچھ کم کیا جائے گا۔

(۳) اہل نوبیہ کو ملک پر حملہ نہیں کرنے دیا جائے گا۔

(۴) جب اس عہدنامہ کی رو سے امن قائم ہو جائے گا اور دریا کی طغیانی گھٹ جائے۔ تو اہل مصر فی کس ۲ دینار کے حساب سے جزیہ دیں (جسکی مجموعی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ دینار یعنی ساٹھ لاکھ پونڈ ہوتی ہے)

لیکن اگر کوئی گروہ اس عہدنامہ کو قبول نہ کرے اور عہدنامہ سے علیحدگی اختیار کرے تو جزیہ کی میزان میں اسی نسبت سے کمی کردی جائے گی۔ لیکن ساتھ ہی مسلمان اس گروہ کی حفاظت سے بری الذمہ متصور ہونگے۔

اگر کسی سال دریائے نیل میں طغیانی کم آئے تو جس نسبت سے طغیانی کی لیول میں کمی ہوگی اسی نسبت سے جزیہ میں کمی کی جائے گی۔

تمام وہ رومی یا حبشی جو عہدنامہ کو قبول کریں اپنے املاک پر بدستور قابض رہیں گے۔ اور ان سے وہی مقررہ جزیہ لیا جائے گا۔ لیکن جو کوئی اس عہدنامہ کو قبول نہ کرے اسے بلامزاحمت یہاں سے نکل جانے دیا جائے گا۔ اور جب تک وہ اسلامی قلمرو سے

زمیں سے نکل کر کسی محفوظ جگہ پر نہ پہونچ جائے اسکی حفاظت کی جائے گی۔

جزیہ تین اقساط میں واجب الادا ہوگا۔ ہر قسط کل میزان کی ایک تہائی ہوگی۔

اس عہدنامہ کی جملہ شرائط پر خدا اور رسول خدا، امیرالمومنین اور جملہ مومنین ضامن ہیں بلعلم گواہ ہیں زبیر اور ان کے دونوں صاحبزادے عبداللہ و محمد وردان

ایک اسی زمانہ کا عیسائی مورخ اس عہدنامہ کی شرائط مندرجہ ذیل بیان کرتا ہے:۔

(۱) ایک مقررہ مقدار جزیہ کی ادائیگی۔

(۲) ۱۱ مہینے کی عارضی صلح۔ از نومبر ۶۴۱ء لغایت ستمبر ۶۴۲ء

(۳) عارضی صلح کے دوران میں عارضی فوجیں جہاں اب پڑی ہیں وہیں پڑی رہیں لیکن الگ تھلگ۔ اور سکندریہ کے خلاف کوئی فوجی نقل وحرکت نہ کریں۔ اسی طرح رومی فوجیں بھی جملہ مخالفانہ کارروائیاں ملتوی رکھیں گی۔

اسکندریہ کی فوجی آبادی براہ دریا جاسکتی ہے اور تمام مال وخزانہ ساتھ لے جاسکتے ہیں لیکن اگر کوئی رومی سپاہی خشکی کے راستے جانا چاہے تو ایک مہینہ کا خراج ادا کرے۔

کوئی رومی فوج واپس نہ آئے۔ نہ دوبارہ مصر کے حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

مسلمان گرجوں کو نہ چھیڑیں نہ کسی طرح سے عیسائی مذہب میں دست اندازی کریں۔

یہودیوں کو بھی سکندریہ میں رہنے دیا جائے۔

تا تکمیل صلح ایک سو پچاس فوجی اور پچاس شہری آدمی بطور یرغمال رومی دینگے۔

رومی بادشاہ نے عہدنامہ پر تصدیقی دستخط بھی ثبت کردیے اور دسمبر ۶۴۱ء کو پہلی قسط جزیہ جمع کرکے حاکم شہر نے مسلمانوں کے کیمپ میں پہنچادی۔

مسلمانوں کے خلیفہ کی آخری منظوری کے لئے عہدنامہ مدینہ منورہ بھیجا جانا ضروری تھا اسلئے عمرو ابن عبدالعاص نے فتح اسکندریہ کی خوشخبری لیجانے کے لئے معاویہ ابن حدیج الکندی کو

طلب کیا۔فیلڈ مارشل سے جب قاصد نے درخواست کی کہ ایسی اہم فوجی کامیابی کی رپورٹ تاسے لکھ کر دی جائے تو فاتح اسکندریہ نے ڈانٹ کر کہا "لکھنے پڑھنے کی ضرورت کیا ہے کیا تم عربی النسل نہیں ہو کہ آنکھوں دیکھے واقعات زبانی ادا کر سکو۔

ریگستان کا دور و دراز سفر طے کر کے یہ قاصد دوپہر کے وقت مدینہ منورہ پہنچا اور اونٹ کو باہر بٹھا کر مسجد میں داخل ہوا۔ اتنے میں حضرت عمر فاروقؓ کے گھر سے ایک خادمہ مسجد میں آئی اور نو وارد پر سفر کے آثار دیکھکر اسکے احوال کی پرسان ہوئی قاصد نے اپنا حال بیان کرتے ہوئے یہ بھی بیان کیا کہ "مصر سے سلمانوں کے سردار عمر ابن العاص کے پاس سے خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں ایک ضروری پیغام لیکر آیا ہوں"۔ خادمہ نے گھر جاکر خلیفہ کو اطلاع دی اور پھر فوراً ہی مسجد سے قاصد کو بلوا لیا گیا۔

قاصد نے خلیفہ کی خدمت میں پہنچکر بعد سلام علیکم عرض کیا کہ "یا خلیفۃ المسلمین میں ایک بڑی خوش خبری لے کر آیا ہوں، خدا نے ہم پر اسکندر انعام کر دیا ہے"۔ خلیفہ یہ سنکر قاصد کو ساتھ لیکر مسجد میں تشریف لائے، موذن نے اذان کہی مسلمان مسجد میں جمع ہوئے اور اسکندریہ کی فتح کی خوشی سر بسجود ہو ہو کر منائی گئی۔ اسکے بعد خلیفہ مصر کے ایلچی کو ساتھ لیکر دولت سرا میں داخل ہوئے اور چند رکعت نماز ادا کرنے کے بعد کھانا چننے کا ارشاد فرمایا، دسترخوان جو کھجور کے پتوں کی چٹائی تھی بچھایا گیا اور اس پر روٹی جو غالباً جَو کی ہوگی۔ اور تیل جو یقیناً زیتون کا تھا رکھا گیا۔ اور ہرقل سے خراج لینے والے خلیفۃ المسلمین اور ایک معمولی سپاہی اکٹھے کھانا کھانے لگے۔ قاصد جو مصر جیسے زرخیز ملک کے انواع واقسام کے لذیذ کھانے کھا چکا ہوگا اسے بھلا یہ نان جویں کاہے کو پسند آنے لگی۔ خلیفہ نے دیکھا کہ ان کا مہمان کھانے کی طرف کم رغبت ظاہر کر رہا ہے تو آپ نے غیر معمولی دریا دلی سے "کچھ اور" بھی لانے کا حکم دیا، چنانچہ دسترخوان پر کچھ کھجوریں بھی لاکر رکھی گئیں لیکن خلیفۃ المسلمین کی مہمان نوازی کی وسعت کھجوروں کے بعد ختم تھی۔

قاصد نے معذرتاً کہا کہ "چونکہ میں یہاں دوپہر کو پہنچا تھا۔ فوراً ہی خلیفہ کی خدمت میں

حاضر نہیں ہوا کہ میں نے خیال کیا کہ دوپہر کا وقت ہے امیرالمومنین آرام فرماتے ہونگے"۔

امیرالمومنین :- "جو تو نے کہا بُرا کہا، جو تو نے خیال کیا، بُرا خیال کیا، میرے دن کے سونے میں میری رعیت کی بربادی کا خوف ہے، اور میرے رات کے سونے میں میری اپنی تباہی کا خدشہ ہے، ان دو اہم خطروں کے ہوتے ہوئے میں کیسے سو سکتا ہوں"۔

قبضۂ اسکندریہ | عہدنامہ کی رو سے ۱۱ مہینے کی عارضی صلح ختم ہو جانے پر مسلمانوں کا باقاعدہ سکندریہ پر قبضہ ہو گیا۔ خلیفہ نے فاتحان کو سکندریہ کے عالیشان محلات میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت نہ دی اسلئے انہوں نے دریا پار قسطاط نامی بستی بسائی، عمر ابن العاص سکندریہ کی حفاظت اور انتظام کے لئے صرف ایک ہزار سپاہی چھوڑ کر دوسرے علاقہ جات کے سر کرنے میں مشغول ہو گئے۔

رومیوں کی بدعہدی و بغاوت | مسلمانوں کے قبضے کو تقریباً ۳ سال گذرے ہونگے کہ نواح سکندریہ کا ایک عیسائی رئیس طلما نام یہ دیکھ کر کہ اسکندریہ کی حفاظت کے لئے صرف مٹھی بھر مسلمان سپاہی رہ گئے ہیں اور فاتح مصر عمر ابن العاص بھی موجود نہیں قسطنطنیہ پہنچا اور بادشاہ سے جا کر مسلمانوں کی کمزور حالت بیان کی۔ بادشاہ جسنے ۶۴۱ء میں عہدنامۂ صلح پر دستخط کئے تھے ۶۴۴ء میں عہدنامہ کی صلح کو بھول گیا اور اسنے شرط نمبر ۵ کے ہوتے ہوئے خفیہ طور سے ایک زبردست جنگی بیڑہ کی تیاری کی۔ ان دنوں عرب دریا کو ہوّا سمجھتے تھے ان کی اس زمانہ میں ایک بھی کشتی نہ تھی جو نہیں بحری مہم کی تیاری کی خبر دیتی۔

چنانچہ عربوں کو خبر بھی نہ ہوئی اور ۳۰۰ جہازوں کا بیڑہ سکندریہ کی بندرگاہ پر آ کر لنگر انداز ہو گیا اور بغیر کسی مزاحمت کے فوج خشکی پر اُتر پڑی۔

رومیوں کا قبضۂ اسکندریہ | ایک ہزار عرب جو وہاں موجود تھے ایسی زبردست طاقت کو کہاں روک سکتے تھے لڑے اور مارے گئے۔ رومی فوج نے بڑھ کر سکندریہ پر قبضہ کر لیا۔ رومی عیسائیوں نے سکندریہ پر دوبارہ قبضہ ہو جانے کی خوشی میں گردو نواح کی عیسائی بستیوں کو دل کھول کر لوٹا کھسوٹا اور ان کے

وہ سلوک کیا جو مفتوحہ ممالک میں وحشی اقوام کیا کرتی ہیں۔

مسلمانوں کا دوبارہ قبضہ | رومیوں کو ملک پر قبضہ کئے کم و بیش چھ مہینے ہی گذرے ہوں گے کہ عمر ابن العاص مسلمان مجاہدین کی ایک فوج لئے آپہونچا، شہر کی مضبوط سنگین فصیلوں کو دیکھ کر عرب سردار اپنے اس نرم اور فیاض سلوک سے پچھتایا جو اسنے ۳ سال پیشتر سکندریہ کی فتح کے وقت روا رکھا تھا۔ اور شہر کی ایسی مضبوط فصیلوں کو اسی حالت میں رہنے دیا تھا اور عیسائی باشندوں کی تکلیف کے خیال سے محافظ فوج اسقدر قلیل تعداد میں چھوڑی تھی، آج اس نے عہد کیا کہ اگر اب کے شہر ہاتھ آگیا تو اسکی فصیلیں تو ضرور ہی مسمار کرا دوں گا۔

۶۴۶ء کے موسم گرما میں مسلمان فوج نے ایک سخت مقابلہ کے بعد دھاوا کر کے شہر لے لیا۔ عیسائیوں کی بدعہدی۔ انکی بغاوت۔ مسلمان فوج کا خون۔ آج غالب مسلمانوں کے جذبۂ انتقام بھڑکانے کے لئے کافی تھا۔ عیسائی مورخ بیان کرتے ہیں کہ مسلمان فوج جب دھاوا کر کے شہر میں داخل ہوئی تو جو سامنے آیا اُسے تلوار کے گھاٹ اُتارا۔

(غالباً یہ فوجی لوگ ہوں گے جو قدم قدم پر مسلمان فاتحوں کی مزاحمت کرتے ہونگے)

یہاں تک کہ عمر ابن العاص نے وسط شہر میں پہنچ کر حکماً مسلمانوں کی تلواریں میان میں کرائیں اس جگہ جہاں سپہ سالار نے یہ حکم دیا تھا۔ وہاں اس عفو و ترحم کی یادگار قائم رکھنے کے لئے ایک مسجد بنائی گئی جسکا نام مسجد رحم رکھا گیا۔

باغیوں کے ساتھ سلوک | سرغنۂ بغاوت و بانی فساد طلما جسکی سبب آگ لگائی ہوئی تھی۔ جس نے مسلمانوں کی فوجی طاقت کی کمزوری کی مخبری کی تھی۔ اور قسطنطنیہ سے رومیوں کی فوج کے ہمراہ آیا تھا۔ اس لڑائی میں گرفتار ہو کر امیر عمر ابن العاص کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس کی شرارت سے ہزارہا بندگان خدا کا خون بہا ہو، جس نے ایک ایسی سلطنت کے خلاف آتش بغاوت کو بھڑکایا ہو جو ایک مصدقہ عہد نامہ کی رو سے قائم ہو چکی ہو۔

مہذب دنیا کے قانون کی روسے ایسے غدار و ۔ آ فساد کی نرم سے نرم سزا موت ہی ہو سکتی ہے ۔ لیکن اسکو جو غیر مہذب مسلمان حاکم نے سزا دی (اور وہ بھی کورٹ مارشل سے) وہ ایک پُرلطف مذاق سے کم نہیں ۔

عمرابن العاص کے حکم سے اسکو طلائی بازوبند پہنائے گئے ۔ سر پر تاج رکھا گیا اور کندھوں پر زر لبفت کی عبا اُڑھاکر اس سے کہا گیا کہ " جا، قسطنطینیہ جاکر ایک اور رومی فوج لیکر آ ۔

اور جب بعد میں اسنے معمولی جزیہ ادا کرنے کے عوض اور لوگوں کی طرح پُرامن رعیت بن کر رہنے کی اجازت چاہی تو اسی اجازت دی گئی ۔

بعض علاقہ جات کے باشندے جنہوں نے بغاوت میں سرگرم حصہ لیا تھا ۔ گرفتار ہوے تو ان کو مدینہ منورہ بھیجا گیا ۔ لیکن خلیفۂ وقت (حضرت عمر فاروق) نے ان لوگوں کو سزا دیے بغیر ان کے گھروں کو واپس کردیا ۔ اور سکندریہ اور مفصلات کے باشندوں کے لئے جو بغاوت میں شامل ہوے تھے ایک عام معافی کا پروانہ عطا فرمایا اور ان سے وہی شرائط قائم رکھیں جو عہدنامۂ ۶۴۱ء کی روسے طے پائی تھیں ۔

خلیفۃ المسلمین کے اس خلاف تہذیب دستور العمل کا یہ اثر ہوا ۔ کہ :۔

مفصلات سکندریہ کے بعض دیہات کے لوگوں نے عمرابن العاص کے پاس دعوی کیا کہ رومیوں کی بغاوت ۔ ان کے دوران قیام اور بعد میں، ان سے جو جنگ ہوئی ہے اسکے باعث ہم لوگوں کی فصل تباہ ہوگئی ہیں، ہمارے گھر بار رومیوں نے لوٹ لئے ہیں عہدنامۂ ۶۴۱ء کی روسے مسلمان ہمارے جان و مال کے محافظ قرار پاے تھے ۔ اس آشوب زمانہ میں مسلمانوں نے ہماری حفاظت نہیں کی اور ان کی حفاظت نہ کرنے سے ہمارا بہت نقصان ہوا ہے ۔

ان شکایات کی معقولیت میں تو کلام نہیں لیکن تاریخ بہت کم ایسے فاتح دکھا سکیگی جن کی ضمیر پر ایسی شکایات کا کوئی اثر ہو۔

مسلمانوں کے "غیر مہذب" افعال کی فہرست میں عمرابن العاص کا یہ کارنامہ کسی قدر شوخ سیاہی سے لکھنے کے قابل ہے کہ اس پر اس درخواست نے یہ اثر کیا کہ اس نے ان تمام دعویداروں کے نقصان کا معاوضہ ادا کر دیا۔

یہ واقعات بطور نمونہ از خروارے اُس زمانہ کے ہیں جب کہ دنیا ابھی اسقدر ترقی یافتہ نہیں تھی جسقدر اب ہے۔

تہذیب پر آج ۱۳ صدی کے علوم وفنون کا صیقل ہو چکا ہے۔ مگر تاہم یہ کارنامے اُن مسلمانوں کے ہیں جن کی نسلیں مغرب سے ہزار سال "تہذیب" کی تعلیم پانے کے بعد آج بھی غیر مہذب کہلاتی ہیں۔

مشرق، مغرب کا عموماً اور اسلام، عیسویت کا خصوصاً مشکور ہے کہ مغرب نے اشاعت تہذیب کے لئے گزشتہ صدیوں میں بے حد مشقت اُٹھائی ہے، اور اب بھی چند رہی سہی اسلامی سلطنتوں کو مہذب بنانے میں بیچارہ مغرب کس قدر بے تاب ہے مسلمانوں نے چھٹی صدی سے لیکر آج تک تہذیب میں جسقدر ترقی کی ہے یہ کچھ تو مذہب عیسوی اور کچھ سیاست مغرب کے دم قدم کا صدقہ ہے۔ ورنہ یہ تو ویسے ہی ظالم، ڈاکو، عہد شکن، متعصب، غیر مہذب وغیرہ رہتے جیسے کہ ان کی چھٹی صدی کے سلف تھے جن کے کچھ کارنامے بیان ہوئے ہیں +

(ماخوذ از انگریزی)

ملک برکت علی

*

اناتول فرانس

آج ادبی دنیا کے گوشہ گوشہ میں اس بلبل شیوہ بیاں کی وفات حسرت آیات سے تاریکی چھائی ہوئی ہے، وہ علمبردار آزادی، اشتراکیوں کا سردار، دنیائے صحافت کا درخشندہ آفتاب تھا جسکی تیز شعاع ادب نے آنکھوں کو منور کر دیا تھا، اس فاضل ہستی نے جسے دور حاضرہ کے ارباب سخن میں ممتاز حیثیت حاصل تھی نصف صدی تک ادبیات کا صدر نشین رہکر داعی اجل کو لبیک کہا۔

یہ خبر دنیائے ادب میں نہایت غم و حسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ باکمال ادیب، فرانس کا مایۂ ناز انشا پرداز یعنی اناتول فرانس نے انتقال کیا، اناتول درحقیقت اُن برگزیدہ ہستیوں میں سے تھا جنھیں زمانہ مدتوں میں پیدا کرتا ہے اور جسکی پوری قدر ان کے مرنے کے بعد ہوا کرتی ہے، دنیائے صحافت کو عموماً اور فرانسیسی ادب کو خصوصاً وہ نقصان عظیم پہونچا ہے کہ جسکی تلافی مشکل ہے۔

اناتول فرانس کی ولادت پیرس میں ۱۶ اپریل ۱۸۴۴ء کو وقوع میں آئی، اسٹانسلاس کے کالج میں تعلیم حاصل کی فارغ التحصیل ہو کر علمی دنیا میں قدم رکھا، وہ ایک زبردست فسانہ نویس تھا جسکی تحریر نے ایک عالم کو حیرت میں ڈالدیا اسی ناول نویسی اور فسانہ نگاری کے ذریعہ اُسے یہ شہرت لازوال حاصل ہوئی وہ اپنے افسانوں اور ناولوں میں زیادہ تر اپنے ملک کی تمدنی حالت سے بحث کرتا ہے۔ وہ فرانسیسی بیت الحکمار، اور آنر آف لیجن، کا ممبر تھا۔

پوری ۸۰ سال کی عمر پاکر چند روزہ علالت کے بعد ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو یہ مشہور ادیب و انشا پرداز اس دنیائے فانی سے رخصت ہوا، اسے فرانسیسی علم ادب میں اچھی دستگاہ تھی، اور ناول نویسی و فسانہ نگاری میں کمال مہارت حاصل تھی اسکی طرز تحریر سادہ دلکش اور دلنشین ہوتی ہے، اسکی بلند خیالی، اعلیٰ تخیل، بیساختہ پن، ہر ناظر کو گرویدہ کر لیتا ہے۔ اسی واسطے دن بدن اسکے معتقدین کی تعداد بڑھتی گئی، اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقے نے اسے ناخدائے ادب گردانا، دوسری زبانوں نے بھی اس علمی خزانہ کو اپنے ادب میں

اناطول فرانس

منتقل کرلیا، انگریزی میں اسکی کئی ایک کتابوں کا ترجمہ بھی ہوچکا ہے۔ اپنی علمی خدمات کے باعث اسنے بہت جلد ادبی دنیا میں ممتاز حیثیت حاصل کرلی اسکے افسانے نرے افسانے نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ میدان ترقی میں قدم بڑھانا سکھاتے ہیں۔ مردہ دلوں میں جوش پیدا کرتے ہیں اور وہ طریق بتاتے ہیں جنسے ان میں حیات قومی کا احساس پیدا ہوسکے اسکی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کی ہمدردی سے بھرا ہوا تھا، ناولیں محض خیال آرائی اور دلچسپ واقعات سے بھری ہوئی نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی تحریروں میں اخلاق مسائل، تمدن وتہذیب کی اصلاح کے طریق نہایت دلچسپ پیرایہ میں بیان کرتا ہے جس سے دیر ایک خاص اثر ہوتا ہے اسکی تحریر میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو زبان اور اہل زبان کے لئے سرمایہ ناز ہوسکتی ہیں زبان کی خوبیوں کے ساتھ اخلاق اور فلسفیانہ مسائل اور بہبودی خلائق کے متعلق متفرق خیالات نہایت لطیف پیرایہ میں لکھتا ہے اسکے ہاں جذبات کا فقدان نہیں بلکہ وہ اپنے جذبات کو ایک نہایت متانت آمیز ظرافت کے پیرایہ میں پیش کرتا ہے وہ عجیب دلکش انداز میں سوسائٹی کی برائیوں کی نکتہ چینی کرتا ہے اور ان کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے جب کسی واقعہ کا ذکر کرتا ہے تو من وعن اسکی تصویر کھینچ دیتا ہے جس سے ناظرین کے دل پر ایک خاص اثر ہوتا ہے۔

اناطول بلحاظ شستگی زبان وپاکیزگی بیان زمانہ حال کے مصنفین میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ بارتھو اسکی خدمات کا اعتراف کرتے ہوے نہایت شاندار الفاظ میں اسکی علمی کوشش کی داد دیتا ہے۔ اور اسے "فرانسیسی ادب کا درخشندہ آفتاب" لکھتا ہے۔

اسکی وفات کا ذکر کرتے ہوے اڈیٹر انڈین ڈیلی میل لکھتا ہے "اسکی وفات سے فرانس سے ہمیشہ کیلئے گذشتہ صدی کا ایک زبردست عالم جدا ہوگیا"۔

انگلستان کا زبردست فلاسفر- الف- ایچ براڈلے، ماہر علم المعیشت الفرڈ مارشل اور مشہور ناول نویس میری کوریلی، ان تینوں نے بھی اس سال انتقال کیا۔ شاید ۱۹۲۴ء علمی دنیا کے لئے نہایت غیر خوش آیند ثابت ہوا۔

سعیدی بی اے (علیگ)

اطالیہ کے زرّین اقوال

۱۔ اپنے دوست کا تذکرہ ہمیشہ خیر میں کیا کرو، اور اپنے دشمن کا نہ بھلائی میں نہ برائی میں

۲۔ بزرگوں کا اور اُن لوگوں کا تذکرہ جنہوں نے دنیا کو خیرباد کہا ہے، ہمیشہ عمدہ الفاظ میں کیا کرو، یا خاموش ہو۔

۳۔ شیر اُس کے پنجہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ جب درخت گر جاتا ہے تو ہر شخص اُسکے گرنے پر کلہاڑی لے کر دوڑتا ہے۔

۵۔ جو آرام لیتا ہے وہ کام کرتا ہے۔

۶۔ اُس شخص کو زیادہ تعداد میں ملازمین رکھنا چاہئے جسکا برتاؤ اپنے مالک سے ٹھیک نہ رہا ہو

۷۔ وہ پہلا اپنے آپ کو بیوقوف کہے جو اپنے پالتو کُتّے کی جان لیتا ہے۔

۸۔ جو بھیڑیوں میں رہتا ہے وہی بھیڑیوں کی بولی سیکھتا ہے

۹۔ جو اپنے کھیت میں کانٹے بوتا ہے، اُس کو ننگے پاؤں نہ جانا چاہئے۔

۱۰۔ جو بہت جانتا ہے وُہ کم بولتا ہے۔

۱۱۔ ایک کیل دوسری کیل کو نکالتی ہے۔

۱۲۔ جب تک پانی کی گہرائی نہ دیکھو اُس وقت تک پار ہونے کی کوشش نہ کرو۔

(ترجمہ)

میرزا عبد الغفور سعید
(گلبرگہ ...... دکن)

پاپیا،

(بسلسلۂ گزشتہ)

گذشتہ باب میں ہم نے آربےسس کو گلاؤکس اور اُس کے ساتھی سے رخصت ہوکر سمندر کے کنارے چھوڑا تھا، ساحل کے زیادہ بارونق حصہ پر پہنچکر وہ سامنے کے منظر کو دیکھنے کے لیئے رُکا۔ اسکے سانولے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ کی جھلک آئی اور وہ خود بخود گویا ہوا، تم سب کے سب عقل سے بے بہرہ ہو۔ یونانی ہو یا رومی، جو کچھ بھی تم نے حاصل کیا ہے۔ مصر کی قدیم حکمت کی خوشہ چینی سے حاصل کیا، تمہاری شاعری تمہارے قوانین، تمہارا فن حرب۔ سب ہی کچھ ہم سے چرایا ہوا ہے جیسے غلام کسی دعوت کے دسترخوان سے بچے کھچے ٹکڑے چراتا ہے۔ اے حرص وہوا کے بندو مشقت کیئے جاؤ۔ میری نظروں میں تم حقیر ہو، میری طاقت کا تم مقابلہ نہیں کرسکتے۔ عقل کے زور سے میری قوت ارادہ تم پر غالب ہے جہاں تک آدمی دہوکا کہا سکتا ہے وہاں تک میرا اثر ہے۔ اور آدمی تو ہر جگہ دہوکا کھا سکتا ہے۔

یہہ کہتا ہوا قبطی آگے بڑہا۔ اس کا اونچا لمبا قد لوگوں کی بھیڑ پر چھایا ہوا تھا تھوڑی دیر کے بعد وہ آئی سس کے مختصر سے مگر خوبصورت ہیکل تک پہونچ گیا۔

ان دنوں پمپیائی کے باشندوں میں اس مندر کی بہت چرچے تھے۔ اسکے پجاریوں کی کرامات بھی عجیب تھیں، صرف اسلیئے نہیں کہ وہ ایک غیر مانوس زبان میں بیان کی جاتی تھیں۔ بلکہ اسلیئے کہ ان پر بلا چون وچرا اعتقاد کرلیا جاتا تھا۔

جب آربےسس مندر کے صحن میں داخل ہوا تو اسنے دیکھا کہ مختلف مذہبوں کے سامنے ایک جم غفیر جنمیں زیادہ تر تجارت پیشہ لوگ تھے۔ دم بخود کھڑا ہے۔ صحن کے دوسرے سرے پر صومعہ تھا جس پر جانے کیلئے سنگ مرمر کے سات زینے تھے، دیواریں بُتوں سے مزین تھیں۔ بیچ میں ایک بیضوی چبوترے پر آئی سس اور اسکی رفیق دیوتا اور کئی ایک بت نصب تھے۔

وہاں محض آئی سس ہی کی پوجا نہیں ہوتی تھی۔ مصر کی قدیم طرز کی عبادت میں مختلف زمانہ اور

اور مختلف ممالک کی بدعتیں مخلوط ہوگئی تھیں۔ اور آر بے سس جو مصر کے قدیم شاہوں کی نسل سے تھا اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کی یہ تمسخر آمیز تحقیر دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتا تھا۔

اسنے ایک پاس کھڑے ہوئے تاجر کو مخاطب کر کے کہا۔

"آج آئی سس کی ہیکل میں آپ لوگوں کے آنے کا کیا سبب ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قربانی پیش کی جانے والی ہے۔ اور آپ لوگ کسی نشان غیبی کے منتظر ہیں۔ کس حاجت کے لئے آپ نشان چاہتے ہیں۔؟

تاجر" ہم لوگ سوداگر ہیں۔ ہمارے جہازات کل اسکندریہ کو روانہ ہونگے۔ ہم یہ دریافت کرنے کے لئے آئے ہیں کہ ان کا کیا حشر ہوگا۔ میں اگرچہ قربانی پیش کرنے والوں میں سے نہیں ہوں لیکن جہازات کی سلامتی کا میں بھی خواہاں ہوں۔

پجاری۔ جب تک قربانی کے جانور کی آنتوں میں نشان غیبی کا منتظر رہا۔ آر بے سس کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار رہے لیکن جب نشان کے ظاہر ہونے کا اعلان کیا گیا اور آگ نے قربانی کو جلانا شروع کیا تو اسکے چہرے پر اطمینان کا رنگ پھر گیا۔

مجمع پر چندے موت کا سا سکوت چھا گیا۔ پجاری آئی سس کے بت کے ارد گرد جمع ہوئے بت کے اندر ایک جھنجھناہٹ کی سی آواز سنائی دی۔ تین بار سر نے جنبش کی، ہونٹ ہلے اور ایک عجیب آواز میں یہ الفاظ سنائی دیے۔

"موجیں جنگی گھوڑوں کی طرح بھرتی ہیں، سمندر کی تہ میں چٹانوں کی قبریں تیار رکھی ہیں مستقبل کی پیشانی میں ہولناک خطرات جھلکتے ہیں لیکن اس خوفناک گھڑی میں بھی تمہارے جہاز سلامت ہیں"۔

آواز بند ہوئی اور تاجروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھکر اطمینان کا دم لیا۔" اس سے زیادہ صاف پیشین گوئی اور کیا ہو سکتی ہے۔ سمندر میں طوفان آئے گا مگر ہمارے جہازات بچ جائیں گے اے عالیشان آئی سس تیری جے ایک مختصر آخری دعا کے بعد رسم کا خاتمہ ہوا۔ لوگ رخصت ہوئے لیکن قبطی ٹھیرا رہا۔ اور جب مندر بالکل خالی ہوگیا تو ایک راہب نے آکر آربی سس کو ڈنڈوت کی اس راہب کا چہرہ

نہایت بدنما تھا۔ اسکی تنگ پیشانی اور گھٹی ہوئی کھوپری بالکل افریقہ کے حبشی کی سی تھی۔ اسکی پیشانی پر جھریاں تھیں۔ آنکھیں سیاہ اور چھوٹی۔ ناک موٹی اور چپٹی، لیکن جسم کا قوی تھا اور ہر طرح کی جسمانی مشقت کو برداشت کرنے کے قابل معلوم ہوتا تھا۔

قبطی نے اس راہب کو مخاطب کرکے کہا "کلے نس، میری ہدایات پر عمل کرنے سے تم نے بت کی آواز کی نقل اتارنے میں بہت کچھ ترقی کرلی ہے، اور تمہارے بول نہایت عمدہ تھے جہاں تک ہوسکے ہمیشہ نیک فال ہی بیان کیا کرو۔

لیکن آج تو مجھے تم سے ایک دوسرے معاملے پر گفتگو کرنا ہے، آؤ تمہارے حجرے میں چلیں"

راہب آربی سس کو ایک حجرے میں لے گیا۔ جہاں ایک میز پر پھل، انڈے اور گوشت کی کبابیاں اور شراب کی صراحیاں رکھی تھیں۔ دونوں اس میز کے گرد بیٹھ کر کھانے اور باتیں کرنے میں مشغول ہوگئے۔

آربی سس "تم کو میری عادت تو معلوم ہی ہے کہ میں زیادہ کم عمر لوگوں سے راہ و رسم ملاقات پیدا کرتا ہوں، وہ اسلئے کہ میں ان کے کم جہاں دیدہ دلوں پر اپنی مرضی کے مطابق نقش مذہب بٹھا سکتا ہوں تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ کچھ عرصہ ہوا نیپلز میں مجھے خوبصورت آیونی اور اسکے بھائی اے پی ڈسس سے واسطہ پڑا۔ ان کا باپ جو میرا آشنا اور معتقد تھا مرتے وقت مجھے ان کا سرپرست بنا گیا۔

میں نے فرائض سرپرستی ادا کرنے کی یوں کوشش کی ہے کہ اپی سی ڈس کو تو میں نے آئی سس کے سنجیدہ مذہب کی تلقین کی اور وہ چونکہ طبعاً جویائے مذہب تھا میری تلقین کا اثر جلد مان گیا، چنانچہ اب وہ تمہارے پجاریوں میں شامل ہے۔ کلے نس "ہاں ہے تو سہی، مگر تم نے اسے مذہب سکھا کر عقل سے کھو دیا اسے جب سے ہمارے عیب معلوم ہوئے ہیں وہ مضطرب رہتا ہے۔ ہمارے پوشیدہ رہنے اور بت کی آواز کی نقل کرنے سے نفرت کرتا ہے اسی رنج میں وہ دن بدن گھلا جاتا ہے، ہماری رسمیات مذہبی میں شریک ہونے سے پہلو تہی کرتا ہے۔ مجھے تو یہ بھی شک ہے کہ وہ چھپ چھپا کر اس جدید فرقہ عیسائیت سے ملتا جلتا ہے اور یہ فرقہ ہمارے معبودوں کی تکذیب کرتا اور ہماری کرامات کو تلبیس ابلیس کہہ کر پکارتا ہے۔

آربے سس۔ جب میں پچھلی دفعہ اس سے ملا ہوں تو مجھے بھی یہ خدشہ ہوا تھا کہ کچھ عرصہ سے وہ ہمارے سامنے آنے سے کتراتا ہے۔ ضروری ہے کہ میں اس سے ملوں اور اپنی تلقین کی تجدید کروں، میں اسے

یہ بتاؤں گا کہ مذہب کے دو درجے ہیں، پہلا درجہ ایمان ہے جو جہلاء کے لئے ہے، اور دوسرا درجہ فریب ہے جو عقلاء کے لئے ہے۔

کلی نس "۔ مجھے تو پہلا درجہ نصیب نہیں ہوا۔ اور میرا خیال ہے کہ تم بھی اس سے محروم ہی رہے ہو۔"

آر بی سس "۔ نہیں کلے نس، تم غلطی پر ہو۔ مجھے میری دانست کے موافق ایمان حاصل ہو اہے۔ اور اس سے مجھپر ظاہر ہو گیا ہے کہ . . . خیر اسکو جانے دو۔ سر دست زیر بحث تو یہ مضمون ہے کہ ایبی سی ڈس کو پوجاری بنا کر میں نے بھائی کے متعلق اگر اپنا فرض سرپرستی ادا کر دیا ہے تو اسکی ہمشیرہ کے متعلق میرا ارادہ ہے، تم جانتے ہو کہ اسے میں اپنی دلہن بنانا چاہتا ہوں۔؟

کلے نس۔ میں نے سنا ہے کہ وہ بہت حسین ہے"۔

آر بی سس۔ ہاں وہ حسن میں بے عدیل ہے۔ لیکن صرف یہی نہیں، اسکے اندر ایک ایسی روح ہے جو میری روح کے ساتھ ملنے کے قابل ہے۔ اسکی عقل جلایافتہ ہے۔ اس کا کلام شاعرانہ ہے اس کا دماغ گہری سچائیوں کو فوراً قبول کرتا ہے، وہ رقیق بھی ہے اور دلیر بھی۔ میں تمام عمر عورت میں ان اوصاف کا جو یا رہا ہوں۔ یہ جوہر صرف اس میں ملتے ہیں۔ خواہ کچھ ہو آئیونی کو میں اپنی بنا کر رہوں گا۔

پجاری۔ تو کیا وہ ابھی تمہاری نہیں ہوئی۔

آر بی سس "۔ نہیں ابھی نہیں۔ اسکو مجھسے محبت تو ہے مگر محبت برادرانہ"۔

میں تمہیں ان کا حال سناؤں، یہ دونوں بھائی بہن جوان اور امیر تھے۔ آئیونی خواہاں شہرت اور مغرور۔ مغرور اپنی فراست، اپنی شاعری، اپنی طرز گفتگو پر۔ جب اس کا بھائی تمہارے ہیکل کے پجاریوں میں شامل ہوا تو بھائی کے قرب کی خاطر آئیونی پمپائی میں چلی آئی یہاں آکر اسکی لیاقت کو چار چاند لگ گئے۔ لوگ جوق درجوق اسکی دعوتوں میں شامل ہوتے ہیں۔ اسکی سحر آگین آواز لوگوں کو کھینچ لاتی ہے۔ اس معاملہ میں میں نے بھی اسکو ہمت دلائی۔ میں چاہتا تھا کہ اسکے چاہنے والوں کی فہرست بڑھے ایسے لوگ اس کا دم بھریں جو تہی مغز، تہی دست، عیاش، اور بدمذاق ہوں، تاکہ اسکی اعلیٰ طبیعت ان سے متنفر ہو کر خالص محبت کی متلاشی ہو، جب یہ نوبت پہونچے گی تو میں اپنا منتر پھونکوں گا اور اسکے دل کو قبضے میں کر لوں گا آئیونی جوانی، خوبصورتی، بانکپن پر فدا ہونے والی ہستی نہیں اسکی تو دماغ پر قابو پانے کی ضرورت ہے

اور میں نے عمر بھر لوگوں کے دل و دماغ پر قابو پانے کی مشق کی ہے۔

کالے نس "۔ ہمیں کسی رقیب کا تو ڈر نہیں ؟"

آر بی سس ۔ او بالکل نہیں ۔ اُس کا یونانی الاصل دل ان وحشی رومیوں سے نفرت کرتا ہے اس قوم کے کسی فرد کے متعلق اگر اسکے دل میں ذرہ بھر بھی جگہ ہو گی تو وہ اپنی ذات سے خود متنفر ہو جائے گی۔

کالے نس ۔ لیکن تم تو رومی نہیں ۔ بلکہ قبطی ہو ۔

آر بے سس ۔ مصر تو انیتھز کا باوا آدم ہے ۔ یہ تو میں نے اسکے ذہن نشین کر دیا ہے ، وہ اُن قدیم شاہوں کی عزت کرتی ہے جن سے میرا سلسلۂ نسب ملتا ہے ۔ لیکن باوجود اس اثر کے میں کچھ دنوں سے مضطرب ہوں ۔ وہ معمول سے زیادہ خاموش رہتی ہے ، اسے غم اور راگنیاں بھاتی ہیں ۔ کسی ظاہر اسباب کے بغیر وہ سرد آہیں بھرتی ہے ۔ اسکی وجہ یا تو ابتدائے عشق ہے ۔ یا حسرت عشق ۔ کوئی صورت ہو اب وقت ہے کہ میں اپنا عمل حسب شروع کروں ۔ اسی لئے میں تمہارے پاس آیا ہوں ۔

کالے نس ۔ لیکن میں کس طرح تمہاری مدد کر سکتا ہوں ؟

آر بی سس ۔ میں اسے اپنے گھر پر مدعو کرنے والا ہوں ۔ میں اسے حیران و ششدر کرنا چاہتا ہوں مصر کے تمام فنونِ لطیفہ استعمال کرنے ہونگے ۔

مذہب کے خفیہ بھیدوں کے پردے میں اس پر میں طبیعت کے راز ظاہر کروں گا ۔ لیکن پہلے ہم اسکے بھائی کو قابو میں لے آئیں اس سے یہ آسان تر ہے ۔ میری ہدایات غور سے سنو +

برکت علی

(باقی باقی)

تنقید و تبصرہ

معارف

ہندوستان میں یوں تو صدہا رسائل اپنی اپنی نوعیت کے لحاظ سے ممتاز نظر آرہے ہیں اور علمی ادبی خدمات اچھے پیمانہ پر انجام دے رہے ہیں، لیکن جب معارف کا کوئی نمبر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے تو بے ساختہ زبان سے صدائے تحسین نکلتے ہوئے دل میں ایک مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے، واقعی مولینا سلیمان ندوی کی علمی خدمات قابل قدر و لائق داد ہیں۔ ضخامت ۸۰ صفحات، کاغذ عمدہ، لکھائی چھپائی دیدہ زیب چندہ سالانہ عہ (دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ سے طلب فرمائیے)

تحفہ

یہ ماہوار رسالہ حیدر آباد سے حال ہی میں جاری ہوا ہے، ایک انجمن اس رسالہ کو ترتیب دیتی ہے دو نمبر ہمارے سامنے ہیں اور ہر حیثیت سے امید افزا ہیں، نوعیت مضامین اعلی ہے اور ترتیب میں بڑی کاوش سے کام لیا گیا ہے۔ ضخامت ۴۸ صفحات، کاغذ لکھائی چھپائی دیدہ زیب قیمت سالانہ عہ انجمن ارباب اردو سرور نگر حیدر آباد دکن سے طلب فرمائیے۔

ہزار داستان

اگر آپ ادب لطیف سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو ہزار داستان ملاحظہ فرمائیے۔ تین سال سے نہایت آب و تاب کے ساتھ جناب نعیم و جناب حکیم احمد شجاع صاحب بی اے کی ادارت میں لاہور سے شائع ہو رہا ہے اور ہر ماہ ناظرین سے داد تحسین لے رہا ہے۔ ضخامت ۸۰ صفحات، کاغذ، طباعت اعلی، قیمت سالانہ سے/ ۔ دار الاشاعت ادب لطیف لاہور سے طلب فرمائیے۔

زمانہ

علمی ادبی ماہوار رسالہ ہے۔ جو عرصہ دراز سے زیر ادارت دیا نرائن صاحب نگم بی اے کانپور سے شائع ہو رہا ہے، رسالہ اپنی نوعیت میں ممتاز ہے۔ ضخامت کم و بیش ۸۰ صفحات" کاغذ لکھائی چھپائی گوارا چندہ سالانہ عہ قسم اعلی عہ ۔ دفتر کانپور سے طلب فرمائیے۔

شباب اردو

یہ ماہوار رسالہ زیر ادارت خان احمد حسین خاں صاحب بی اے عرصہ دراز سے اپنی خدمات انجام دے رہا ہے اور عام طریقہ پر پسندیدہ نظر سے دیکھا جاتا ہے، رسالہ ہر حیثیت سے اچھا اور دن بدن ترقی پذیر ہے ترتیب مضامین میں کاوش کی جاتی ہے اور ذوق سے مضامین جمع [illegible] ۔ کاغذ لکھائی چھپائی گوارا، چندہ سالانہ عہ ۔ دفتر رسالہ شباب اردو لاہور سے طلب فرمائیے۔

فہرست مضامین بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۴ء

نغمات قدس	حضرت شہزادہ قدسی دام برکاتہم	۲
غزل	ایڈیٹر	۸
اصحاب کہف	مولوی عبدالرزاق صاحب مصنف البرامکہ	۹
کلام شہید	حضرت شہید مرحوم	۲۸
سعادتمند فرزند	مولٰنا محمود صدیقی (علیگ)	۲۹
تجلیات سُہا	مولٰنا سُہا (علیگ)	۴۰
نُور	مولوی سلطان حیدر صاحب جوش	۴۱
فرمودۂ جلیل	جلیل القدر" حضرت جلیل	۴۸
اتفاق	مولٰنا ماہر بھوپالی	۴۹
تقدیر و عمل	مولوی ابو محمد صاحب ثاقب کانپوری	۵۴
یاقوت خطرت	مولٰنا طالب الہ آبادی	۵۸
شمع ہدایت	خان بہادر سید محمد ہادی صاحب [illegible]	۷۰
نکات زرین	مولوی شریف الزمان صاحب	۷۱
افکار فکرتی	مولانا [illegible]	۷۲
ایک خاتون کا دامن خیال	ایڈیٹر	۷۳
[illegible] مانی	حضرت مانی جائسی	۷۸
گفتار صدق	حضرت صدق جائسی	۷۹
منتخب اشعار	....	۸۰

نغمات قدس

ایک دن عالم استغراق میں ہمیں خیال پیدا ہوا کہ دنیا میں ہر فرد کسی نہ کسی کام میں لگا ہوا ہے، لیکن سچی راحت و مسرت کسی کو میسر نہیں، ہم پر ایک سکوت طاری ہوگیا، ہماری روح شمع کی مانند فضائے دہر میں روشن ہوئی اور کائنات کا ہر ذرہ درخشاں و تاباں ہوگیا۔ آسمان کے تمام ستارے جھک جھک کر ہماری طرف دیکھنے لگے اور ہمارے سکوت پر سرگوشیاں ہونے لگیں، ہماری روح کا نورانی پیکر ہر طرف متجسس نظریں ڈالنے لگا۔

روحیں آنا شروع ہوئیں ایک نے بڑھ کر کہا:۔

اے نورانی پیکر! اُداس کیوں ہے؟

ہمنے کہا، سچی راحت اور کامل مسرت کسطرح حاصل ہو؟

روح نے ایک افسردگی کے ساتھ آہِ سرد کھینچی اور کہنے لگی:۔

دنیا میں راحت کا نام نہ لے، یہ جنس نایاب بازار میں نہیں، مصائب و آلام کے مجموعہ کا نام حیات ہے، جب تک حیات ہے، ہر ہر قدم پر رنج و غم کا سامنا ہے سلسلۂ حیات برائے نام ہے، فانی ہے، بے ثبات ہے ایکدن ضرور منقطع ہوگا، پھر اگر دریائے رحم نے اپنے آغوش میں لے لیا تو سچی راحت نصیب ہوگی۔

یہ روح حکیم عمر خیام نیشاپوری کی تھی اسکے ساتھ جو روحیں تھیں وہ پرانے حکما میں اپی کورس دیوجانس کلبی، ساکھیا مونی، اور نئے فلاسفروں میں مآرن - سوئن برون - شوپن ہور وغیرہ کی تھیں سب نے یک زبان ہو کر خیام کے قول کی تائید کی، لیکن ہم کو تسکین نہ ہوئی روحوں کا ایک اور گروہ رنگ برنگ پروانوں کی صورت میں نمودار ہو کر ہماری نورانی

وجود کے گرد طواف کرنے لگا، ہمکو سکوت و افسردگی کی حالت میں دیکھ کر اُن میں سے ایک نے بڑھ کر کہا :-

اے نورانی پیکر اُداس کیوں ہے ؟

ہمنے کہا، دنیا میں کیا چیز اچھی ہے ؟

پروانہ مسکرا کر بولا :-

" جسکو عقل اچھا کہے "

ہمنے کہا، سچی راحت اور کامل مسرت کیونکر حاصل ہو -؟

پروانہ ایک شادمانی کے ساتھ اُڑا اور ہمارے کان کے پاس منہ لگا کر کہا :-

وحدانیت باری تعالیٰ کا صدق دل سے قائل ہوا اور توحید مطلق کو اختیار کر -

سب تارے خوشی کے جوش میں کھل کھلا کر ہنس پڑے اور اظہار تائید کیا، پہلی روح نے بھی بلند آواز سے تائید کی -

یہ پروانہ حکیم ارسطو کی روح تھی، اسکے ساتھ جو پروانے تھے وُہ پُرانے حکما میں افلاطوں، سقراط، فیثاغورث، اور نئے فلاسفروں میں ابن سینا، فارابی، بیلفور وغیرہ کی روحیں تھیں -

ہمپر ایک مزید سکوت طاری ہوا کیونکہ ہم ان حکما کے فلسفہ سے واقف تھے اور وہ ہماری تسکین کے لئے کافی نہ تھا -

روحوں کا ایک عظیم الشان گروہ نہایت خوش رنگ پرندوں کی شکل میں نمودار ہوا اور سب نے ایک سریلی آواز میں عجب پرکیف طرز سے پڑھا :-

" وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمها الا ہو، ویعلم ما فی البر والبحر، وما تسقط من ورقة الا یعلمها ولا حبة فی ظلمات الارض ولا رطب ولا یابس الا فی کتٰب مبین "

ہمپر ایک وجدانی حالت طاری ہوگئی، آسمان کی برقی پریوں نے فرطِ انبساط میں بڑے زور سے ایک قہقہہ لگایا، ان میں سے ایک وہ جو بہت حسین تھی چمک کر ہمارے پاس آئی اور ایک کتاب ہمارے ہاتھ میں دیکر غائب ہوگئی۔ کتاب کے سرورق پر لکھا تھا "ذالک الکتاب لاریب فیہ ہدی للمتقین الذین یومنون بالغیب" ہم خوشی میں اچھل پڑے اور ہمنے اس مقدس کتاب کا بغور مطالعہ کیا کتاب مبین کو پڑھ کر ہم مطمئن ہوگئے ہمارے قلب کو تسکین ہوگئی اور ہمنے اپنی یادداشت میں بخطِ جلی سُنہری حروف میں لکھدیا جو سچی راحت اور کامل مسرت کا طالب ہو وہ کتاب مبین کا بغور مطالعہ کرے ۔!!

دنیا میں سب سے اچھا کام کیا ہے ؟

یہ ایک سوال ہے جو ضمیروں پر اکثر وارد ہوا کرتا ہے، جسکے جواب میں بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے:۔ "نیکی، اور محبت"۔ کیوں ؟

اس لئے کہ نیکی و محبت سے سچی راحت اور کامل مسرت حاصل ہوتی ہے۔

محبت کا درس اور نیکی کا سبق کہاں سے ملے ؟

کتاب مبین میں،

کیونکہ یہی ایک ایسی کتاب ہے جسمیں کوئی شک نہیں، اور اُن نکوکاروں کے لئے جو غیب پر ایمان لائے یہ کتاب ایک مکمل ہدایت نامہ ہے جسمیں نہایت واضح طور سے محبت کا درس دیا گیا ہے اور نہایت روشن دلیلوں سے نیکی کے سبق دیے گئے ہیں۔

" ہو الذی انزل علیک الکتب منہ آیت محکمات ہن ام الکتب و اُخر متشابہات، فاما الذین فی قلوبہم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم یقولون آمنا بہ کل من عند ربنا وما یذکر الا اولوا الالباب"

(ترجمہ) "خدا وہ ذات ہے جسنے تم پر کتاب اُتاری جسمیں بعض آیات محکمات ہیں جن پر

ہدایت واحکام کا مدار ہے (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) اور بعض آیات متشابہات ہیں (جنسے محض قدرت خداوندی کا اظہار اور توجہ الی اللہ کی ترغیب دینا مقصود ہے) لیکن جن لوگوں کے دل میں شک ہے وہ متشابہات کے پیچھے پڑجاتے ہیں فتنہ پیدا کرنے کے لئے یا تاویل معلوم کرنے کے لئے حالانکہ اسکی تاویل خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو پختہ علم رکھتے ہیں یعنے عقیدہ میں صادق ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، یہ سب خدا کی طرف سے ہے اور نصیحت یعنے محبت کا درس اور نیکی کا سبق وہی حاصل کرسکتے ہیں جو عقلمند ہوں"

ایک دن قرآن حکیم کی تلاوت میں توحید باری تعالی کا بیان پڑھ کر ہم غور کرنے لگے۔ جب فہم قاصر ہوا، ہم نے بغرض استمداد ملاء اعلی کی طرف نظر اٹھائی، روحوں کے تین گروہ نمودار ہوئے، گروہ اول میں گوتم۔ کپل۔ پتنجلی۔ گروہ دوم میں رازی، غزالی، ابن عربی، اور گروہ سوم میں بیکن۔ تھامس میگنس، قابل ذکر ہیں،

ہمیں خموش دیکھکر سب نے کہا:۔

جان عالم! کس سوچ میں ہو ؟

ہمنے کہا، توحید میں۔

ہر ایک روح نے یکے بعد دیگرے اپنے اپنے خیالات بڑے شد و مد سے بیان کئے حقائق و معارف کے دریا بہا دیے مگر ہمکو تسکین نہ ہوئی، جب سب روحیں اپنی اپنی معرکتہ الآرا تقریریں ختم کرچکیں اور ہم بدستور خموش و متفکر رہے تو ایک منحنی روح جو لسان العصر اکبر الہ آبادی کی تھی آگے بڑہی، اور یہ شعر پڑھ کر غائب ہوگئی ؎

عقل میں جو گھر گیا لا انتہا کیوں کر ہوا
جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیوں کر ہوا

سب روحیں بھی غائب ہوگئیں، ہم پر ایک مزید سکوت طاری ہوا، تو ہمات نے موقع کو غنیمت جان کر مسلط ہوگئے، اور شکوک اور شبہات نے ہر طرف سے گھیر لیا، اوہام و خطرات وارد ہونے لگ

اور شیطانی لشکر نے ایکدم یورش کی۔ کوئی کہتا۔ دنیا خود بخود بنی ہے اس کا بنانے والا کوئی نہیں، کوئی مادّہ کی بحث کرتا، کوئی روح کی حقیقت بیان کرتا، کوئی دنیا کو خواب و خیال ظاہر کرتا کسی نے کہا آفتاب خدا ہے، کسی نے کہا مادہ خالق جزو کل ہے۔

کوئی کہتا روح قادر و خالق ہے، کوئی کہتا خدا کا وجود محض قیاسی ہے، کسی نے کہا عذاب و ثواب سب دھوکا ہے، کسی نے کہا حساب کتاب غلط ہے، کوئی کہتا قیامت لغو ہے، کوئی دوزخ جنت، فرشتے اور حیات بعد الممات کی تکذیب کرتا، کوئی جملہ صحف آسمانی کی تردید کرتا۔

غرض کہ ہر طرح کی پریشان خیالات اور گمراہ کرنے والے وسوسوں کا ہجوم ہوا، ہمنے گھبرا کر اپنے شیخ طریقت کی طرف رجوع کیا، ہاتف نے کہا "العجز من الادراک ادراک" ہمنے سر بسجود ہو کر پڑھا "سبحان ربی الاعلیٰ" جب سجدہ سے سر اُٹھایا شیخ کا روحانی برزخ سامنے آیا، ہمنے اپنی گزشتہ کشاکش بیان کی، ارشاد ہوا۔

"جانِ عالم! جب کہ تم ظلوماً جہولاً کے خطاب سے سرفراز ہو پھر کیوں ایسی جرأت کرتے ہو کہ توحید جیسے بے پایاں مضمون میں غور کرتے ہو، اگر خدا کو انتہائی تحقیقات سے ہی قبول کرنا ہے تو پھر اس میں کون سی فضیلت پائی جاتی ہے جو ثواب کا باعث ہو، ایسی طبیعت کا کوئی بھی آدمی نہیں کہ اگر کسی کو پورا پورا ثبوت خدا کی ہستی اور عالم مجازات و عجائبات قدرت کا مل جائے تو وہ منکر ہی رہے یا اگر خدا تعالےٰ ہر ایک انسان کو نظر آ جائے تو ممکن نہیں کہ پھر بھی کوئی کافر بے دین رہ جائے لیکن ایسا ہونے سے وہ بات جس سے مراتب و درجات ملتے ہیں باقی نہ رہے، یعنے ایمان بالغیب۔

مخلوقاتِ عالم پر نظر کرو تو سارا عالم ایک حیرت کدہ دکھائی دیتا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ عظیم الشان کارخانہ اس خوبی حسن کے ساتھ کیونکر موجود ہو گیا اور اس ربط و ضبط کے ساتھ کیونکر چل رہا ہے۔؟ بلبل شیراز نے کیا اچھا کہا ہے ؎

سخن از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو،
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

جب ایک صحیح العقل سلیم الفطرۃ آدمی نظر اُٹھا کر دیکھیگا اُسے ایک سے ایک عجیب چیز دکھائی دیگی اور وہ اپنے قصورِ فہم کا اعتراف اور اپنے ظلوم وجہول ہونے کا اقرار کرتے ہوے بے تحاشا کہہ اُٹھے گا " ربنا خلقت ہذا باطلا سُبحانک فقنا عذاب النار "

اے پروردگار تو نے اس عظیم الشان کارخانۂ عالم کو بے فائدہ تو نہیں بنایا تیری ذات ایسے فعل عبث کرنے سے پاک ہے، اور یہ کارخانہ خبر دے رہا ہے آخرت میں نیکی کی جزا اور بدی کی سزا ہونی ہے تو اے رب ہمکو دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھنا

فلسفہ میں ازل سے ابد کے اور زمین سے آسماں کے قلابے ملا کر ہر ایک چیز میں رائے زنی کی گئی ہے وہ محض قیاسی اور ظنی تک بندیاں ہیں، فلسفیوں کو معاملہ تقدیر کی کچھ خبر تو ہے نہیں نری اٹکلیں دوڑاتے ہیں جیسا کہ کتاب مبین میں ارشاد ہے " ما لہم بذلک من علم ان الا یخرصون " بے شک سمجھ میں نہیں آسکتا کہ ہزاروں برس کے مردے جن میں سے بعض سمندروں میں ڈوبے اُن کو مچھلیاں کھا گئیں اور بعض پارسیوں کے دخمے میں رکھدیے گئے اور چیلوں گدوں نے اُنکی بوٹیاں نوچ کھائیں اور بعض جلا کر خاک کردیے گئے اور بعض مدفون قبر ہو کر " منہا خلقنکم وفیہا نعیدکم " کے مصداق ہوے، کیسے زندہ کئے جائیں گے۔ اور زندہ ہونا بھی کیسا ؟ " بلی قادرین علی ان نسوی بنانہ " یعنے ان کی پور پور اصلی ٹھکانے پر ہوگی (افعیینا بالخلق الاول، بل ہم فی لبس من خلق جدید۔)

جانِ عالم ! جب بندہ باوجود کشمکش خیالات مخالفانہ، خدا تعالیٰ کی ہستی پر ایمان لائیگا۔ اور سب عجائبات اُخروی اور وجود جنت و دوزخ و ملائک وغیرہ کے اُسکی قدرت و حکمت میں داخل سمجھ کر دیکھنے سے پہلے ہی قبول کرلیگا تو یہ قبول کرلینا اُس کے حق میں صدق شمار کیا جائے گا پس جو رضائے الٰہی کا طالب ہو اسے لازم ہے کہ تمام امور غیبیہ اور جملہ احکام الٰہی کو تسلیم کرنے میں پس و پیش نہ کرے کیونکہ تمامتر سعادت اسی میں ہے کہ غیب کی باتوں کو غیب ہی کی صورت میں قبول کرے۔ اور ظاہری حواس کی خواہ نخواہ شہادت طلب کرنے سے اور فلسفہ کے طول طویل اور لاطائل قیاسات سے خود کو بچائے۔

طالب صادق جب خدا اور اُسکی سزا و جزا عجائبات قدرت اور دیگر تمام امور غیبیہ

ایمان لاتا ہے تو بوجہ انواع اقسام کے اوہام، اور نفس امارہ کی چار طرفہ کشاکش کے سخت آزمائش میں پڑتا ہے۔ آخر چونکہ وہ صادق ہوتا ہے، اس لئے سب راہیں چھوڑ کر اور سب خیالات پر غالب آکر اُسی وحدہ لاشریک کی راہ اختیار کرتا ہے اور اس صدق کی برکت سے وہ اپنے علم سے زیادہ رجوع اور اپنے تجربہ سے زیادہ استحکام پکڑتا ہے جناب الٰہی میں مقبول کیا جاتا ہے اور پھر اسی صدق کی برکت سے اسکو عرفانی آنکھیں عنایت ہوتی ہیں اور ربانی محبت عطا ہوتی ہے اور وہ اُس مقام تک جاتا ہے جہاں انسانی کمالات ختم ہو جاتے ہیں اور دائمی راحت وجاودانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

شیخ کی اس نورانی تقریر سے تمام سیارات فضا منور ہو گئے اور جملہ ذرات کائنات روشن ہو کر چمکنے لگے ہمنے شیخ کے دست حق پرست کو مضبوط پکڑ کر بلند آواز سے پڑھا۔

"آمنت باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الآخر والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ والبعث بعد الموت وآمنت باللہ کما ہو باسمائہ وصفاتہ وقبلت جمیع احکامہ وارکانہ۔"

آسمان کی برقی پریوں نے شادیانہ گایا اور ہم مطمئن ہو کر پھر حسب معمول کتاب مبین کے مطالعہ میں مشغول ہو گئے۔ سبحان اللہ کیا عجیب کتاب ہے۔

قدسی

غزل

کوئی آہ رسا مجنوں جو تیرے دلسے نکلے گی
تو خود گھبرا کے لیلیٰ پردۂ محمل سے نکلے گی

اگر ڈر ہے تو یہ ہے مجکو اپنی سخت جانی سے
قضا بدنام ہو کر کوچۂ قاتل سے نکلے گی

صلہ اچھا ملیگا شمع کو دل کے جلانے کا
کہ دن ہوتے ہی بیچاری تری محفل سے نکلے گی

اُلٹ جائے گا پردہ خود بخود ہی اُنکے چہرہ کا
ہوا خود باندھ دیگی آہ جس دن دلسے نکلے گی

سمجھ لوں میں تری خاطر سے تجکو مہرباں لیکن
نکلنے کو نہ اک حسرت بھی میرے دلسے نکلے گی

تڑپ مرغ چمن کی دیکھنا دیکھی نہ جائے گی
ذراسی جان ہے لیکن بڑی مشکل سے نکلے گی

جو جیتے جی نکلجائے یہ وہ حسرت نہیں حامد
شہادت کی تمنا جان لیکر دل سے نکلے گی

اڈیٹر

اصحاب الکہف والرقیم

یا

سات سونے والوں کا قصّہ

آغاز بعثت نبوی میں عیسائیوں، اور یہودیوں کی تعلیم سے کفار قریش نے رسول اللہ صلعم سے چند ایسے سوالات کئے جنکا تعلق روم ویونان کی تاریخ سے تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ نبی اُمّی کبھی ان سوالات کا جواب نہیں دیسکتے ہیں اور اگر انہوں نے صحیح جواب دیا تو وہ بیشک خدا کے رسول ہیں، چنانچہ منجملہ اُن سوالات کے ایک سوال اصحاب الکہف والرقیم کا بھی ہے، یہ رومی قصہ یورپ کی تمام زبانوں میں موجود ہے اور چونکہ قرآن پاک میں بھی اصحاب الکہف کا تذکرہ ہے اس لئے کتب تفسیر اور عربی تاریخوں میں بھی مختلف روایات سے یہ قصہ درج ہوا ہے اور چونکہ یہ تاریخی واقعہ ہے اور بزرگان سلف نے اسکو تاریخی واقعات سے منطبق نہیں کیا ہے بدیں وجہ اسکے سمجھنے میں بہت سی دشواریاں پیش آئیں ہمارے مخدوم مولوی **عبدالرزاق** صاحب مصنف البرامکہ حضور **ہر ہائینس نواب بیگم صاحبہ بھوپال** کے حکم سے ایک وسیع پیمانہ پر تاریخ اسلام تحریر فرمارہے ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں ایک موقع پر اصحاب الکہف کا ذکر آیا جسکے لئے مولانا نے تفصیل کیساتھ اس واقعہ کو لکھا چونکہ یہ واقعہ دلچسپ فسانہ کی شان رکھتا ہے لہذا ناظرین محسن الملک کی دلچسپی کے لئے یہ پورا قصہ نقل کیا جاتا ہے، جس تاریخی کاوش سے یہ قصہ مولف نے تحریر فرمایا ہے اسکو صرف اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں اور ہم شکر گزار ہیں کہ مولنا صاحب نے ہم کو یہ فسانہ عطا فرماتے ہوئے، اشاعت کی اجازت عطا فرمائی :-

ایڈیٹر

عیسائی روایات اور تاریخ روم کے مطابق | رومی عیسائیوں کے مذہبی فسانوں میں سے سات سونے والوں (اصحاب الکہف والرقیم) کا قصہ تمام دنیا میں مشہور ہے، جس کا خلاصہ تاریخ کے مطابق یہ ہے کہ "ڈی سیس (مورخین ومفسرین عرب باختلاف لہجہ اس کو دقیوس، دقیوس، دقی نوس، داقیادس، اور دقیانوس کہتے ہیں) بادشاہ روم کے عہد حکومت (۲۴۹ء لغایۃ ۲۵۱ء) میں شہر افسس (عربی نام افسوس) میں چھ[1] عیسائی نوجوان رہتے تھے، جو مسیح علیہ السلام کو پیغمبر جانتے تھے چنانچہ ان کے انگریزی اور عربی نام اردو رسم الخط میں درج ذیل ہیں :-

نمبر	نام انگریزی لہجہ میں	عربی نام اور اُن کے مختلف لہجے جو تاریخوں اور تفسیروں میں درج ہیں
۱	میکسی میں	مکسلمینا - مکسیمیانوس -
۲	مارسین یا مارشین	مرطوس، مرطونس،
۳	ڈایونی سس	دیرونس، دیریوس، دینموس، دینوس، دیرنوش، دیونیسوس، -
۴	جان	قالوس، یوحنا
۵	سراپین	سراپیون، شاذنوس

---

[1] اصحاب کہف بادشاہزادگان بودند کہ خدمت دقیانوس می کردند و از جملہ خواص او بودند و ایشان ہفت تن بودند و بانوبت ہر روز یکے بخدمت بادشاہ رفتے - سیرۃ ابن اسحاق جلد اول باب ۱۴ -

نمبر	نام انگریزی لہجہ میں	عربی نام اور اُن کے مختلف لہجے جو تاریخوں اور تفسیروں میں درج ہیں۔
۶	گارنسٹن، ٹمارن (قسطنطین)	اکسوطونس، کطوطس، کشطون، کشتوطونس
۷	مالکس، ملکوس	یہ ایک چرواہا تھا جو غار میں جاتے وقت ان اصحاب کے ساتھ ہو لیا تھا اس کا نام ملیخا، یملیخا، یملیخ، یمنیخ، تمنیخ اور تملیخا ہے۔
۸	کراٹیم یا کراٹیم	یہ مالکس کا وفادار کتا ہے جس کا عربی نام قطمیر یا قطمور ہے۔ غار میں یہ بھی ہمراہ تھا۔"

دقیانوس بادشاہ مذہباً بُت پرست تھا۔ اس نے شہر افسوس میں ایک مندر بنایا تھا اور عیسائیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ بتوں کی پرستش کریں اور اُن پر قربانی چڑھائیں، جو عدول حکمی کرے گا اوسکو سزائے موت دی جائے گی"۔ اس حکم سے تمام شہر میں ایک آفت برپا تھی اور عیسائی تلاش کر کر کے دقیانوس کے حضور میں پیش کئے جاتے تھے۔ چنانچہ یہ چھ نوجوان بھی جو عیسائی مذہب میں نہایت راسخ العقیدہ تھے گرفتار ہو کر پیش ہوئے انہوں نے دقیانوس کے سامنے اپنے عیسائی ہونے کا علانیہ اقرار کیا اور بتوں پر قربانی کرنے سے انکار کر دیا، تاہم ظالم بادشاہ نے ان کو کچھ دنوں کی مہلت دی اور خود شہر افسوس سے ضرورتاً باہر چلا گیا۔

ان خداپرستوں نے اس موقع کو غنیمت جانا، اپنا مال و اسباب خدا کی راہ میں لٹا دیا اور رات کی تاریکی میں کوہ سیلین کے غار میں پناہ لینے کے لئے چلے گئے اور جاتے ہی سو گئے جب سو کر اٹھے تو اُن میں سے مالکس (یملیخا) چرواہا طبیب کا بھیس بدل کر بازار گیا، وہاں اُسنے سُنا کہ دقیانوس نے اُن کی گرفتاری کا حکم دیا ہے۔ یہ سن کر مالکس، ڈرتا ہوا شہر سے بھاگا اور ساتھیوں سے

بادشاہ کے غصہ کا حال بیان کیا، یہ حال سنکر سب خوف زدہ ہوگئے، لیکن مالکس کے سمجھانے سے انہوں نے کھانا کھایا اور باتیں کرتے رہے۔ پھر خدا نے اُن پر خواب طاری کر دیا اور وہ غافل ہوکر سو رہے اور ایک زمانہ دراز تک اسی غار میں سوتے رہے۔"

چوتھے دن دقیانوس نے واپس آکر اُن کو شہر میں تلاش کرایا اور اُن کے والدین سے پوچھا جب اُنھوں نے کہا کہ وہ شہر سے کہیں باہر چلے گئے ہیں تو دقیانوس نے اس خیال سے کہ یہ لوگ ضرور غار میں چھپے ہونگے۔ غار کا منھ پتھروں سے بند کرا دیا تاکہ بھوکے پیاسے غار کے اندر مر کر رہ جائیں۔[1]

دقیانوس ایک سال یا تین سال حکومت کرکے مرگیا اور یہ عیسائی نوجوان غار میں ایسے غافل سوئے کہ باختلاف روایت (سنہ ۱۰۰ھ، سنہ ۱۷۸ھ، سنہ ۲۰۰ھ، سنہ ۲۴۰ھ، سنہ ۳۰۹ھ، سنہ ۳۶۰ھ، سنہ ۳۲۵ھ) سال کے بعد بیدار ہوے۔

لیکن عموماً مورخین نے لکھا ہے کہ اصحاب الکہف تھوڈوسیس[2] کے سنہ ۳۸ جلوس میں بیدار ہوے یہ وہ مسیحی بادشاہ تھا جسکے عہد میں قسطنطنیہ اور ایران میں دوبارہ مسیحیت نے جنم لیا اور بت پرستی کا استیصال کیا گیا۔[3]

جب یہ اصحاب بیدار ہوے تو سمجھے کہ ہم صرف ایک رات سوئے ہیں اس لئے انہوں نے مالکس سے پوچھا کہ دقیانوس نے ہماری نسبت آخری حکم کیا دیا ہے؟ مالکس نے کہا "یہ ظالم ہم کو

---

[1] مشہور عیسائی مورخ ابن الملطی لکھتا ہے۔ و دفع خبرھم الیہ فامر ان یسد باب المغارہ علیھم فالفی علیھم سباتاً الی ان ایام انبعاثھم من رقادھم۔ مختصر الدول صفحہ ۱۲۷ مطبوعہ بیروت۔

[2] تھوڈوسیس ثانی کا عہد حکومت ۴۰۸ء سے ۴۵۰ء تک رہا ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اصحاب الکہف دقیانوس کے ابتدائی عہد یعنی سنہ ۲۵۰ء میں سوئے تھے اور تھوڈوسیس کے آخر عہد یعنی سنہ ۴۵۰ء میں بیدار ہوے تو کل ایام خواب کی مدت دو سو برس (۲۰۰) ہوتی ہے اور یہ جملہ مورخین روم و عرب کو تسلیم ہے کہ یہ اصحاب دقیانوس کے زمانہ میں غار کے اندر جاکر چھپے تھے اور تھوڈوسیس کے زمانہ میں بیدار ہوے لہذا یہ مدت اکثر عیسائی مورخین کے نزدیک صحیح ہے (بقیہ صفحہ آئندہ)

[3] یعقوبی صفحہ ۱۷۳، جلد اول و مختصر الدول ابن العبری ۱۴۳۔

یہاں تک پریشان کرے گا کہ ہم مجبور ہو کر بتوں کو پوجیں گے۔ میک سی ین (مکسلمینا) نے کہا کہ خدا شاہد ہے ہم کبھی ایسا نہیں کریں گے اور مالکس کو حکم دیا کہ بازار سے روٹی خرید لاؤ اور یہ بھی پتہ لگاؤ کہ ہماری نسبت دقیانوس کیا کارروائی کر رہا ہے۔ مالکس پانچ سکے لیکر بازار گیا پہلے غار کے دروازہ[۵۱] پر پتھروں کا انبار دیکھ کر حیراں ہوا، جب آگے بڑھا تو شہر کے دروازہ پر صلیبی جھنڈا نظر آیا اور لوگوں کی زبان پر خدا اور مسیح علیہ السلام کا نام بھی سُنا۔ اب تو مالکس حیرت زدہ رہ گیا اور اُسنے خیال کیا کہ یہ شہر افی سس (افسوس) نہیں ہے اور مجھ میں ہنوز نیند کا اثر باقی ہے لہذا رفع شک کے لئے اُس نے لوگوں سے پوچھنا شروع کیا، جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہ افی سس ہے تو بازار کے اندر گیا اور نان بائی سے روٹی خریدی، قیمت میں جو سکہ دیا وہ دقیانوسی تھا نان بائی نے مالکس کا ہاتھ تھام لیا اور کہا کہ تو نے جو خزانہ پایا ہے اُس میں ہم کو بھی شریک کر مالکس یہ سنکر ہکا بکا رہ گیا اور دونوں میں یہاں تک حجت ہوئی کہ فریقین حاکم شہر کے روبرو پیش کئے گئے اینٹی پیٹر[۵۲] مجسٹریٹ نے مالکس سے کہا "کہ جو سکہ تم نے نان بائی کو دیا ہے

(بقیہ صفحہ گزشتہ) اور بعض کے نزدیک تقریباً ۲۴۰ سال کی مدت ہے چنانچہ مورخ ملطی لکھتا ہے "تا ذ دسیوس قیصر الصغیر ملک اثنتین واربعین سنۃ وفی ھذا الزمان انبعث اصحاب الکھف من رقدتھم التی رقدوا علی عھد ذاقیوس الملک بعد مائتین واربعین سنۃ بالتقریب"۔ صفحہ ۱۴۳ مختصر الدول وہسٹوری آف نیشن جلد ۶ رومن امپائر۔

۵۱ دامن کوہ میں ایک امیر اصطبل بنوا رہا تھا، جسکے لئے پتھروں کی ضرورت ہوئی لہذا اُس نے غار کے منہ پر جو پتھر جمع تھے وہ اٹھوا لئے اور غار کا مُنہ کھل گیا۔ موخ گبن لکھتا ہے کہ یہ ایڈوسیس کا غلام تھا جب پتھر اٹھائے گئے تو سورج کی روشنی سے یہ لوگ جاگ اُٹھے اور ۱۸۷ سال کے بعد سنہ ۴۳۹ء میں نیند سے بیدار ہوئے۔ اس حساب سے گویا اصحاب الکھف سنہ ۲۵۲ء میں داخل غار ہوئے تھے تاریخ روم گبن صفحہ ۴۴۵ – جلد ۳ باب ۳۳ (بقیہ صفحہ آیندہ)

۵۲ شہر کی حکومت دو شخصوں کے سپرد تھی ایک کا نام ارموس اور دوسرے کا نام اصطفوس تھا۔ حیات الحیوان دمیری۔

وہ دقیانوس کے زمانہ کا ہے جسکو اس وقت تک ۳۷۵ سال گزر چکے ہیں"۔ مالکس نے کہا کہ اول مجھ یہ بتائیے کہ دقیانوس کہاں چلا گیا ہے سینٹ مارٹین بشپ نے (جو تحقیقات مقدمہ میں مجسٹریٹ کے ساتھ تھا) جواب دیا کہ میرے بچے! اس نام کا اب کوئی بادشاہ نہیں ہے، اُسکو مرے ہوئے عرصہ ہو چکا ہے"۔ مالکس یہ جواب سُن کر اور بھی پریشان ہوا اور کہا آپ لوگ میرے ہمراہ پہاڑ تک چلیں، میں اپنے ساتھیوں کو دکھاؤں گا جو کل ہی دقیانوس کے خوف سے بھاگ کر پہاڑ میں جا کر چھپے ہیں۔ سینٹ مارٹین نے مجسٹریٹ سے کہا کہ یہاں خدا کا ہاتھ ہے (یعنی یہ واقعہ اسرار الٰہی میں سے ہے) اور وہ مجمع کے ساتھ پہاڑ پر پہنچا۔ مالکس نے اپنے ہمراہیوں کو دکھایا، تمام عیسائیوں نے اُن کو سجدہ کیا اور اس کے بعد ہی گورنر کی رپورٹ پر خود تھیوڈوسیس بھی مع بشپ اور پادریوں کے ان لوگوں کی زیارت کے لئے حاضر ہوا، اور ایک ایک سے بغلگیر ہوا، اور کہا کہ "میں نے آپ لوگوں کو دیکھا گویا مسیح کو لزارس (یہ وہ شخص ہے جسکو مسیح نے قبر سے زندہ کیا تھا) کو شفا بخشتے ہوئے دیکھا"۔ مالکس نے کہا "آپ یقین کیجئے کہ خدا نے ہم کو اس لئے اُٹھایا ہے کہ تم اس امر کو برحق سمجھو کہ قیامت کے دن مردے ضرور اٹھائے جائیں گے۔ ہم لوگ سوتے تھے اور ہمکو کوئی تکلیف نہیں ہوئی"۔

لہ مورخ ملطی کا قول ہے کہ تھیوڈوسیس کے واپس آنے کے بعد یہ لوگ پھر اسی جگہ پر مر گئے۔ فخرج ثاؤذوسیوس الملک مع اساقفہ و قسیسین و بطارکہ فنظروا الیھم وکلموھم فلما انصرفوا من عندھم ماتوا فی مواضعھم۔ مختصر الدول صفحہ ۱۴۲

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مطبوعہ ۱۹۱۳ء (سات سونے والوں کا قصہ) اور ایک روایت یہ ہے کہ تقریباً ۲۰۰ سال کے بعد کوہ ... پر ایک چرواہے کو غار ملا، پتھر ہٹا کر وہ اندر گیا تو سونے والے جاگ اُٹھے۔ سائکلوپیڈیا

اس کے بعد انہوں[1] نے سر جھکایا اور پھر سو گئے (یا یہ کہ مر گئے) بادشاہ نے ان کی لاشوں کو احترام کیساتھ سنہری صندوق میں رکھوادیا۔ لیکن اسکو خواب میں ہدایت کی گئی کہ ہم جس طرح زمین پر سوتے تھے اب بھی زمین پر سونے دو جب تک کہ خدا دوبارہ نہ اٹھائے[2]"

اصل قصہ اسی قدر ہے جو ہمنے نقل کیا ہے اور عیسائی مورخین[3] کی روایات کا جامع خلاصہ ہے، سب سے پہلے یہ قصہ جیکوبس سروجین سیس، لشب عراق عرب نے پانچویں صدی عیسوی کے اخیر یا چھٹی صدی کے آغاز میں لکھا ہے۔ جسکو گری گوری آف ٹورس نے یورپ میں پھیلایا اور پھر تمام دنیا میں نظم و نثر کے ذریعہ سے عام ہوگیا اور ساتویں صدی مسیحی کے آغاز میں قرآن مجید نے نہ صرف اس واقعہ کی تصدیق کی بلکہ جس طرح اصل واقعہ گزرا تھا، اسکو بیان کر دیا۔ جس کی نسبت منکرین قرآن کہتے ہیں کہ پیغمبر عرب نے شامیوں سے سُن کر یہ قصہ اپنے قرآن میں درج کر دیا ہے (نعوذ باللہ منہا) آں حضرت کی ولادت ۵۷۱ء میں ہوئی ہے۔ لہذا نزول قرآن کے زمانہ میں عرب میں یہ قصہ شائع ہوا۔ عیسائیوں کیطرح مسلمان بھی اصحاب الکہف کے طویل زمانہ خواب کو ایک غیر معمولی اور حیرت انگیز واقعہ سمجھتے تھے لہذا خدا نے بذریعہ وحی اپنے رسول کو نفس واقعہ سے واقف کر دیا اور ارشاد ہوا کہ

---

[1] عیسائی بھی حشر اجساد کے قائل تھے لیکن تھیوڈوسیس کے عہد میں ایک گروہ اس مسئلہ سے منکر تھا۔ طبری صفحہ ۷۰۱، جلد اول جزو دوم۔

[2] علامہ دمیری لکھتے ہیں کہ تھیوڈوسیس نے ان کو طلائی صندوق میں رکھا۔ اور جو کپڑے پہنے ہوئے تھے وہ بدستور رہنے دیئے۔ بشارت کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔ انا لم نخلق من ذھب ولا فضہ ولکنا خلقنا من التراب والی التراب نصیر فاترکنا کما کنا فی الکھف علی التراب حتی یبعثنا اللہ۔

[3] انتخاب از رسالہ ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم سر سید احمد خاں بحوالہ کیورسٹی آف ڈی میڈل ایجز مولفہ ایس بارنگ گولڈ ایم اے۔ و سائیکلوپیڈیا جلد ۲۴ صفحہ ۷۰۹۔ و گبن جلد ۳۔

اصحاب الکہف کا واقعہ ہمارے آثار قدرت میں سے ہے۔

"تاریخی واقعہ بیان ہو چکا ہے لہٰذا ہم سورۂ اصحاب الکہف سے آیات متعلقہ نقل کرتے ہیں جس سے پوری تفصیل معلوم ہو گی اس کے بعد تاریخ و جغرافیہ کے مطابق اسکی مزید تشریح کرینگے۔

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۝ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۝ وَّرَبَطْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰـهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۝ هٰٓؤُلَاۗءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً

(اے پیغمبر) کیا تم ایسا خیال کرتے ہو کہ غار اور کتبے والے ہماری (قدرت کی) نشانیوں میں سے (ایک) عجیب (نشانی) تھے جب کہ چند جوان اس غار میں آ بیٹھے۔ پھر دعا مانگنے لگے کہ اے ہمارے رب ہم پر اپنی جناب سے رحمت نازل کر اور ہمارے کام کا سر انجام کر دے۔ تب ہم نے سالہا سال کے لئے غار میں ان کے کان تھپک دیئے (یعنی سُلا دیا) پھر ہم نے اُن کو جگا اُٹھایا تاکہ ہم دیکھیں کہ دونوں گروہوں میں سے ان کی مدت قیام کو کس نے خوب یاد رکھا ہے اے پیغمبر اب ہم ان کا حال ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں وہ چند جوان تھے کہ جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم اُن کو اور زیادہ ہدایت دیتے گئے۔ اور اُن کے دلوں پر استقلال کی گرہیں لگا دیں جب کہ وہ (بت پرست بادشاہ کے دربار سے) یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے کہ ہمارا رب تو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے اور ہم اُس کے سوا اور معبود کو ہرگز نہ پکاریں گے اگر ایسا کیا تو بڑا ہی جھک مارا۔ ایک یہ ہماری قوم ہے کہ جنہوں نے اُسکے سوا اور معبود بنا رکھے ہیں۔

لَوْلَا يَأْتُونَ عَلَيْهِم بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ ۖ
فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۝
وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ
إِلَّا اللَّهَ فَأْوُوا إِلَى الْكَهْفِ يَنشُرْ
لَكُمْ رَبُّكُم مِّن رَّحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ
لَكُم مِّنْ أَمْرِكُم مِّرْفَقًا ۝ وَ
تَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَت تَّزَاوَرُ
عَن كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ
وَإِذَا غَرَبَت تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ
الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ ۚ
ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ ۗ مَن يَهْدِ
اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۖ وَمَن
يُضْلِلْ فَلَن تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا
مُّرْشِدًا ۝ وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا
وَهُمْ رُقُودٌ ۚ وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ
الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُم
بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ ۚ
لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ
مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمُلِئْتَ
مِنْهُمْ رُعْبًا ۝

اُن کے معبود ہونے پر کوئی کھُلی ہوئی دلیل کیوں پیش نہیں کرتے
پھر اس سے بڑھ کر بھی کوئی ظالم ہے جو خدا پر جھوٹا بہتان باندھے
پھر باہر اگر آپس میں کہنے لگے کہ جب تم نے ان بُت پرستوں کو
اور جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں سب کو چھوڑ ہی دیا تو
چلو غار میں جا بیٹھو۔ تمھارا خدا تم پر اپنی رحمت برسائیگا
اور تمھارے کام کو بھی آسان کردے گا۔ الحاصل وہ
غار میں ایسے موقع پر آسوئے کہ جب آفتاب طلوع
کرتا ہے تو اُن کے غار کی دائیں طرف سے، اے مخاطب
تجھکو ہٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور جب ڈوبتا ہے تو انکی
بائیں طرف سے کتراتا ہوا گذرتا ہے۔ اور وہ غار کے
اندر بڑی کشادہ جگہ میں پڑے سو رہے ہیں۔ یہ اللہ کے
عجائبات قدرت میں سے ہے جسکو خُدا ہدایت دے
وہی راہ راست پر ہے اور جسکو وہ گمراہ کرے تو پھر اُسکے
لئے اے پیغمبر تم کوئی اس کا کارساز راہ دکھانے والا
نہ پاؤ گے۔ اور اے مخاطب تو جانے گا کہ وہ جاگتے ہیں
حالانکہ وہ پڑے سوتے ہیں اور ہم ہی اُن کو دائیں اور بائیں
کروٹ بدلواتے رہتے ہیں۔ اور اُن کا کُتّا ہے جو چوکھٹ پر
اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے بیٹھا ہے۔ اے مخاطب اگر
تو انہیں دیکھ پائے تو تجھے اُلٹے پاؤں بھاگتے ہی بن پڑے
اور ان کی صورت حال سے تجھ میں دہشت سما جائے۔

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا
بَيْنَهُمْ ۭ قَالَ قَاۗىِٕلٌ مِّنْهُمْ كَمْ
لَبِثْتُمْ ۭ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ
يَوْمٍ ۭ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۭ
فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ
هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ
اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا
فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ
وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ
اَحَدًا ۝ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ
يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ
فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ۝
وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا
اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ
لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ
بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا
عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ
بِهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا
عَلٰٓي اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ
عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ۝

اور یوں ہی ہم نے اپنی قدرت سے ایک بار جگا بھی دیا تھا تاکہ باہم پوچھ گچھ کریں چنانچہ انمیں سے ایک نے پوچھا کہ تم کس قدر یہاں ٹھہرے رہے اُنہوں نے کہا کہ ہم ایک دن یا کچھ کم رہے ہیں۔ اسکے بعد سب یہی کہنے لگے کہ تمہارا خدا ہی خوب جانتا ہے کہ جس قدر یہاں ٹھہرے رہے ہو اب اپنے میں سے کسی ایک کو یہ روپیہ دیکر شہر کو بھیجو اور اُسکو چاہیئے کہ وہ اچھا کھانا دیکھ کر اس میں سے تمہارے پاس کچھ لاوے۔

اور چاہیئے کہ چپکے سے آکے جائے۔ اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے۔ کیونکہ اگر وہ تم پر قابو پائیں گے تو سنگسار کر ڈالیں گے یا اپنے مذہب میں الٹا پھیر لائینگے اور تب تو تم کبھی فلاح نہ پاؤ گے۔

اور ہم نے اُن کو ان لوگوں پر یوں ظاہر کر دیا تاکہ اُنکو معلوم ہو جائے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت میں کوئی شک نہیں۔ (ان کے ظاہر ہوے بعد) جب کہ لوگ ان کے معاملہ میں جھگڑنے لگے پس بعض نے کہا کہ ان کے غار پر ایک عمارت بناؤ (اور ان کو حال پر چھوڑ دو کیوں کہ) ان کا رب انہیں ہی خوب جانتا ہے۔

اور ان کے بارے میں جن کی رائے دوسروں پر غالب رہی انہوں نے کہا کہ ہم تو ان پر ضرور ایک مسجد بنائیں گے۔

سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ط

بعض تو کہتے ہیں کہ اصحاب کہف تین تھے چوتھا ان کا کتا۔ اور بعض کہتے ہیں پانچ تھے چھٹا اُن کا کتا۔ یہ سب غیب کی باتوں میں اٹکل کے تکے چلاتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں سات تھے اور آٹھواں اُن کا کتا۔

قُل رَّبِّي أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم مَّا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ ۥ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِم مِّنْهُمْ أَحَدًا ۝ وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا ۝ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ وَاذْكُر رَّبَّكَ إِذَا نَسِيتَ وَقُلْ عَسَىٰ أَن يَهْدِيَنِ رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَٰذَا رَشَدًا ۝ وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا ۝ قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا لَهُ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ط أَبْصِرْ بِهِ وَأَسْمِعْ ط مَا لَهُم مِّن دُونِهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ۝

اے پیغمبر! اُن سے کہدو کہ ان کی تعداد تو میرے رب ہی کو خوب معلوم ہے۔ ان کا اصلی حال تو بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں۔ پس اے پیغمبر ان کے بارے میں ان لوگوں سے گفتگو نہ کرو مگر سرسری اور ان کا حال بھی ان میں سے کسی سے دریافت نہ کرو۔ اور کسی چیز کی نسبت یہ نہ کہا کرو کہ میں اس کام کو کل کر دوں گا۔ ہاں یوں کہا کرو اگر اللہ چاہے گا تو کر دونگا۔ اور جب ایسے موقع پر اس کا نام لینا بھول جایا کرو تو یاد کر لیا کرو۔ اور کہدیا کرو کہ شاید میرا رب مجھے اس سے بھی کوئی اور بہتر بات بتلائے۔ اور وہ اپنی غار میں نو اوپر تین سو برس رہے۔ اس پر بھی نہ مانیں تو کہدو اللہ تم سے بہتر جانتا ہے کہ کس قدر رہے آسمان اور زمین کا علم غیب اُسی کو ہے۔ وہ کیا ہی دیکھنے والا اور کیا ہی سننے والا ہے۔ اُس کے سوا لوگوں کا کوئی کارساز نہیں اور نہ وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک کرتا ہے۔

کہف کا موقع | عربی میں غار کو کہف کہتے ہیں، یہ غار کوہ سیلین میں تھا جو شہر افسوس سے ۲ میل کے فاصلہ پر تھا۔ اس شہر کا موقع لانگ مین کے نقشہ میں حسب ذیل ہے :-

	دقیقہ	درجہ
عرض البلد شمالی	۵۷	۳۷
طول البلد شرقی	۲۱	۲۷

شہر افسوس (انی سس) دریائے انجین کے کنارے پر واقع تھا۔ عربی جغرافیوں[۵۱] میں لکھا ہے کہ اصحاب الکہف کا غار شہر عموریہ اور نیقیہ کے مابین تھا اور شہر طرسوس (تارسم) سے اس کا فاصلہ دس یوم کی مسافت پر تھا۔ ایشیائے کوچک کا نقشہ دیکھو تو واضح ہوگا کہ شہر طرسوس (مرسینا) بحر روم کے کنارہ ہے، جسکے نیچے انطاکیہ اور اوپر روم کا علاقہ ہے جس کا عرض البلد اور طول البلد حسب ذیل ہے :-

	دقیقہ	درجہ
عرض البلد شمالی	۴۵	۳۶
طول البلد شرقی	۳۰	۳۴

اور یہ طرسوس اسلامی شہر تھا جسکو ۳۵۴ھ ۹۶۵ء میں نکفور قیصر نے فتح کیا (خلیفہ مامون الرشید عباسی کی قبر اسی شہر[۵۲] میں ہے) اور اسی بنا پر یہ قصہ عرب میں مشہور ہوا جن اصحاب نے یہ سمجھا ہے کہ طرسوس ہی کا نام افسوس تھا یہ جغرافی غلطی ہے۔ دونوں میں جس قدر فرق تھا وہ ظاہر ہے عربی تاریخوں اور جغرافیوں میں شہر افسوس اور اصحاب الکہف کا تفصیل سے ذکر موجود ہے۔ چنانچہ قزوینی نے آثار البلاد میں شہر افسوس کے حالات لکھتے ہوئے کہف کا موقع اس طرح پر بیان کیا ہے :-

افسوس مدینۃ مشہورۃ بارض الروم	ممالک روم میں افسوس مشہور شہر ہے یہ دقیانوس ظالم کا
وهي مدينة دقيانوس الجبار الذي	شہر ہے جسکے خوف سے اصحاب الکہف فرار ہوگئے تھے۔

---

۵۱ المسالک والممالک ابن خردادبہ صفحہ ۱۰۶ مطبوعہ ہالینڈ ۱۳۰۶ھ۔

۵۲ معجم البلدان صفحہ ۳۰ جلد ۶ شہر طرسوس۔

ھرب منه اصحاب الکھف وبین — کہف اور شہر میں چھ ۶ میل کا فاصلہ ہے اور کہف کا مُنھ بنات النعش
الکھف والمدینة مقدار فرسخین و — ستاروں کی طرف تھا (جانب شمال) جس میں دھوپ
الکھف مستقبل بنات النعش لا تدخل الشمس — نہیں جاتی تھی۔

اور کلام پاک سے بھی یہی ثابت ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ سورج مشرق سے نکل کر اصحاب الکہف سے کتراتا ہوا مغرب کی طرف چلا جاتا ہے یعنی غار کا مُنھ شمال کی جانب ہے اس وجہ سے اسکے اندر تاریکی چھائی رہتی ہے جہاں یہ موحدین ایک کشادہ جگہ میں سو رہے ہیں اور یہ خدا کی خاص حمرت ہے کہ اُنکو آفتاب کی تمازت سے بچایا، خلاصہ تحقیقات یہ ہے کہ اصحاب الکہف کا پہاڑ شہر افسوس ہی میں ہے۔ شام کے جس شہر کو عرب رقیم کہتے ہیں، اسکو اصحاب الکہف سے کوئی واسطہ نہیں ہے اس کے علاوہ اندلس (صحرائے جنان الورد) اٹلی اور مرحیک (علاقہ ترکمان) وغیرہ میں جو غار اصحاب الکہف کے نام سے مشہور ہیں وہ سب فرضی و مصنوعی ہیں۔

اصحاب الکہف خواب سے کب بیدار ہوئے۔

دوسری بحث جو سب سے اہم ہے وہ یہ ہے کہ اصحاب الکہف خواب سے کب بیدار ہوئے یا یہ کہ دوبارہ کب زندہ ہوئے۔ عیسائی روایات سے ظاہر ہے کہ اصحاب الکہف دقیانوس کے زمانہ میں داخل غار ہوئے تھے اور تھیوڈوسیس ثانی کے عہد میں ظاہر ہوئے۔ اگر دونوں کا ابتدائی عہد لیا جائے تو اقل درجہ ۲۰۰ برس کا زمانہ ہوتا ہے اور عام روایات مختلف تھیں، منجملہ ان کے ایک گروہ ۳۰۹ برس کا قائل[۵] تھا جیسا کہ قرآن پاک نے بتایا ہے۔ اور چونکہ یہ ایک بیکار بحث تھی لہذا خدا نے فرمایا کہ صحیح مدت کا علم ہمکو ہے۔ بعض عیسائی مورخین نے اس زمانہ کو ۹۰۰ برس تک بڑھا دیا ہے اس صورت میں ان کا داخل غار ہونا تقریباً ۵۰۶ء قبل مسیح قرار پاتا ہے اور اس توسیع مدت سے اصحاب الکہف کی کرامت کا اظہار مقصود ہے۔ روم کی تاریخ سے قطع نظر کرکے اب ہم عرب کی تاریخوں پر نظر ڈالتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ واقعہ کب کا ہے؟ اور اصحاب الکہف کب تک سوتے رہے؟ اور وہ کس مرتبہ اُٹھے؟ مسلمان مورخین اور مفسرین نے عموماً اصحاب الکہف کو دقیانوس کے عہد میں لکھا ہے۔ اور ابو الفدا اسکے نزدیک

۵؎ مورخ یعقوبی لکھتا ہے۔ وفی ایامہ ظھر اصحاب الکھف بعد ان کانوا قد ماتوا بعد دھر طویل فخرجوا مائة سنة و یقال ثلثمائة سنة وتسع سنین۔ صفحہ ۱۷۳۔ جلد اول۔

بادشاہ ۲۵۰ء اسکندریہ میں فوت ہوا ہے۔[۵۱] جس سے ظاہر ہے کہ اصحاب الکہف دقیانوس کے ہم عصر تھے اور اسی ظالم کے خوف سے یہ غار میں جاکر چھپے تھے۔ قزوینی نے آثار البلاد میں لکھا ہے کہ دقیانوس کے دربار سے جب یہ لوگ گھر واپس آئے تو دو روز تک غور کرتے رہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے؟ بالآخر تیسرے دن (جو مہلت کا اخیر دن تھا) انھوں نے فیصلہ کیا کہ صرف آج کا دن اور رات باقی ہے لہذا وہ رات ہوتے ہی شہر سے پہاڑ کی طرف چلے گئے اور راستہ میں ایک چرواہا مع کتّے کے ملا اُن کو بھی توحید کی تعلیم دے کر اپنے ساتھ لے لیا۔ اور صبح ان کو غار کے دروازہ پر ہوئی۔[۵۲]

عیسائی روایت کے مطابق اصحاب الکہف عہد دقیانوس میں دو ایک روز تک غار سے باہر نکلے اسکے بعد غار کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ اس روایت کی تائید میں صرف مورخ ابن اسحاق کی ایک روایت[۵۳] ہے جو لکھی جاتی ہے۔

روایت ابن اسحق | یملیخا ہر روز از غار بیروں آمدے و پنہاں در شہر شدے واز بہر اصحاب طعام خریدے و بہ ایشاں بردے یک روز از بہر طعام بہ شہر آمدہ بود کہ آوازہ بہ شہر فاش شدہ است کہ دقیانوس با لشکر بہ طلب یملیخا واصحاب وے بیرود۔ یملیخا زود طعامے کہ می بایست بخرید و بگرفت و بغار باز آمد پیش اصحاب و حکایت با ایشاں بگفت کہ دقیانوس و لشکر بر نشستند و بہ طلب ما بیروں آمدند ایشان چون این بشنیدند

---

۵۱ سکندر ۳۳۶ قبل مسیح میں تخت نشین ہوا تھا اور دقیانوس ۵۴۰ سکندری میں فوت ہوا لہذا اس کا سنہ وفات ۲۵۰ء قرار پاتا ہے اور تاریخ روم میں اس کا عہد ۲۴۹ء سے ۲۵۱ء تک ہے ابو الفدا صفحہ ۲۳ جلد اول ملوک الروم۔

۵۲ قزوینی کی عبارت یہ ہے۔ فلما کان الیوم الثالث اجتمع الفتیۃ وقالوا انما بومنا ہذا ولیلتہ وعزموا علی الھرب فی تلک اللیلۃ فلما جنھم اللیل حمل کل احد شیئاً من مال ابیہ فخرجوا من المدینۃ۔۔۔ فساروا لیلتھم واصبحوا علی باب الکہف دخلوا۔

۵۳ سیرۃ ابن اسحاق نسخہ قلمی حمیدیہ لائبریری۔

دست بر طعام نہادند و بدعا بتضرع درآمدند و از خدائے درخواستند کہ ایشاں را از چشم دقیانوس ولشکروے محجوب گرداند حق تعالیٰ دعاے ایشاں مستجاب گردانید و دیدۂ ایشاں درخواب کرد و آں ہراس و ترس از دل ایشاں گرفت پس دقیانوس ولشکراو ہمہ برنشستند و ہمہ کوہ وصحرا بطلب ایشاں بگردیدند ایشاں را نیافتند بعد ازاں بدر خانہ فرود آمدند و حق تعالیٰ ایشاں را از چشم لشکر باز پوشید و ایشاں را نہ دیدند و بیروں آمدند دقیانوس را گفتند کہ اے بادشاہ ہمہ جا بگردیدیم ایشاں را نیافتیم دقیانوس گفت ظن ایشاں دریں غار باشند اکنوں دریں غار بہ سنگ و گچ برآرید"

خلاصہ روایت یہ ہے کہ دقیانوس کے آدمیوں نے ان کو غار کے اندر بہت تلاش کیا جب یہ نہیں ملے تو حکم دیا کہ غار کا منہ پتھر و چونہ سے بند کر دیا جائے" مورخ ابن اسحاق کے معتبر ہونے میں کلام نہیں ہے لیکن قرآن پاک سے اصحاب کہف کا غار سے باہر نکلنا صرف ایک ہی مرتبہ ثابت ہے اور وہ بھی برسوں کی نیند کے بعد الہذا یہ روایت ہمارے نزدیک عرب میں روم سے پہنچی جسکو مورخین اسلام نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے اور اگر فرض کیا جائے کہ وہ دو مرتبہ اٹھے تو ان کی پہلی بیداری معمولی ہے جسکو خدا نے قابل تذکرہ نہیں سمجھا۔

اصحاب الکہف کی نیند کس قسم کی تھی

مذہب اسلام میں جو لوگ خدا کی راہ میں مارے جاتے ہیں ان کو شہادت کا درجہ نصیب ہوتا ہے اور ایک قسم کی دوامی زندگی عطا ہوتی ہے۔ اگرچہ ایسے اصحاب کو بھی اصطلاحاً ہم مردہ کہتے ہیں لیکن خدا کے نزدیک وہ زندہ ہیں، البتہ اس کا علم ہم کو نہیں دیا گیا ہے کہ ان کی زندگی کس قسم کی ہے، تقریباً یہی حالت اصحاب الکہف کے خواب کی بھی ہے کہ خدا نے ان موحدین پر غفلت کی نیند طاری کر دی تھی جسکو عیسائی زندہ سمجھتے تھے اور جب ان میں یہ بحث[1] پیدا ہوئی کہ کوئی مر کر دوبارہ نہیں اٹھ سکتا ہے تو خدا نے ان کو اپنی قدرت کا ملہ سے

---

[1] چند مورخین نے لکھا ہے کہ تھیوڈوسیس کے عہد میں دو فریق تھے - ایک حشر اجساد کا قائل تھا۔ اور دوسرا منکر چنانچہ علامہ دمیری لکھتے ہیں- دتحزب الناس فی ملکہ احزابا فمنہم من یومن باللہ ویعلم ان الساعۃ حق ومنہم من یکذب-

(باقی بر صفحہ آیندہ)

ایک مرتبہ بیدار بھی کردیا یا یوں کہنا چاہیئے کہ مردہ سے زندہ کردیا اور صدیوں تک ان کو غار میں بحال خود قائم رکھا اور صراحت کردی کہ ہم دائیں بائیں ان کی کروٹیں بدل دیتے ہیں عالم مثال میں یہ ان کی ابدی زندگی کا گویا ایک استعارہ ہے۔ ورنہ خدا اس پر قادر ہے کہ بغیر کروٹ کے بھی ان کی لاشیں صحیح وسالم رہیں۔ اور عیسائی[1] اس کے قائل ہیں کہ اصحاب الکہف سونے والوں کی طرح کروٹ بدلا کرتے ہیں چنانچہ مورخ ولیم آف ناس بری ۱۰۸۰ء لغایتہ ۱۱۴۳ء لکھتا ہے کہ وسٹ منسٹر کے محل میں ایسٹر کے جلسے کے دن شاہ **ایڈورڈ** (انگلستان) ملقب بہ مقدس (متوفی ۱۰۶۶ء ۴۵۹ھ) نے اثنائے دعوت میں یکایک گوشت اور شراب کو اپنے سامنے سے ہٹا دیا اور مراقبہ میں مصروف ہوا اور پھر یکایک زور سے ہنسا "ختم دعوت کے بعد جب اسکے مصاحب **ارل ہیرلڈ** نے اس ہنسی کا سبب دریافت کیا تو کہا کہ میں نے ابھی یہ دیکھا ہے کہ افی سیس کے سات سونے والوں نے آج دفعتاً بائیں کروٹ بدلی ہے اور یہ خدا کی مہربانی ہے کہ میں نے ان کو کروٹ بدلتے ہوئے دیکھا" ارل ہیرلڈ نے اس قول کی تصدیق کے لئے تین آدمیوں کو جن میں ایک پادری بھی تھا افی سیس بھیجا اور انہوں نے غار میں بچشم خود دیکھا کہ یہ اصحاب بائیں کروٹ سو رہے ہیں اور افی سیس کے لوگوں نے بیان کیا کہ ہم نے اپنے بزرگوں سے سُنا ہے کہ یہ سات سونے والے ہمیشہ سے دہنی کروٹ پر سوتے تھے اور تبدیلی کروٹ سے اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ عیسائیوں کو مسلمان ترکوں یا تاتاریوں کے حملے سے مصائب اُٹھانا پڑیں گے، کیونکہ جب کوئی مصیبت آنے والی ہوتی ہے اُس وقت یہ سونے والے کروٹ بدلتے ہیں" مقدس بادشاہ نے ممکن ہے کہ اصحاب کہف کو کروٹ بدلتے دیکھا ہو لیکن واضح رہے کہ یہ واقعہ نزول قرآن کے چار صدی بعد کا ہے اور یہ امر بھی بہت کچھ مشتبہ ہے کہ اس زمانہ میں اصحاب کہف کی لاشیں غار کے اندر موجود بھی تھیں یا نہیں (مفصل بحث آگے آتی ہے)"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) فحزن حزناً شدیداً لما رای اہل الباطل یزیدون ویظہرون علی اہل الحق ویقولون لاحیاۃ الاحیاۃ الدنیا وانما تبعث الارواح ولا تبعث الاجساد ۱۲

[1] رسالہ ترتیم صفحہ ۶ بحوالہ کتاب بارنگ گولڈ ۱۲

اصحاب الکہف کی تعداد کیا تھی

مورخین یوم نے اختلاف کیا ہے کہ اصحاب الکہف کی تعداد کیا تھی، کوئی کہتا ہے کہ تین تھے کسی کا قول ہے کہ پانچ یا چھ تھے اور سات کی تعداد پر زیادہ زور[1] دیا جاتا ہے، اور جو کتبہ غار کے دروازہ پر لگایا گیا تھا اُس پر بھی سات ہی نام کندہ تھے۔

چونکہ یہ مسئلہ خود رومیوں میں غیر منفصل تھا لہٰذا اسی اختلاف کے ساتھ قرآن مجید میں بیان ہوا اور یہ اعجاز قرآنی ہے کہ واقعہ کا بیان مشہور عام روایت کے مطابق ہوا۔

اصحاب الکہف کا کیا حشر ہوا

عیسائی زائرین تو اس پہاڑ کی زیارت کو جاتے ہی ہوں گے لیکن مسلمان سیاحوں نے بھی اس غار کو جاکر دیکھا ہے اور سلاطین اسلام نے بھی اصحاب الکہف کی اچھی تحقیقات کی ہے۔ خلیفہ واثق باللہ عباسی (متوفی ۲۳۲ھ) نے محمد بن موسیٰ منجم کو اصحاب الکہف کی تحقیقات کے لئے بھیجا تھا جسکی پوری تفصیل جغرافیہ ابن خرداذبہ اور معجم البلدان میں موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اصحاب الکہف کا پہاڑ روم کے ملک ترقیس (طرسوس) میں ہے اور جس کے ایک قلعہ کا نام افی سیس ہے اور اسی جگہ ایک پہاڑ ہے جسکی تلی میں سرنگ ہے جسکے اندر تقریباً ۳۰۰ قدم چلنے کے بعد ایک کشادہ دالان ہے جو پہاڑ کے اندر ستون تراش کر بنایا گیا ہے اور اس دالان میں کئی حجرے ہیں اور ایک حجرہ قدِ آدم اونچا ہے جسکے اندر لاشیں تھیں جو جبر، کافور، اور مُر سے حنوط کی گئی تھیں تاکہ خراب نہ ہوں، اور کھال جسم سے لپٹی ہوئی تھی (یعنی خشک ہو گئی تھی) جب ہم نے اُن کے سینے پر ہاتھ رکھا تو بالوں میں کرختگی پائی اور بال بڑھے ہوئے تھے۔ اس غار کے محافظ ہم کو قتل کرنا چاہتے تھے تاکہ اُنھوں نے جو کچھ قیصر روم سے بکھ رکھا ہے اسکی صحت میں شک نہ ہو۔

محمد بن موسیٰ کے اخیر الفاظ سے پایا جاتا ہے کہ یہ غار تو اصحاب الکہف کا ضرور تھا مگر

---

[1] مورخ ملطی کہتا ہے "وفی زمان ثاودسیوس کان الفتیۃ السبعۃ اصحاب الکہف الذین ہربوا منہ واختفوا فی مغارۃ فوق کہف" مختصر الدول صفحہ ۱۲۷ -

لاشیں انکی نہ تھیں۔ اور مورخین یورپ کی بھی روایات سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ بارنگ صاحب بھی کہتے ہیں کہ "ان کی ہڈیاں ایک بڑے پتھر کے بکس میں بند کر کے مارسیلس بھیجدی گئی تھیں جواب بھی سینٹ وبکڑ (پیرس کا سب سے بڑا گرجا) کے گرجا میں دکھائی جاتی ہیں۔ اور عجائب خانہ وکٹوریم میں ان کی تصویریں بھی پلاسٹر سے بنائی گئی ہیں۔ چنانچہ میک سی میں کے پاس ایک گرہ دار عصا ہے۔ مالکس اور مارسین کے پاس دو تیر ہیں سیر اپین کے سامنے جلتی ہوئی مشعل ہے ڈایونی سس کے قریب دشمنوں کی سرکوبی کے لئے ایک میخ رکھی ہوئی ہے اور جان اور کانسٹن ٹائن کے پاس بھی دو عصا ہیں اور یہ وہ سامان ہے جو ضرورتاً اصحاب الکہف اپنے ہمراہ لے گئے تھے"۔

صاحب موصوف نے یہ نہیں لکھا کہ یہ ہڈیاں کب عجائب خانہ میں بھیجی گئیں۔ لیکن ہماری رائے میں یہ ہڈیاں مصنوعی اصحاب الکہف کی ہونگی کیونکہ اصلی لاشیں تو عہد اسلام سے کئی صدی پہلے غار سے غائب ہو چکی تھیں جس کی تصدیق مورخ طبری[۵۱] کی اس روایت سے ہوتی ہے :-

قال قتادہ وغزا ابن عباس مع حبیب بن مسلمہ فمروا بالکہف فاذا فیہ عظام فقال رجل ھذہ اعظام اصحاب الکہف فقال ابن عباس لقد ذھبت منہ اکثر من ثلثمائتہ سنتہ	قتادہ سے روایت ہے کہ جب ابن عباس حبیب بن مسلمہ کے ساتھ جہاد پر گئے تو وہ کہف پر گزرے جس میں کچھ ہڈیاں تھیں ایک شخص نے کہا کہ یہ اصحاب کہف کی ہڈیاں ہیں ابن عباس نے فرمایا کہ تین سو برس سے زیادہ عرصہ ہوا اُن کی ہڈیاں چلی گئیں۔

یہ واقعہ ۱۶ھ ۶۳۷ء یا ۱۷ھ ۶۳۸ء کا ہے جب کہ ابو محمد[۵۲] فضل بن عباس بن عبدالمطلب (متوفی ۱۸ھ ۶۳۹ء) حبیب بن مسلمہ فہری (متوفی ۴۲ھ ۶۶۲ء) کے ہمراہ شام کے جہاد (فتح حمص و ناحیہ اردن) میں

---

۵۱ طبری صفحہ ۷۰۲ جلد اول جزء ۲ مطبوعہ ہالینڈ ۱۲

۵۲ تلقیح ابن جوزی نسخہ قلمی حمیدیہ لائبریری و تقریب التہذیب و بلاذری ۱۲

شریک تھے اور چونکہ یہ مقام انطاکیہ سے قریب تھا لہذا اصحاب الکہف کا پہاڑ بھی ملاحظہ فرمایا اس روایت سے ظاہر ہے کہ آغاز چوتھی صدی عیسوی میں اصحاب کہف کی ہڈیاں غار سے غائب ہو چکی تھیں اور یہ واقعہ دوسری بیداری کے بعد ہوا ہوگا[۱]۔ عام مورخین کا بیان ہے کہ اصحاب الکہف تھیوڈیسس کے عہد میں بیدار ہوئے تھے اور اس یادگار میں عیسائی غار کا دروازہ بند کرنا چاہتے تھے اور مسلمان مسجد بنانے کی فکر میں تھے جس کا ضمنی تذکرہ قرآن مجید میں بھی موجود ہے لہذا ہماری رائے میں تھیوڈوسیس ہی کے زمانہ میں یا اس کے بعد یہ لاشیں غائب ہوئی ہیں اور اخیر دور میں مصنوعی ہڈیاں عجائب خانۂ فرانس میں بھیجی گئی تھیں، بہرحال اصحاب الکہف کا واقعہ ایمان داروں کے لئے ایک عبرت انگیز کہانی ہے۔

ان تاریخی حالات کے بعد اب ناظرین آیات مندرجہ بالا کو غور سے تلاوت کریں تو انکو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا ایک ایک حرف قدیم تاریخ کی مطابق ہے۔

اسی سلسلہ میں یہ بھی لکھنا ضرور ہے کہ ایک گروہ ہمارے زمانہ میں اس بات کا قائل ہے کہ "اصحاب الکہف غار میں جاتے ہی سو گئے اور ایک دن یا اس کے بعد جب سو کر اُٹھے تو چرواہے کو بازار بھیجا کہ وہ بازار سے کھانا خرید لائے۔ چنانچہ اس ابتدائی واقعہ کو خدا نے معہ حالات غار کسی قدر تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ اور اصحاب الکہف کا صدیوں کے بعد دوبارہ خواب سے اُٹھنا یا اُن کا زندہ ہونا یہ ایک لغو فسانہ ہے جسکو عقل سلیم تسلیم نہیں کرتی ہے۔ صحیح واقعہ صرف اس قدر ہے کہ دقیانوس نے ان کے غار کا مُنہ بند کر دیا تھا۔ ایک عرصہ کے بعد جب غار کا مُنہ کسی وجہ سے کھل گیا تو اصحاب الکہف کی ہڈیاں برآمد ہوئیں مفسرین نے اس واقعہ کو بہت پھیلا کر لکھا ہے

---

[۱] اس واقعہ کی نسبت دمری لکھتے ہیں کہ جب تھیوڈسیس غار سے باہر نکل آیا تو خدا نے اصحاب کہف کو لوگوں کی نظروں سے چھپا دیا تاکہ کوئی ان کے حال سے واقف نہ ہو۔ اور غار کے اوپر ایک مسجد بنوا دی جہاں بطور یادگار سالانہ میلہ ہونے لگا۔

اور اس میں عجائبات پرستی کے واقعات کو داخل کر دیا ہے اور عرب کے لوگ بھی اس قصہ کو عجیب و غریب سمجھتے ہیں اور تعجب اس بات پر تھا کہ یہ اصحاب برسوں تک سوتے رہے اور پھر اُٹھ بیٹھے۔ لہذا خدا نے بذریعہ وحی مطلع فرمایا کہ یہ ایک معمولی واقعہ ہے۔ جیسا کہ دنیا میں عام واقعات ہوا کرتے ہیں۔ یہ واقعہ کسی طرح اس قابل نہیں کہ اس پر اظہار تعجب کیا جاوے۔"

جو حضرات اس بحث اور نئی تفسیر کو دیکھنا چاہتے ہوں اُن کو سرسید احمد خاں مرحوم کا رسالہ ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم دیکھنا چاہیئے +

محمد عبد الرزاق مصنف البرامکہ

کلام شہید

محبت ہو رہی ہے آجکل ہمت فزا میری — نہ کر دے بے نیاز عشق، خود مجکو وفا میری

وہ بزم غیر میں ایسے ہوے سرگرم ہنگامہ — سمجھتے ہیں کہ سنتا ہی نہیں گویا خدا میری

تہ شمشیر تم میرا سر تسلیم پاتے ہو، — تمہاری انتہاے ظلم ہے گویا وفا میری

کیا مانوس آخر چھیڑ کر فرہاد کا قصہ — مرا ہمراز اُن سے سب کہانی کہہ گیا میری

وہ بولے ناز برداری بُری ہے۔ یہ خطا کس کی — تو شک کے دور کرنے کو مجھے کہنا پڑا۔ میری

قدم اُٹھتے ہی میرا رہنما صورت کو تکتا ہے — نظر آتی ہے گویا ابتدا میں انتہا میری

شہید خنجر صبر و وفا ہوں شرم رکھ لینا — نہو ضائع الٰہی کوشش بے انتہا میری

شہید مرحوم

سعادتمند فرزند

ایک خواب گاہ میں مختلف قسم کا اسباب منتشر پڑا ہوا ہے۔ گولف کھیلنے کے ڈنڈے مچھلی کے شکار کی بنسیں، پولو اسٹکیں اور بندوق کے بکس سب یوں ہی اِدھر اُدھر کھلے پڑے ہیں۔

ایک نوجوان لڑکا اور ایک متوسط العمر آدمی ایک دوسرے کو تند نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں لڑکا غصہ سے کانپ رہا ہے لیکن دوسرا آدمی استقلال اور اطمینان کے ساتھ کھڑا ہے تاہم اس کے چہرہ پر خشونت کے آثار پائے جاتے ہیں۔

اسی حالت میں لڑکے نے زیادہ مشتعل ہو کر کہا میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی زیادتی اور سخت گیری ہی اُس کے یہاں سے چلے جانے کا باعث ہوئی۔

دوسرے آدمی نے اپنے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے جواب دیا۔ بے شک تم اپنی رائے میں آزاد ہو۔

لیکن آخر آپ نے اب تک اس واقعہ کو مجھ سے کیوں چھپایا کیوں آپ نے اس کا انتظار کیا کہ ایک دن میں خود ہی یہ واقعہ معلوم کر لوں گا۔ اگر آپ کو فی الحقیقت کوئی امر باعث شرمندگی نہیں تھا تو آپ نے مجھے کیوں یہ خیال قائم کرنے دیا کہ وہ مر چکی ہے۔

لڑکے کے باریک لب اُس کے ستواں چہرہ پر کانپ رہے تھے۔

محض اس خیال نے کہ تم اس بے خبری کی حالت میں زیادہ خوش تھے۔

آہ! گویا میں خوش رہنا چاہتا تھا۔ جب کہ وہ میری ماں انتہائی مصیبت اور تنگدستی کی حالت میں زندگی بسر کر رہی ہو۔

میں اس مصیبت کا ذمہ دار نہیں ہوں تمہاری ماں اپنی خوشی سے چلی گئی۔

جی نہیں وہ یقیناً آپکی زیادتیوں سے تنگ آ کر اپنے گھر سے نکلی یا آپنے خود اُس کو قصداً نکالا۔

دوسرے شخص نے اپنے کندھوں کو بے پروائی کے ساتھ حرکت دیتے ہوئے کہا۔ تم بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو۔ تمنے بغیر واقعات معلوم کئے میری مخالفت پر کمر باندھی ہے۔ تمہاری میرے تعلقات ہر شخص جانتا ہے کہ بہتر سے بہتر محبت پر قائم رہے ہیں۔

کیا خوب! کیا محبت اور کیا تعلقات۔ اور اس حالت میں کہ آپ کا طرزِ عمل میری ماں کے ساتھ اس قدر ناگفتہ بہ ہو، افسوس ہے کہ میں اب تک اس سے ناواقف رہا۔

دوسرے شخص نے ٹہلتے ہوئے کھڑکی تک پہونچکر اور بیرونی منظر پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ تم نہایت خوش و خُرّم رہے۔ اس کے ساتھ اس کے لبوں پر تبسم ظاہر ہوا

سبحان اللہ! کیا مسرت اور کیا خوشی، کاش میں اس سے پہلے ہی واقف ہو جاتا آپنے آخر کیوں ظاہر نہیں کیا؟ اور اس واقعہ کو کتنا زمانہ گزرا؟

۱۶ سال گزر گئے! اُس وقت تم دو برس کے تھے۔

آہ! اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اُس کے معصوم بچے کو بھی اُس کی گود سے چھین لیا تھا۔

مخاطب شخص نے ایک بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تمہاری قیاسی ہمدردی اس موقع پر فضول ہے کیونکہ اُسے بچوں کی قطعی پروا نہ تھی۔

بس میں زیادہ نہیں سن سکتا۔ آپ اُسکی عزت پر حملہ کرتے ہیں اور اُس کی انتہائی تحقیر کرنا چاہتے ہیں۔

اچھا! میں تو اُسکے پاس جانا چاہتا ہوں، کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ کہاں

قیام پذیر ہے ؟

نہیں ۔

کیا "ڈرے کورٹ" کو اس کا علم ہے ؟

ہاں ! غالباً وہ جانتا ہے ۔ کیونکہ اُسے روپیہ وغیرہ وہی بھیجا کرتا ہے ۔

اس کے بعد کمرہ میں چند منٹ سکوت رہا ۔ وہ شخص اس اثناء میں کمرہ کی طرف پشت کئے کھڑا رہا ، پھر اُسنے چونک کر سگریٹ باہر پھینک دیا اور لڑکے کی طرف رخ کر کے کہا اچھا تو تم منگل کو میرے ہمراہ دریا کے سیر کو نہ چلو گے ۔

لڑکے کی آنکھیں اُس کے سفید چہرہ پر تیز انگاروں کی طرح روشن تھیں اور اُسنے کہا نہیں معاف کیجئے اب میں کہیں نہیں جاؤں گا ۔ کمرہ میں کچھ دیر پھر خاموشی رہی ۔ دوسرے شخص نے کچھ سوچکر اور اپنے کندھوں کو حرکت دیکر کہا ۔ بہتر ہے ۔ تب میں تنہا ہی جاؤں گا ۔

لڑکے نے نظر اٹھا کر اُسے دیکھا ، کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر رک گیا ۔ ہاتھ کو آگے بڑھایا پھر کھینچ لیا ۔ اور اک دم اضطراب کے ساتھ کمرہ سے نکل گیا ۔

کچھ دیر خاموشی رہی دوسرا شخص خود بخود مسکرایا لیکن اُسکی مسکراہٹ میں خوشی کا کوئی عنصر نہ تھا ، اُس نے اپنی پاکٹ بک سے ایک چیز نکالی اور اُس کے دیکھتے ہی اُس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی ۔ یہ ایک انتہائی حسین و جمیل لڑکی کا فوٹو تھا جو اسکے عین شباب اور دلفریبی کے زمانہ میں لیا گیا تھا بڑی دیر تک غور سے اُس فوٹو کو دیکھتا رہا ۔ اُسکی نظر اُس کے محراب نما ابروؤں پر پڑ رہی تھی وہ اُسکی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کو دیکھ رہا تھا ۔ اُسکے کے مناسب و موزوں خط و خال اور خوشنما خم دار لب اُس کے پیش نظر تھے ۔ اُس کے چہرہ پر اس فوٹو کو دیکھنے سے حسرت و غم کے جذبات آشکار تھے ۔ یکایک اُسکو دیکھتے دیکھتے اُس کا خیال منتقل ہوا اور اُس نے ایک اضطراری حالت کے ساتھ تصویر کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے آگ میں ڈالدیا ، اور یہ الفاظ اُس کی زبان سے نکلے

"میں یقیناً تجھے اپنے پاس محفوظ رکھتا ۔ کیونکہ ایک زمانہ میں تجھ سے بے انتہا محبت تھی لیکن اب مجھے تیری ضرورت نہیں ، میری تمام مسرتوں کیساتھ

تجھے بھی ختم ہو جانا چاہئے۔
تو نے میری آخری امید کو بھی مجھ سے منقطع کر دیا جس سے میری زندگی
میں خوشگواری پیدا ہوتی تھی"!

(۲)

کھڑکیوں پر گلابی رنگ کے ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے کمرہ کا چمکدار اور اعلیٰ درجہ کا فرنیچر آتشدان کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ کمرہ میں سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو مہک رہی تھی ایک مسہری پر ایک خوبصورت عورت لیٹی ہوئی غمناکی کے ساتھ خفیف طریقہ پر مسکرا رہی تھی وہ سیاہ ریشم کا لباس پہنے ہوئی تھی جسکی آستینوں پر سفید مخمل لگا ہوا تھا۔ ایک لڑکا مبہوت صورت بنائے اُس کے سامنے کھڑا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بولنے کے لئے لفظوں کا متلاشی ہے۔ بڑی کوشش کے ساتھ اُس نے کہا۔ آپ کو میرا تار ملگیا تھا۔ عورت نے ایک محبت بھری آہ کھینچی۔ ہاں کاش ڈریک تم جانتے کہ میں گزشتہ سالوں میں تمہارے دیکھنے کے لئے کیسی بےچین رہی ہوں۔ اور آخر کار اب ....

مجھے اس کا کچھ علم نہیں ہوا۔ اُسنے اپنے دانتوں کو دبائے ہوئے کہا۔ مجھے کچھ بھی نہیں معلوم ہو سکا۔ وہ خاموش کھڑا تھا اور اُسے دیکھ رہا تھا۔

عورت نے اُس کی محبت بھری ہوئی منکسر نظروں سے نظر ملاتے ہوئے سکون قلب کے لئے ایک گہری سانس لی اور اسے اشارہ کیا کہ وہ ایک صوفے پر جو قریب ہی پڑا تھا بیٹھ جائے، وہ جس مبہوت طریقہ سے کھڑا تھا اُسی حالت سے بیٹھ گیا۔ یقیناً اُسکو یہ خیال و گمان بھی نہ تھا کہ وہ اب تک اتنی کم عمر اور اس قدر حسین ہوگی۔ اُسکے سنہری بال جو روشنی میں چمک رہے تھے، اس کے رخساروں کا ہلکا گلابی رنگ جو ریشمی غلاف سے ڈھکے ہوئے لیمپ کی روشنی میں نمایاں تھا، اور سب سے زیادہ عجیب اس کے لباس کی مست کر دینے والی خوشبو، یہ تمام باتیں اُس نوجوان لڑکے کو متحیر کر رہی تھیں۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ باوجود اس قدر حسین اور کم عمر ہونے کے وہ بغیر کسی حفاظت کے زندگی بسر کر رہی ہے۔ لڑکے نے ارادہ کیا

کہ وہ اپنی زندگی اُسکی حفاظت اور اطاعت کے لئے وقف کر دے گا۔ محبت اور جذبہ فرماں برداری کی لہر اُسکے دل میں دوڑ رہی تھی کہ یکایک اُس کو اپنے باپ کا خیال آیا جو اپنے دریائی سفر پر جس کی اسکیم دونوں نے ملکر بنائی تھی تنہا جانے پر مجبور ہوا۔ اس خیال نے اسکو افسردہ کر دیا۔

(۳)

گورے اور نازک ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ اُٹھا اور اس کی پشت پر نہایت شفقت کے ساتھ رکھا گیا۔ میرے بیٹے اُس نے آہستہ سے کہا۔ جسوقت مجھے معلوم ہوا میں فوراً چلا آیا اُس نے ٹوٹے ہوئے لفظوں میں جواب دیا۔

ہاں مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے اور تم ان بدسلوکیوں کو بھی معلوم کرو گے جس سے پریشان ہوکر میں نے اُسے چھوڑا۔ اسکی شیریں آواز پُر درد ہوگئی اسکی آنکھیں نمناک ہوگئیں آہ اوسنے میرے پیارے بچے اور میرے جگر کے ٹکڑے کو بھی مجھ سے چھین لیا۔ وہ بیچین ہوگیا اور اُس نے اس کا نازک ہاتھ اپنے گندمی ہاتھوں میں لیکر کہا۔ اس کا تذکرہ چھوڑ دو اور ان واقعات کو بھول جانے کی کوشش کرو۔

لیکن تم کو ان واقعات کا ضرور علم ہونا چاہئے تاکہ تم مجھ پر الزام نہ رکھو۔ تم کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ مجھے کس خوفناک طریقہ پر ستایا گیا ہے اور کس سختی کے ساتھ مجھے نکالا گیا، اس اثنا میں لڑکے کے دماغ میں خیالات کا ایک تسلسل قائم تھا، اور بہت سے ناخوشگوار منظر اُس کے پیش نظر تھے۔

اپنے باپ کے ساتھ صبح کو تفریح، شام کے وقت پیاری پیاری باتیں مختلف ورزشی کھیل چھوٹے چھوٹے سفر اور وہ تمام محبت بھری صحبتیں جن سے اسکی خوشی و مسرت کی تکمیل ہوتی رہی ہے ایک تصور باطل کی طرح اُس کے سامنے آرہی تھیں۔

اُس نے دانتوں سے ہونٹوں کو دباتے ہوئے کہا ہاں میں سمجھتا ہوں۔

اس تمام عرصۂ دراز میں گو میں تنہا رہی لیکن تمہارے ملنے کا خیال اور آرزو ہی میری زندگی میں گوناگوں توقعات کو قائم رکھتی تھی۔ اور اسی ایک خیال پر میں زندہ تھی۔

وہ بالکل ساکت تھا اور اپنے جذبات کو ضبط کر رہا تھا۔

آخرکار میرا بچہ جوان ہوگیا اور میری تلاش سے مجھ تک پہنچ گیا۔
اس وقت سے میری زندگی تمہاری خدمت اور اطاعت کے لئے ہوگی، وہ یہ کہہ رہا تھا لیکن صاف وشفاف روشنی سے تجلی، عطر بیز خوشبو سے معطر کمرہ عجیب طریقہ سے مصنوعی معلوم ہوتا تھا وہ اسکی فضا میں ایک عجیب قسم کی اجنبیت محسوس کر رہا تھا، اُسکے منہ سے جو آواز نکلتی تھی وہ بھی مصنوعی معلوم ہوتی تھی اور یہ تمام منظر ایک خواب وخیال سا معلوم ہو رہا تھا۔
میں ہمیشہ تمہاری امداد اور حفاظت کرونگا اُس کے الفاظ میں ایک کشمکش معلوم ہوتی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کمرہ کی اجنبیت سے مقابلہ کر رہا ہے۔
آتشدان کی آگ بھڑک رہی تھی عورت نے اپنی خوبصورت اور بڑی بڑی آنکھیں اُس کے چہرہ کی طرف اُٹھائیں جو اس وقت پھیکا اور مضمحل معلوم ہوتا تھا۔ میرے پیارے میں اس تمام تنہائی اور فلاکت کے زمانہ میں . . . . . وہ رُکی لیکن پھر ان الفاظ پر زور دیکر کہا۔ اس فلاکت اور تنہائی کے زمانہ میں۔
وہ چونکا اور چونک کر کہا۔ ہاں کیا تم . . . . . کیا تمہیں . . . . اُس کا رنگ متغیر ہو رہا تھا، پھر کیا تم فی الواقعی سخت ضرورتمند ہو اُس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور کسی قدر نرمی کیساتھ گویا کہ وہ ندامت کے ساتھ کہہ رہی ہے۔ آج تمہارے آنے کا پہلا ہی روز ہے، ہمیں اس تذکرہ کو چھوڑ دینا چاہیئے۔
نہیں اسکو جاری رکھیئے اسکی ضرورت ہے۔
جس وقت میں چلا ہوں خود یہ خیال کر رہا تھا اور اسی لئے میں تیار ہو کر بھی چلا۔ میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ میرے امکان میں ہے میں تمہاری خدمت میں پیش کر دوں اور تمہاری پریشانیوں کو کسی قدر کم کر سکوں، مجھے اس سے مسرت ہوگی۔
یہ کہہ کر اسنے اپنی جیب سے پاکٹ بک نکالی اور اسمیں سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اسکی نگاہیں نیچی تھیں اور اُسنے ماں کے چہرہ پر سُرخی اور اُسکی آنکھوں میں چمک کو نہیں محسوس کیا جو نوٹوں کے دیکھنے سے پیدا ہوگئی تھی۔

لڑکے کا قیام ایک ہفتہ رہا اُس کی ماں روز روشن میں اس قدر حسین نہیں معلوم ہوتی تھی جیسی کہ شب کے وقت لیمپ کی روشنی میں نظر آتی تھی جب کہ اُس کے سُنہری بال زیادہ سُنہرے ہو جاتے تھے اور اس کا گلابی اور شفاف چہرہ زیادہ سُرخ اور منور معلوم ہوتا تھا۔

مکان میں سامان تعیش ایسا تھا جس کا وہ پہلے سے عادی نہ تھا، اسکی ماں کی تنہائی اور افسردگی بھی عجیب قسم کی تھی جسکی نوعیت سمجھنے سے وہ قاصر رہا۔

گھر میں ایسے لوگوں کی آمد و رفت تھی جس سے اُسکی روح متنفر تھی لیکن یہ تمام باتیں وہ برداشت کر رہا تھا اس لئے کہ وہ اپنی ماں کا مطیع ہو کر رہنا چاہتا تھا۔

وہ کہا کرتی تھی کہ میں تجھ سے محبت کرتی ہوں اور مجھے ضرورت ہے کہ تیرا قیام ہمیشہ میرے پاس رہے۔ اس لئے وہ ٹھیرا رہا۔ اس نے ظاہر کیا کہ وہ مقروض ہے اور ضروریات زندگی کے لئے روپیہ کی محتاج ہے اور اسنے اپنا تمام روپیہ اُسکے قدموں پر ڈال دیا لیکن اسکی ضروریات ختم نہ ہوتی تھیں اور فرمائشوں کا سلسلہ برابر جاری تھا۔

سعادتمند لڑکے نے ماں کے کسی فعل پر بھی اعتراض کا کوئی حرف زبان سے نہیں نکالا وہ بہت سی باتیں ناپسند کرتا تھا۔ لیکن پاس ادب اور جذبۂ اطاعت اسکو زبان کھولنے سے معذور کر دیتا تھا،

خوشبو جو وہ استعمال کرتی تھی اُسے بیحد ناپسند تھی لیکن اُسنے اپنے تنفر کا کبھی اشارۃً بھی اظہار نہیں کیا، ظاہر ہے کہ اس قسم کی خلاف طبیعت زندگی میں وہ کیسے خوش رہتا ہوگا۔ بعض اوقات جب وہ اپنے شفیق باپ کے ساتھ اپنی زندگی پھر خیال کرتا تھا تو گزشتہ باتیں ایک خوشگوار خواب کی طرح معلوم ہوتی تھیں تو دل بیٹھنے لگتا تھا۔ لیکن اب تو اُسکو موجودہ منحوس مکان کی فضا سے سابقہ تھا اور وہ صبر و تحمل سے اطاعت و فرماں برداری کی زندگی بسر کرتا تھا۔

صبح کے ناشتہ پر اُسکی ماں نے کہا۔ ڈریک کیا تم کچھ اور انتظار کر سکتے ہو؟ لڑکے کا رنگ متغیر ہو گیا اور اُسنے جواب دیا۔ افسوس کہ میں اب بالکل خالی ہو گیا۔ گزشتہ چیک نے میرا تمام روپیہ جو بنک میں جمع تھا ختم کر دیا۔

ماں نے کہا کیا تم اپنے والد سے مزید روپیہ نہیں طلب کر سکتے ۔؟

نہیں (اُس بات کو منقطع کرتے ہوئے جواب دیا۔)

ماں نے اپنے کندھوں کو سکیڑ کر کہا۔ لیکن روپیہ کی ضرورت سخت ہے اور اس کا انتظام کرنا ناگزیر ہے لڑکے نے اپنے ہونٹ کاٹے اور نہایت افسردہ ہو کر کمرہ کے چاروں طرف دیکھا اسکے دل میں اسوقت عجیب قسم کا کرب تھا۔

ماں نے کہا میرے خیال میں یہ مناسب ہے کہ تم شہر چلے جاؤ اور وہاں بنک کے منیجر یا کسی اور شخص سے ملکر روپیہ کا انتظام کرو۔

ماں کے اصرار سے مجبور ہو کر اس نے جواب دیا، بہتر ہے میں کچھ انتظام کروں گا تم اگر چاہو تو قرض بسہولت مل جائے گا۔

لڑکے نے سوچکر کہا۔ جی ہاں میں کچھ ایسا ہی کروں گا۔ اُس نے لڑکے کے غمگین اور متفکر چہرہ کو دیکھا وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور اُس کے پاس آئی۔ اُس کا ریشمین گون قالین پر گھسٹ رہا تھا۔ وہ اسکے قریب پہونچکر دوزانو ہو گئی اپنے ہاتھ اسکے گھٹنوں پر رکھ دیے اور التجا کے ساتھ کہا۔ ڈریک! تم میری خاطر یہ تمام مصیبت برداشت کر رہے ہو۔ اور میرا بار اٹھا رہے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ سوائے تمہارے میرا اور کوئی سہارا نہیں ہے۔ اور میں تمہیں پر بھروسہ کر رہی ہوں۔

محبت اور اطاعت کے جذبات نے ناتجربہ کار لڑکے کو مغلوب کر دیا۔ وہ اسکے ساتھ مثل ایک ساز کے کھیل رہی تھی جس کا ہر تار اُسکی اُنگلی کی حرکت پر آواز پیدا کر رہا ہو اور اسکے لئے اوسکو ذرا سی کوشش کی ضرورت تھی۔

بیشک بیشک میرا فرض ہے۔ اور میرے آنے کا یہی مقصد ہے کہ میں آپ کی امداد کروں میری تمام کلفتوں کا یہ ایک بدلہ ہے۔ اُس نے باریک آواز میں کہا۔ . . . .

اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی ریشمی گون کو گھسیٹتی ہوئی کمرہ سے نکلنے لگی۔ شب میں تم کہیں شہر میں ہی ٹھہر جانا کیونکہ رات کو واپس آنے میں تمہیں بھی تکلیف ہو گی۔ اور میں بھی آج رات کو جلد ہی سونا چاہتی ہوں

بہتر ہے، لڑکے نے جواب دیا۔

وہ رات کو شہر میں نہیں ٹھیرا بلکہ مکان پر واپس آگیا اُس نے اپنے کمرہ کو باہر سے بند کر دیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ میں بغیر کسی کو جگائے کمرہ کھول کر سو جاؤں گا۔

(۴)

مکان نہایت تیز روشنی سے جگمگا رہا تھا، اور اندر سے قہقہوں کی آوازیں مسلسل نکل رہی تھیں، وہ یہ منظر دیکھ کر دریائے حیرت میں غرق ہوگیا، وہ درمیان ہی میں مبہوت اور متحیر صورت بنائے کھڑا تھا، کھانے کے کمرہ کا دروازہ کچھ کھلا ہوا اور کچھ بند تھا، جس میں سے وہ اندر کے لوگوں کو دیکھ سکا۔ جو لوگ میز پر بیٹھے ہوئے تھے ان کو اس سے قبل بھی وہ اس مکان میں دیکھ چکا تھا اور یہ وہی لوگ تھے جنکو وہ بیحد نفرت کے ساتھ دیکھتا تھا، اسکی ماں میز کی صدر کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی، وہ شب کا ایک سنہری ریشمی لباس پہنے ہوئی تھی، اُسکے گلے میں ہیروں کا ایک ہار پڑا تھا، اس وقت وہ عجیب صورت میں تھی۔ اُسکے چہرہ کا رنگ سُرخ ہو رہا تھا اور اُسکے بال منتشر تھے۔ اُسکے لباس کے بند کندھوں پر سے ڈھیلے ہوئے تھے۔

موجودہ لوگوں میں سے ایک شخص نے ایک کریہ آواز میں کہا۔ آج کی پر لطف صحبت کیلئے ہم کس کے ممنون کرم ہیں۔ کئی دنوں کے بعد ایسا موقع ملا ہے۔ آہا! ہمارا بہادر نائٹ آج کہاں غائب ہے؟ اوسکی ماں نے ہنستے ہوئے کہا" وہ شہر سے باہر گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے۔ لیکن وہ کمبخت کب تک یہاں رہے گا اور ہمارے عیش کو منغص کرتا رہے گا ہم تو اُس سے تنگ آگئے۔ اور میں بھی کچھ کم نہیں، وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ کاش تم لوگ اُس رات کو مجھے دیکھتے جب وہ یہاں آیا ہے۔ مجھے اُسکے آنے کا تار مل گیا تھا، اور میں نے سیاہ گون تیار کر رکھا تھا، میں نے اُس سے کہا" میرے بیٹے میں نے کیسی مصیبت اُٹھائی کیسی تنہائی برداشت کی اور میں تجھے دیکھنے کے لئے کیسی تڑپتی تھی اور اُسنے مصنوعی جذبات ظاہر کرنے کی ایک شکل بنائی حاضرین ہنستے ہنستے لوٹ گئے اور وہ بھی اُنکے ساتھ ملکر قہقہہ لگا رہی تھی۔

اس اثناء میں ایک شخص مخمور ہو کر اپنی کرسی سے لڑکھڑا کر گرا، ایک دوسرا متوالا کرسی سے

کھڑا ہو کرناچنے لگا۔ اور اس کے گلے میں ایک تیسرے صاحب نے ۔ ۔ ۔

سعادتمند بیٹا اس حیا سوز منظر کو دیکھ رہا ہے اُس کا دل اتنے زور سے دھڑک رہا ہے کہ اُس کی آواز وہ اپنے کانوں سے سن رہا ہے اُسے محسوس ہو رہا ہے کہ اُس کا دم گھُٹ رہا ہے اُسکی آنکھیں اندھی ہو رہی ہیں۔

اچھا اب یہ بتاؤ کہ یہ لڑکا کب تک ٹھہرا رہے گا۔ ہم اُسکی قیام کو اب زیادہ برداشت نہیں کر سکتے۔

تم کیا میں خود تنگ ہوں اور اگر تم لوگ جاننا چاہتے ہو تو میں یہ ظاہر کرونگی کہ وہ عنقریب یہاں سے چلا جائے گا۔ اب تو میں نے اُسے روپیہ لینے کے لئے شہر بھیجا ہے میں چاہتی ہوں کہ اُسکے ذریعے سے اسکے باپ کی جیب خالی کرتی رہوں۔ اور پھر اُس نے بناوٹی آواز بنا کر کہا جسکو لڑکے نے باوجود اپنی بے خودی کے بھی محسوس کیا کہ وہ اسکی نقل کر رہی ہے۔

"میری ماں! میں تمہاری حفاظت اور اعانت کے لئے یہاں آیا ہوں"۔ ارباب محفل نے اس نقل پر خوب تالیاں بجائیں اور قہقہے اُڑائے، ایک شخص بولا تمہاری جان کی قسم وہ بڑا گدھا اور احمق ہے اور اسنے باریک آواز بنا کر اور اپنا سر اس کے زانو پر رکھ کر کہا۔

پیاری ماں! میں کس قدر احمق ہوں، میرا روپیہ سب تمہاری نذر ہے۔

اور قہقہوں سے تمام مکان گونج رہا تھا۔

یکایک اُن سب کی نظر دروازہ پر پڑی اور اُنہوں نے لڑکے کو پس وپیش میں کھڑے دیکھا، ماں اسکے دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی اور اُسکی طرف بڑھی، اُسکے لباس کا بند کندھے پر سے ڈھیلا ہو کر پھیل گیا تھا اور وہ لڑکھڑائی ہوئی مدہوش سی معلوم ہوتی تھی۔ تم چلے جاؤ۔ تم یہاں شہر سے کیوں واپس آ گئے ؟ میں نے ان شریف آدمیوں کو اپنا دل بہلانے کے لئے اتفاق سے آج مدعو کر لیا ہے۔ سیاہ لباس صرف آج ہی میں نے نہیں پہنا ہے، ہاں اور یہ تم نے کیا صورت بنائی ہے۔ تمہارے چہرہ پر مردنی کیوں چھائی ہوئی ہے۔ یہ کہکر وہ بیباکانہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

لڑکے نے میز کے گرد نظر ڈالی اور اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خباثت اور بے حیائی سے

تاریک صورتوں کے ایک دریا میں غرق ہو رہا ہے۔ ایک مجنونانہ اضطرار کے ساتھ وہ کمرہ سے نکل گیا اور بھاگا، اور عجلت کے ساتھ وہ اُس گھر اس محلہ بلکہ اُس ناپاک فضا سے گذر گیا۔ اُس نے اپنی کانوں میں انگلیاں لگالی تھیں تاکہ کوئی آواز اُسکے کان میں نہ پہونچ سکے۔

وہ سیدھا اپنے باپ کے گھر پہونچا اور اس وقت اسکی حالت ایک شیر کے بچہ کی طرح تھی جو زخمی ہو کر بھاگتا ہے اور اپنے غار میں جا گھستا ہے تاکہ اپنی مصیبت کو چھپائے۔ اُس کا باپ تو اپنے دریائی سفر کو چلا گیا تھا لیکن مکان اور ضروری سامان تو موجود ہے، یہ وہی مکان ہے جس میں اس نے سچی خوشی اور مسرت کے ساتھ اب تک زندگی بسر کی ہے وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنے کمرہ میں پہونچ گیا، کمرہ اسی حالت میں تھا۔ گولف کے ڈنڈے مچھلی کی بنسیاں، پولو اسٹکیں، اور بندوق کے بکس سب اُسی حالت میں منتشر پڑے ہوئے تھے، اور وہیں اُس کا باپ کھڑا ہوا ایک مچھلی کی بنسی کو درست کر رہا تھا۔

اُس نے پھر کر دیکھا۔ لڑکا کمرہ میں داخل ہو گیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو چند منٹ خاموشی سے دیکھتے رہے۔ لڑکے کی آنکھوں میں سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے اُس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور اسکے ہونٹ ایک دوسرے سے ملے ہوئے کانپ رہے تو اُس نے بڑی کوشش کے ساتھ کہا آپ سفر کو نہیں گئے؟ میں تمہارا منتظر تھا مجھے خیال تھا کہ تم جلد ہی واپس آجاؤ گے۔ یہ کہہ کر اُسنے بنسیوں کو رکھدیا اور ایک سگریٹ سلگانے لگا، لڑکے نے ٹھنڈی اور گہری سانس بھری گویا کہ وہ پانی کی عمیق گہرائی میں سے بڑی دیر کے بعد سطح پر اُچھلا ہے، اس نے چاروں طرف اور ہر چیز پر اپنی پاک نگاہیں ڈالیں اور اپنے باپ کو محبت اور احترام کے ساتھ دیکھا۔ وہ شب خوابی کے سادہ اور ڈھیلے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اسکے باریک اور خوشنما ہونٹوں میں پائپ دبا ہوا تھا، اور یہ سب حالت ایک صاف ستھری متجرد زندگی کو ظاہر کر رہی تھی۔

لڑکے کے کانپتے ہوئے ہاتھ پُرسکون ہو گئے اُسکی آنکھوں کی وحشت اور پریشانی جاتی رہی باپ نے سگریٹ کا دھواں اُڑاتے ہوئے کہا میرا گمان ہے کہ اُس نے تم کو بالکل خالی کر کے واپس کر دیا۔ لڑکے نے خفیف مُسکراہٹ کا اظہار کیا اور باپ نے بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ

بے پروائی سے پھر کہا کہ غالباً میرا گمان صحیح ہے، کمرہ میں پھر سکوت طاری ہوگیا، لڑکے نے پھر کمرہ میں نظر دوڑائی اور محسوس کیا کہ یہی زندگی ہیں ہے، وہ آراستہ وپیراستہ مکان اور چمکدار فرنیچر ایک نہایت فرحت ناک خواب تھا، اوسکو اب دماغ سے محو ہوجانا چاہیئے۔ اُس کا باپ ہی صرف اسکی امیدوں اور مسرتوں کا مرکز ہے۔

دفعتاً اُس نے رُخ بدلا اور لڑکے کی طرف ایک سگریٹ پھینک کر کہا۔ لو شکریہ۔ لڑکے نے سگریٹ جلایا۔

تم نے کھانا کھایا، غالباً ابھی نہیں، تو آؤ نیچے چلیں اور کھانا کھائیں۔

دریائی سفر اور شکار کے متعلق آپ کا کیا ارادہ ہے، میں تمہارے لئے بنسیوں کو درست کررہا ہوں۔ شکریہ، لڑکے کی وحشت اب ختم ہوگئی تھی وہ خوش تھا اور اُسے حقیقی راحت نصیب تھی٭

محمود صدیقی (علیگ)

تجلیات سہا

محبت ہے تو پھر اُسکی ستمگاری کا ڈر کیوں ہو　　مرے لب پر معاذ اللہ کیوں ہو الحذر کیوں ہو

محبت ہو۔ وفا کا پاس ہو۔ خود تم کو الفت ہو　　جو تم چاہو تو کیا کچھ ہو نہیں سکتا۔ مگر کیوں ہو

مگر جاپہنچا جانے سے کہ غیرت رہے باقی　　خدارا یہ نہ کہہ ظالم کہ وہ دشمن کا گھر کیوں ہو

تری افزائش حسن و ادا کا یوں تو کیا کہنا٭　　مگر دنیا کو جو برباد کردے اسقدر کیوں ہو

سہا! اس درجہ مایوسی اور ایسی کثرتِ ارماں
قفس میں جینے والوں کو ہوائے بال و پر کیوں ہو

سہا

٭ ایسے اشعار پر اردو شاعری جسقدر ناز کرے بجا ہے ۱۱

بور

دسمبر ۳۴ء

مولوی سلطان حیدر صاحب جوش کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے موصوف کا زورِ قلم خراجِ تحسین حاصل کر رہا ہے۔ مندرجہ ذیل مضمون ناظرین محسن الملک کی دلچسپی کے لئے موصوف نے ہمکو عطا فرمایا ہے جو نہایت شکریہ کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔

ایڈیٹر

"بور" کے لئے اردو کے محدود ذخیرہ میں کوئی مناسب اور پوری طور پر مترادف لفظ نہ مل سکنا ہی ایک حد تک اس عجیب الخلقت ذات کو کمیاب شے بناتا ہے، لیکن یہ محض کمیاب ہی نہیں، تمام صفات کے لحاظ سے ایک بے مثل معجون مرکب ہے۔

محققین علم الحیوانات اس مسئلہ پر متفق الرائے ہیں کہ گدھے کی اولاد میں خواہ وہ خرِ عیسیٰ کی ذریات میں سے ہو یا خرِ دجال کی مورثین میں سے۔ ہمیشہ گدھا ہی پیدا ہوگا، اور کُتّے کی نسل میں۔ عام اس سے کہ وہ سگِ اصحابِ کہف کی باقیات الصالحات میں سے ہو یا کسی یوروپین حسین کے مشاغل تفریح میں سے۔ ہمیشہ کُتّا ہی وجود میں آئے گا، لیکن اسی کلیہ کی بنا پر "بور" کی اولاد ہمیشہ "بور" نہیں ہو سکتی۔

"بور" ہر قوم و ملک اور ہر آب و ہوا میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے اور اپنی مخصوص صفات کے لحاظ سے ہر سرزمین میں وہی بے نظیر و بے مثال شخصیت نظر آتا ہے! کبھی وہ ٹوٹی کورن سے کیمن چیکا تک سفر کرنے پر بھی ہاتھ نہیں آتا اور کبھی گھر بیٹھے بلا کسی کوشش و جستجو کے آئے دن دستیاب ہوتا رہتا ہے! یوں تو معلم الملکوت کی نسبت بھی مانا جاتا ہے کہ "تصور کیجئے اور وہ معاً بنفسِ نفیس آموجود ہوئے" مگر بور کی ذات والا صفات نزولِ اجلال کے لحاظ سے شرمندۂ تصور بھی نہیں ہوتی: آپ "بور" کا تصور کریں یا نہ کریں بسا اوقات اس کا نازل ہونا قیامت کی طرح برحق و ناگزیر ہوگا! آپ اکل و شرب میں کافی احتیاط برتنے سے ہیضہ سے محفوظ رہ سکتے ہیں، آپ کونین کے باقاعدہ استعمال سے موسمی بخار سے بچ سکتے ہیں، مگر یقین مانئے، "بور" کے تہیہ کر لینے کے بعد آپ اس کے نازل ہونے کو کسی امکانی کوشش سے نہیں روک سکتے؛ گویا "بور" کا تہیہ نزول اکثر و بیشتر تقدیرِ مبرم قرار پاتا ہے۔

"بور" کالے سے لیکر گورے تک ہر ہلکے اور گہرے رنگ کا ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے، گرم خشک سے لیکر سرد و تر تک ہر قسم کی آب و ہوا میں رہتا ہے اور رہ سکتا ہے، اور ایلورا کی غاروں سے

لیکر ہمالیہ کی سر بفلک کشیدہ چوٹیوں تک ہر نشیب فراز میں جنم لیتا ہے اور لے سکتا ہے! ملبوسات کے لحاظ سے وہ نہایت جامہ زیب ہستی ہے۔ دہوتی ہو یا پائجامہ، برجز ہو یا پتلون، ہر لباس اُس کے جسم پر یکساں رنگ پیدا کرتا ہے!

جسمانی ساخت یا وضع لباس "بور" کی وجہ امتیاز نہیں، بلکہ دماغی ترتیب یا کھوپڑی کے اندرونی پُرزوں کی بناوٹ ہی وہ چیز ہے جو "بور" کو اشرف المخلوقات کے خطاب کا جائز مستحق قرار دیتی ہے۔

"بور" کی صفات کا صحیح صحیح تجزیہ کرنا اسیقدر محال ہے جسقدر کہ اُس کی شان نزول معلوم کرنا تاہم مستند محققین مردم شناس اس قدر تسلیم کرتے ہیں کہ خود رائی ہمہ دانی، معلومات عامہ اور دخل در معقولات کی صفات "بور" میں ضرور پائی جاتی ہیں! ان کے علاوہ قوت گویائی بھی روز اول سے "بور" کو بقیہ افراد انسانی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ملی ہے! اسکی معلومات دائرہ کے دماغی طول عرض میں باآسانی سما سکنے سے بہت زائد ہے اور اسیوجہ سے قوت گویائی کی بدولت اسکو اکثر اظہار معلومات کا استفراغ ہوتا رہتا ہے۔ یہ چند چھوٹی سی صفات ہیں جو ہر طبقہ کے "بور" میں لازمی ہوتی ہیں ورنہ اکثر عادات وخصائل ماحول کے زیر اثر ہر طبقہ میں جداگانہ صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

بور کی تمام اقسام کو بتفصیل قلمبند کرنا ایک ایسا عظیم الشان کام ہے جس کے انجام کے لئے معقول زمانہ، وافر ذخیرہ مشاہدات ——— اور غیر معمولی یکسوئی دماغ درکار ہے! ناظرین کو بور کے خدوخال اور حرکات وسکنات سے اور زیادہ واقف کرنے کی غرض سے چند طبقات کے بور کا محض خاکہ بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کیا جاتا ہے۔

سوشیل بور۔ معاشرتی بور

واقعات حاضرہ کا مکمل علم سوشیل بور کی مخصوص صفات کا نمایاں جزو سمجھنا چاہئے، ہر حلقہ احباب میں بلا لحاظ عمر و مذاق، داخل ہونا جلد سے جلد بے تکلف ہو جانے کے میلان طبع کے ساتھ داخل ہونا۔ اس کی عادت کا حصہ غالب مانا جاتا ہے! ایک صحبت بے تکلف کے لئے اُس کا

نزول اور نزول کے ساتھ خاطر خواہ قیام وہی معنی رکھتا ہے جو ژالہ باری لہلہاتے ہوئے کھیت کے لئے۔
یا طاعون خوش و خرم آبادی کے لئے! صحبت ارتباط بنیاد کا ایک اک فرد اُسکی بھاری بھر کم شخصیت کو
اپنے لئے ناقابل برداشت سمجھے، سامنے نظر آنے والی صورتوں کے چشم و ابرو سے کشیدگی کا اظہار
اور بعض ذکی الحس حضرات اپنے سکون دماغی میں ہیجان برہمی محسوس کرنے لگیں لیکن سوشیل بور اُس صحبت میں
داخل ہوگا، ہر گفتگو میں بلا لحاظ خطاب۔ اپنی معلومات موجودہ کے دریا بہائے گا اور اُس وقت تک شریک
رہیگا جب تک کہ اُس صحبت بے تکلف کے تمام اجزائے ترکیبی منتشر نہ ہو جائیں یا کم از کم وہ مجلس خموشاں
نہ بن جائے!! تعلی و مبالغہ سوشیل بور کی فطرت ثانیہ ثابت ہوتی ہیں اس لحاظ سے اسکے اکثر جملے
قصائد عرفی و بدر چاچ کا اردو ترجمہ سمجھے جا سکتے ہیں سچ وہ ضرور بولتا ہے مگر سچ کی قدر و قیمت گھٹانا نہیں
چاہتا یعنی اوسکا سچ بولنا خاص خاص ضرورتوں کے علاوہ، مخاطب کی استعداد و حیثیت پر
بھی مبنی ہے۔ وہ آئے دن ضرورت و بلا ضرورت سچ بولنے سے سچائی کی سرد بازاری نہیں کرنا چاہتا
ایمانداری کی دقیانوسی اور پامال خوبی بھی شاید اسکی ساخت میں کہیں جگہ پوشیدہ ہو مگر بفضلہ اسقدر
کم ہے کہ تہذیب جدید اُسکو عقلمند اور ہونہار اصحاب کی فہرست سے خارج نہیں کر سکتی۔

پولیٹکل بور سیاسی بور

اگرچہ اسکی پیدائش کے آثار جنگ یورپ کے آغاز کے ساتھ کہیں کہیں نظر آنے لگے تھے
مگر پھر بھی دو ایک سال تک اُس کی شخصیت نمایاں نہ ہو سکی! جنگ یورپ کے آخری دور میں
وہ پردۂ عدم سے سرکتا معلوم ہوتا ہے! کچھ عرصہ تک قیصر جرمنی کی نقل و حرکت کے متعلق اپنی
براہ راست معلومات سے ہندوستان کی بے خبر آبادی کو آگاہ کرنا اس کا شیوہ رہا ہے اُسکی ذاتی رائے
آئن ہلش اور جنرل جافرے کے بیانات اور تدابیر کو ناقابل اعتبار اور کھوکھلا ثابت کرنے میں ہندوستان
کے بازاروں اور قصبوں میں ہمیشہ پتھر کی لکیر کی وقعت رکھتی تھی! رولٹ ایکٹ کے نفاذ کا زمانہ
اُسکی کیچلی اتارنے کا زمانہ قریب ایک ہی نظر آتا ہے! اسکے بعد سے پولیٹکل بور کی شان آسمانی

بور

ارفع اور اسکی تعداد حشرات الارض سے زیادہ ہوگئی! اصول عدم تعاون کے زیر سایہ اُس نے
اپنے غرض خواہوں کو صاف جواب دیدیا اور دعویٰ دائر ہونے پر اُسکے شہر کی تمام آبادی اُسکے لئے سینہ سپر
تھی۔ اسکو سیاسیات کی معلومات، ایشور کی کرپا سے کسی انگریزی یا اردو کتاب کی ممنون منت نہ تھی
بظاہر اس کا علم سینہ ایک الہامی چیز معلوم ہوتا تھا! اُس کا جسم از سرتاپا کھدر کا ایڈورٹیزمنٹ بن گیا
اور وہ اس شان کے ساتھ ایک ایک قصبہ اور گاؤں میں تاریخ مقررہ کی پابندی کے ساتھ دورہ
کرنے لگا! سیاسیات کے صحیح ماہر اس پولیٹکل بور کو کچھ سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں اُسکی ذات ایک نہیں متعدد اضلاع
میں پبلک جلسوں کی روح اور دیہاتی جہلاء سے چندہ جمع کرنے کی کامیاب مشین سمجھی جاتی تھی! اُس کا
چلنا پھرنا، سونا جاگنا، اور تمام حوائج ضروری ادا کرنا قطعی سیاسی نقل وحرکت بن گئے! وہ بولنا اور
تقریر کرنا تو درکنار، کوئی مہمل آواز بھی نکالتا تو سیاسی سُر میں! فحش بیانی وزباں درازی اُسکی
چوٹی کے صفات قرار پائیں اور اس سے مخالفت کرنا مارشل لا کے تحت میں آجانے کے برابر ٹھیر
اس تزک و احتشام کے ساتھ کچھ مدت جیل میں بند ہونے والی مخلوق کو اپنی انعکاس معلومات سے
منور کرنے کا طغرائے امتیاز اسے حاصل ہوا۔ اس انتہائی ڈگری کے حصول نے اُسکی ذات کو
سیاسیات کے لئے جزو لاینفک بنا دیا۔ اُس کے محلہ والے اُس سے مرعوب ہوگئے اور بازار والے
اُس کے معمولی اعلان پر دوکانیں بند کرنے لگے! چندہ کی رقومات کا حساب یا اُسکی آمدنی کے
ذرائع اُسکے ہمعصر پیشہ ور اصحاب کی زد سے ہمیشہ محفوظ رہے، وہ کہیں دیش باندھو رہا اور کہیں
خادم قوم بہر حال ہندوستان سے انگورہ تک، یا سوراج سے خلافت تک پولیٹکل بور اپنی نظیر
آپ ہی تھا، اسکی ہستی مہاتما گاندھی کے حلقہ اعتقاد میں سمجھنے والے کے لئے باعث مرگ شادی
اور نا فہم کے لئے "بدنام کنندۂ نکو نامے چند" کی مرادف رہی۔ لیکن ہوا کا رخ بدلتے ہی "پولیٹکل بور"
نے ہندو مسلم اتحاد کو تار عنکبوت کی طرح توڑ ڈالا، اور وہ نہایت پاٹ دار آواز میں شدھی کا راگ
سوامی شردھانند کے رنگ میں، الاپنے لگا! اب وہ اذان و ناقوس کے مقابلہ پر آستین چڑھائے

نظر آتا ہے اور امن پسندی اُسکی نظر میں بزدلی ہے اور وہ اپنی لمبی لاٹھی کے استعمال کو بھینس کے حصول کا طریقہ جائز سمجھتا ہے۔ پولیس کا دفتر بے معنی اُسکے سیاسی جنم سے پیشتر کے واقعات سے بھی یہی ثابت کرتا ہے کہ وہ دلیر ذات تعزیرات ہند وضابطۂ فوجداری کے جائز عمل سے بھی کبھی خائف نہیں رہی! اس پر سیاسی شان گویا کریلا اور نیم چڑھا! اب آپ اسکی منت وسماجت کریں، بڑے بڑے جلسوں میں اس کی تضحیک کی جائے اور عود مہاتماجی فاقہ کرنے پر مجبور ہو جائیں مگر وہ ہندو مسلم نفاق کو اپنا ذریعۂ شہرت وآمدنی مانتا ہے، مانتا رہیگا اور اس وقت تک مانتا رہیگا جب تک "چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند" کے تحت میں زمانہ کوئی اور کروٹ نہ بدل لے! جو کچھ بھی ہو، وہ پہلے دلیش باندھو تھا تو اب دھرم سیوک ہے!

لٹریری بور۔ علمی بور

فطرتاً بور کی خصوصیات رکھنے والی ہستی پر علمی غلاف خوش قسمتی یا محض اتفاق سے چڑھ جانے سے لٹریری یا علمی بور وجود میں آتا ہے! تحریر و تقریر گفت و شنید، یک لخت اظہار تبحر علمی کے سانچہ میں ڈھل جاتی ہیں! کسی صحبت میں اسکی موجودگی یا کسی معمولی مسئلہ پر اسکی قلم فرسائی، بجائے خود جرمن ہاؤٹزر کا مرتبہ رکھتی ہے، وہ خواہی نخواہی، آئے دن اپنی اظہارِ قابلیت سے ناظرین و سامعین کو مرعوب کرتا رہتا ہے!

جذبات معمولی سے لیکر نفسیات کے مسائل تک اسکی شان ہمہ دانی و خود بینی مختلف صورتوں میں جلوہ فگن نظر آتی ہے! اسکے مطالعہ علمی کے متعلق مختلف روایات زباں زد خلائق سہی مگر اس میں شک نہیں کہ اپنی علامہ شخصیت کا یقین اُسکو خود غلط فہمی کی حد تک ہوتا ہے! شہرت عام اسکی زندگی کا تنہا مقصد علمی نظر آتا ہے اور اس مقصد کے لئے اس کا وجود ارتقاء کے منازل زمانہ کی ہوا کے رُخ کے ساتھ طے کرتا ہے۔ فرض کیجئے وہ بچپن میں محض والدین کے خوف سے ایک حد تک پابند صوم وصلوۃ ہو تو آگے چل کر یہ پابندی آزادی سے بدلتی جائے گی: وہ مڈل میں گنڈے دار نماز

پڑھے گا۔ انٹرنس میں اسکو بھی ترک کرے گا، اور کالج میں پونچتے ہی پابندی مذہب اُسکیلئے
سب سے بڑی حماقت قرار پاے گی! اگر خدانخواستہ اُس نے ڈگری بے لی تو یقین مانئے کہ علمی
دائروں میں زلزلہ آگیا اور کسی بڑے سے بڑے علامہ کی دستار فضیلت معرض خطر میں آگئی! علمی بد
پرکلے اور ہل، اور اسپنسر اور جیمز کے خیالات جو اُس نے لغات و فرہنگ کی امداد سے اپنی مدورکھوپری
میں اُتارے تھے، اجزاے غیر منہضمہ کی صورت میں ایک اک کرکے اُگلے گا۔ اور ایسی شان مجادلہ
کے ساتھ اُگلے گا کہ اکثر و بیشتر علم دوست اصحاب ان موشگافیوں کو اسکی ذاتی جدت سمجھنے کی مغالطہ میں
پڑجائیں گے۔ فنون لطیفہ سے اُس کو محض اس وجہ سے نفرت ہونی لازمی ہو کہ ان کا دارومدار بہت کچھ
گرد کی سمجھ بوجھ اور ذاتی ذکاوت و جدت پر ہے، اور یہاں پرکلے کی گاڑی کا گھوڑا یا جمنر کی
سواری کا ٹٹو بہنے سے پیش نہیں چل سکتی، اس ٹھاٹھ کے ساتھ وہ کبھی مولوی نذیر احمد کے ترجمہ قرآن کی
غلطیاں نکالیگا، کبھی علامہ شبلی کے مذہبی تصانیف کی دھجیاں اُڑائیگا اس کا مستقل رویہ "
سستے نام آور سے جا بھڑنا ذریعہ اپنی شہرت کا" رہیگا۔! امن کے زمانہ میں الٰہیات کا مدمقابل بننا
اور جنگ کے زمانہ میں رفتہ رفتہ مذہبی عبا زیب تن فرما کر روشن خیالی کے استیصال پر کمر باندھ لینا اکثر
و بیشتر اس کا معیار قرار پاے گا، لیکن ان نت نئی کیچلیاں بدلنے پر بھی اُس کا انداز قدامت اس سے
کہ برکلے کا لباس اس کا تن پوش ہو یا فخر رازی کا۔ طلب شہرت و نام کا ہمیشہ پتا دیتا رہے گا
اعتکاف کا رنگ لینے کے ساتھ شان تبحر میں تقدس و استغنا کی آن بان کا اضافہ ہو جائیگا
اور اُسکے معتقدین و مداحین کا گروہ دن دونا رات چوگنا بڑھنا شروع ہوگا! اب اُس کے خطبات
مذہبی نیم تعلیم یافتہ دنیا کو محو حیرت کرینگے! دور آخری کی ضروریات ظاہری کی تکمیل چہرے پر
پرورش پانے والے خس و خاشاک سے، ٹخنوں سے اونچی ازار سے، اور خشونت آمیز چال ڈھال سے
کی جاے گی! عیب جوئی اس کا مسلک اصلاح اور درشت نگاری اُس کا انداز تحریر قرار پائینگے
وہ سب کچھ کہہ سکیگا مگر اپنے متعلق ایک حرف نہ سُن سکے گا! وہ دوسروں کی لغزشوں کو معاف

دسمبر ۱۹۶۲ء

بور

نہ کرے گا مگر چوبیس گھنٹوں میں سے چند منٹ کے لئے بھی اپنے خد و خال کسی آئینہ میں خود نہ دیکھ سکیگا! اس کر و فر کے ساتھ وہ ہر علمی و ادبی صحبت پر چھا جائے گا اور محض تحفظ آبرو کے خاطر بے شمار علم دوست ہستیاں اُسکے لئے جگہ خالی کر دیں گی، بولنا اور لکھنا علمی بور کے زمانہ عروج میں صرف راہِ نجات اور ما الا بُد ہونے کے رنگ میں ممکن ہوگا۔ مختصراً، وہ برکلے اور جیمز کا خوشہ چین ہو یا فخر رازی و امام غزالی کا وہ یزید بنے یا بایزید سمجھنے والے اُسے وہی پُرانا علمی بور سمجھتے رہیں گے۔

بورِ اعظم

وہ عنقا شخصیت جس میں مختلف اقسام کی صفات اصول کیمیاوی کی بنا پر ترتیب دی گئی ہوں۔ یا کم از کم مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والی صفاتِ بور کا حسب حاجت معطر آمیز کیا گیا ہو! یہ سہیم شحیم ذات خوش پوشاک ہو یا نہ ہو خوش خوراک ضرور ہو اور اس کا اچھا خاصہ مدور اور کسیقدر نمایاں پیٹ طبور سے چوپایہ تک، انواع و اقسام کے جانوروں کا مذبح بلکہ سرے بنجائے یا اسکی زبان راجز کی قینچی، اُس کا جسم الغرض خواہ مخواہ مرد آدمی! وہ قانونی مشورہ کے لئے تمام قوانین رائج الوقت کا مجموعہ، وہ علمی ادبی استعداد کے لئے زندہ انسائکلوپیڈیا! اُسکی موجودگی میں سامعین کو اُسکے ذاتی اور گوناگوں تجربات کی داستان کے سوائے اور کسی بات کے سننے کی مہلت نہیں مل سکتی! اسکی واقفیت گورنر صاحب کی نقل و حرکت سے ایک ادنیٰ چپراسی کی معزولی تک، تمام واقعات سے ہر وقت لبریز رہتی ہے، اسکے کارناموں کی کہانیاں غالباً جذر لگائے جانے پر سچ کا کچھ جزو پیش کر سکتی ہیں۔ وہ بلا اطلاع نازل ہوتا ہے اور ہندوستان کے قحط کی طرح جلد جلد نازل ہوتا ہے۔ فی الحقیقت بور کی مختلف اقسام ایک مختلف تالیف کی صورت میں پیش کئی جانے کے قابل ہیں! مذکورہ بالا مثالیں محض خاکے کے طور پر ناظرین کے سامنے رکھی جاتی ہیں اور ساتھ ہی یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ کہیں یہ کاغذی ٹوپی کسی سر پر ٹھیک نہ آ جائے! ٹھیک آنے کے آثار اور پہننے والے کے چشم و ابرو سے بآسانی ہویدا ہو جائیں گے! اظہار برہمی و شانِ عتاب ان آثار کا جزو غالب ہوگا!!

سلطان حمید بوش

فرمودۂ جلیل

از نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل القدر حضرت جلیل اوستاد حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہٗ

جلیل القدر حضرت جلیل کا شمار اسوقت اُن اساتذہ میں ہے جنکو نہ صرف ہندوستان کے شعرا نے بلکہ ہر اُس شخص نے جسے شاعری سے کچھ بھی ذوق ہے استاد مان لیا ہے، موصوف کو قدرت نے ایک خاص ذوق عطا فرمایا ہے اور اس ذوق کے ساتھہ ساتھہ یہ اعتبار کمالِ فن بھی ذاتِ گرامی جامع ہے، ہم نہایت شکرگزار ہیں کہ ہماری استدعا پر موصوف نے مندرجہ ذیل غزل ارسال فرمائی اور آیندہ کے لئے بھی متوقع فرمایا ہے"۔

ایڈیٹر

مزہ ہو تو جو چلے کاٹ کر گلو میرا — اُچھل کے تھام لے دامن ترا لہو میرا

ٹپک گیا ہی جو آنسو تو آنکھ روتی ہے — کہاں گیا وُہ دُرِ بحرِ آبرو میرا

صبا یہ رندوں سے کہنا کہ چھوڑکر مجکو — لگائے مُنہ سے جو ساغر پئے لہو میرا

چمن کی سیر کو کہئے تو عذر کرتے ہیں — کہ گُل ہیں چور اڑالیں گے رنگ و بو میرا

وہی اثر ہے جو اُگتے ہیں روز گُل بوٹے — بہا تھا خاک چمن پر کبھی لہو میرا

میں لڑکھڑا کے سر بزم مے گرا ہوتا — جو ہاتھ تھام نہ لیتے خُم و سُبو میرا

عروس تیغ سے کہدو کہ میان سے نکلے — کھلا ہے دیر سے آغوشِ آرزو میرا

پس فنا بھی ہو اس پردے میں تلاش تری — صبا غبار اُڑاتی ہے کو بکو میرا

چلا تھا لغزشِ میں سوی حرم خجالت سے — عرق عرق جو ہوا ہو گیا وضو میرا

فلک سے خون کسی بیگنہ کا کیا چھپتا — شفق کے بھیس میں ظاہر ہوا لہو میرا

جلیل شوق شہادت ہے اس تمنا میں
کہ زیبِ دامنِ قاتل رہے لہو میرا

جلیل

اتفاق کی ضرورت

مو الیدثلاثہ کا ایک ایک ذرّہ اجتماع اور ارتباط کے سلسلہ میں جکڑا ہوا ہے ایک عظیم الشان کُرہ ایتھروں کی باہمی اتصال و اتفاق کا رہین منت ہے۔

چٹان اسلئے سنگلاخ ہے کہ اس میں صدہا ذرات کی پیوستگی ہے، درخت کی نُزہت اور شادابی اس لئے ہے کہ اُسکے زیریں تنہ کے ریشے انجذاب امیں متفقانہ مصروف کار ہیں حیوانات کا وجود حیات اُس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک عناصر میں امتزاج اور اتفاق ہے علم الاعداد پر نظر ڈالو، جمع کا قاعدہ نسبت اعدادی کو بڑھاتا، اور تفریق گھٹاتا ہے، علم الاصوات کا مفہوم ربط و ترتیب جملوں پر منحصر ہے۔ مجموعۂ تالیفات و تصنیفات پر غور کرو، اگر حرفوں میں انتشار اور جملوں میں افتراق ہو تو سرمایۂ معلومات انسانی کا خزانہ تہی ہو جائے۔

چند گیسوں کا اجتماع پانی جیسی ممد حیات چیز کا وجود قائم کرتا ہے، روشنی و ہوا غرضکہ کُل مظاہرِ عالم ایک ایک چیز پر غور کرتے جاؤ، اُسکی ہیئت نوعی میں وہی عالمگیر قانون ملتا جائے گا۔

کیا یہ مشاہدات اس طرف ایما نہیں کرتے کہ جس طرح ہر شے اپنی اپنی ہیئت نوعی کے بقاؤ صیانت میں اتفاق اور ارتباط میں مصروف کار ہے، اسی طرح تمدن اور معاشرت کا سطح ہموار نہیں رہ سکتا، اگر افراد کے نصب العین میں اتحادِ عمل کے عناصر موجود نہ ہوں گے۔

ہر وہ قوم آگے بڑھتی ہے جس نے قدرت کے ان مشاہدات سے بصیرت لی ہے۔ اور اپنے نظام قومیت میں اتفاق و یک جہتی کو دخل کیا ہے۔

جب کسی قوم کا سطوت و جبروت تم کو نظر آئے تو یقین کر لو کہ وہ اتحادِ عمل یک جہتی کی راہ پر گام زن ہے اور جس قوم میں فلاکت اور تنزل کے آثار ملیں تو سمجھ لو کہ وہ انتشار عمل کو وہ لازمی نتائج ہیں۔

قدیم قوموں کے عروج و زوال میں اسی کے آثار ملتے ہیں، یونانی، اشوری، کلدانی، قومیں جب ابھریں ان کے اعمال میں اتفاق وارتباط کا عنصر شامل رہا۔

ایک شخص کھڑا ہوتا ہے، چند افراد اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور ایک منصوبہ فتح پر متفق ہو کر کسی حکمران قوم پر (جب کہ اس حکومت میں انتشار عمل اور اختلافات کے جراثیم نمودار ہو جاتے ہیں) حملہ کر دیا جاتا ہے اور وقار حکومت کی باگیں اسکے ہاتھوں میں آجاتی ہیں۔

تم کو معلوم ہے کہ صحرائے عرب کی اُس مقدس ہستی نے جس نے کہ وعتصموا بحبل اللہ جمیعاً کی موعظت سے اہل عرب کی قوت سامعہ کو متاثر کیا تھا کیا کیا؟ قوم جو توہمات اور باہمی مخالفت میں مبتلا تھی جو جنگ و جدال اور آپس کی منافست سے تباہ ہو رہی تھی اُسکی رگوں میں یکانگت اور اتحاد کا خون دوڑا دیا اور اتفاق وہمدردی کی روح پیدا کر دی، انکو قومیت کے مرکز پر جمع کیا گیا حتیٰ کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اُٹھی اور سیلاب کیطرح بڑھی اور ایک عالم کو گھیر لیا، اُس نے تھوڑے سے ہی دنوں میں قیصر و کسریٰ کے تخت اُلٹ دیئے، مصر و ایران کے ایوان حکمت ہلا ڈالے اور روم کے پرشکوہ اقتدار پر ضرب لگائی۔ اُس کے گھوڑوں نے سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے جزائر میں جاکر دم لیا اور قوم کی متفقہ جد و جہد نے وہاں بھی فتوحات کے پرچم نصب کر دیئے۔ اسی لائحہ عمل کے نتائج تھے کہ عقبہ افریقہ کو فتح کرتا ہے موسیٰ اور طارق اندلس میں حکومت کی بنیادیں قائم کرتے ہیں۔ قاسم سندھ تک سیلاب کیطرح بڑھتا ہے اور بہادران اسلام یورپ کے وسط مقامات تک گھستے ہوئے چلے جاتے ہیں اور سینکڑوں امصار و دیار فتح کر لیتے ہیں۔

لیکن وہی قوم جس کا شاندار تمدن دنیا کو حیرت میں ڈالتا تھا، جسکے اتفاق اور قومی عصبیت نے عالم کے دلوں میں وقار و شوکت کے نقوش مرتسم کر دیے تھے افسوس ہے کہ وہ آج کس مپرسی کی حالت میں ہے۔

جب سے قومی عصبیت ہم سے رخصت ہوئی اور انتشار وافتراق نے ہمارے تخیلات کو

متاثر کیا اُس وقت سے ہماری حالت تباہ و برباد ہوتی چلی جارہی ہے۔

غرناطہ و بیت حمرہ کے کھنڈرات کی نوحہ خوانی اگر تم نہیں سُن سکتے، اگر ہندوستان کی صد سالہ روایات تم بھول گئے ہو، اگر طرابلس، ٹونس اور دیگر بلاد اسلامیہ کی شوکت و عروج کے آثار تم کو نظر نہیں آتے تو جانے دو، لیکن عدم احساس و نااتفاقی کے ہولناک نتائج کا زمانہ حاضرہ میں مشاہدہ کر لو جس نے تمہارے وقار ملی پر ضرب لگائی ہے۔

بغداد کے دجلوں کی اُن مضطرب اور سراسیمہ موجوں سے پوچھو جہاں کبھی تخت ہارون الرشید کے اوج حکمت و جاہ و جلال کا علم لہراتا تھا، مصر میں عمرو بن العاص کی روح کو دیکھو جہاں کہ اُن حوادث کا حال بیان کر رہی ہے جب کہ انھوں نے اپنے سینکڑوں جانباز رفقاء کے ساتھ مصر پر قبضہ حاصل کیا تھا۔ شام و دمشق میں جاؤ ابوعبیدہ بن جراح اور خالدؓ کے حیرت انگیز کارناموں کو دیکھو، عام سر جیل اور ہزاروں صحابہ و تابعین کی لاشوں کے شیون سنو، جو کہہ رہے ہیں کہ ہم نے یہ ممالک کس طرح فتح کئے تھے، کون نہیں جانتا کہ ایک ایک چپہ ہمارے مقدس اسلاف کے خون سے رنگا ہوا ہے اور ہزارہا مقدس اور برگزیدہ ہستیاں زیر خاک مدفون ہیں، یہ قیامت خیز نتائج کیوں ہوئے؟

دوستو! یہ نتائج ہماری بے حسی اور انتشار و افتراق کے ہیں۔ ایک وہ وقت تھا جب مہاجرین مدینہ پہونچتے ہیں تو انصار کا ایثار اپنی تمام جائداد کی تنصیف کر کے اپنے مفلوک بھائی کی امداد کرتا ہے،

ایک وہ وقت تھا کہ امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی باہمی جنگ و جدال سے شاہ قسطنطنیہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اور امیر معاویہ اُسکو آگاہ کرتے ہیں کہ ہماری مخالفت تم کو فائدہ نہیں پہونچا سکتی۔ میں وہ شخص ہونگا کہ جو حضرت علیؓ کی طرف سے اپنے باہمی جھگڑے چھوڑ کر تمہاری سرکوبی اُٹھوں گا اور آج یہ وقت ہے کہ ہمارے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہیں اور ہمارے جسد قومی کو

احساس نہیں ہوتا

تم کو معلوم ہے کہ اگر ایشیا کو چک سے ایک ہستی نہ اٹھتی جس میں آنور کی شجاعت طلعت کا تدبّر، اور جمال کی تنظیم فوجی کے اوصاف تھے اور اگر اپنا بھولا ہوا سبق اتفاق دارتباط اور قومی عصبیت کو یاد نہ کر لیتی تو آج مرکز حکومت اسلامی کا کیا حال ہوتا۔

آج یہاں کوچہ و برزن سے غلغلہ انداز صدائیں اٹھ رہی ہیں کہ ہندو مسلم اتفاق کی ضرورت ہے، کوئی ممکن، اور کوئی ناممکن بتاتا ہے۔

حقیقت میں برکات اتفاق سے ہمیں انکار نہیں، لیکن اس سے زیادہ ہمیں جسکی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہماری قوم کا ایک ایک فرد نا اتفاقی باہمی کے نتائج سے آگاہ ہو اور اسلامی کوئی حکومت کوئی خاندان، کوئی گھر ایسا نہ ہو جس میں قومی یگانگت و اتحاد کا نظارہ نہ دیکھا جائے۔ اگر سائبیریا میں کوئی ہمارا بھائی کسی غیر قوم کے بیجا اقتدار سے مجروح ہو تو ہمارے سینے شق ہو جائیں، اگر چین میں ہمارے افراد مبتلائے اذیت ہوں تو ہماری آنکھیں خونبار ہو جائیں، اگر مقامات اسلامیہ پر کسی بد باطن کی نظریں اٹھیں تو ہمارے قدموں میں حرکت انتقامی پیدا ہو جائے۔

مقدم اسکی ضرورت ہے یہی ہماری افکار کے لئے مشغلہ ہونا چاہئے اور اسی پر ہمارے شعور کی تمام قوتیں صرف ہونا چاہئیں، اگر تم نے یگانگت اور عصبیت قومی کے یہ نتائج تاریخ میں پڑھے ہیں۔ یا آج تم دوسری قوموں میں یہ اوصاف دیکھتے ہو تو کیوں عالمگیر حسیات اسلامی میں ایسا حس پیدا ہونے کو ناممکن خیال کرتے ہو۔

تاریخ واقعات کا اعادہ کرتی ہے۔ تم اگر چاہو تو یہ مرقع پیش ہونا ناممکن نہیں ہے پس قائدین اٹھیں اور اپنی زبردست اسپیچوں سے حسیات قومی کو متاثر کر دیں۔

شعرا اپنی پرتاثیر نظموں سے لوگوں کے منجمد دلوں میں عصبیت قومی کی آگ لگا دیں۔ اور ناشر اتحاد قومی کی دلاویز تصاویر کھینچکر وارفتہ بنا دیں۔

اتفاق — دسمبر [illegible]

مائیں اپنے گود کے بچوں کو یک جہتی کی لوریاں دیں۔ کم سن بچوں کی زبان پر قومی اتحاد کے ترانے ہوں۔ ہر گھر میں اتفاق وارتباط کے انوار پھیلے ہوں اور ہر خاندان برکاتِ ہمدردی واتحادِ قومی سے مالامال ہو۔

نوجوانوں کے عروق میں احیاء ملی اور بقاے قومی کی حسیات کا خون گردش کرتا ہو اور بوڑھوں کی زبانیں قومی اتفاق کے نتائج بیان کرنے میں ہر ایک مناسب وقت میں چلتی رہیں۔

ہمارے مدارس میں جو کورس ہوں اُس میں نتائج اتفاق اور ارتباط قومی کا بہترین سرمایۂ تاریخی موجود ہو جس سے طلباء کے دل و دماغ میں ایک خاص بصیرت ہو اور جو نقوش اُن کے دماغوں میں ٹائپ ہوں اسکو کوئی طاقت فنا نہ کرسکے۔

غرض کہ ضرورت ہے ارتباط اور اتفاق قومی کے ایک ایسی فضاء کی جس سے قومی اور ملی نشو ونما کا نہایت سرعت سے آغاز ہو تاکہ ہمارا وقار ملی اور قومی مستقبل میں فنا ہونے سے محفوظ ہو، اور جو بربادیاں ہو چکی ہیں، جسقدر ہمارے اعضا کٹ چکے ہیں اور جسقدر ہم ذلت و نکبت اور حقارت کی ٹھوکریں کھا چکے ہیں اُس سے ہمکو رستگاری ہو۔

غیر قوموں نے جسقدر ہم کو مریض اور درماندہ سمجھ لیا ہے آیندہ ہمارا وجود قومی انکے اس افکار دماغی کو معدوم کر دے۔ دنیا چونک جاے، راے عامہ پلٹ جاے۔ پس ضرورت ہے کہ ہمارا جرءتِ قومی پھر ایک مرتبہ ماضی کی شاندار روایات میں تبدیل ہو جاے، اور ہماری مساعی کا زیادہ حصہ اسی کی تلاش و جستجو میں صرف کیا جاے +

ماہر بھوپالی

*

تقدیر و عمل

عموماً دس میں نو آدمی ایسے ملیں گے، جنکی عمریں نصف سے زیادہ بغیر کسی ترقی کے گزر چکی ہونگی اگر اُن سے اس کا سبب پوچھا جائے تو وہ صرف یہ کہیں گے کہ :-

"ہمارے سامنے کبھی کوئی عمدہ واقعہ پیش نہیں آیا، واقعات ہمیشہ ہمارے خلاف رہے، دوسرے لوگوں کی طرح نہ ہماری کسی مدرسے میں باقاعدہ تعلیم ہو سکی اور نہ ان کی طرح کام کرنے کا موقع پیش آیا۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو جوانی یا جوانی کے بعد کوئی نہ کوئی کام کرنے کا موقع ضرور پیش آتا ہے اور ہر کام جو مستعدی و کشادہ دلی سے اختیار کیا جائے اور اسے ممکن سے ممکن عجلت کے ساتھ انجام دینے کی فکر کی جائے تو اُسی میں آگے بڑھنے کی بہترین مواقع پوشیدہ ہوتے ہیں۔

جس طرح لڑکے اپنی تعلیم کے متعلق یہ خیال نہیں کرتے کہ یہ ہمیں اسلئے دی جا رہی ہے کہ ہم اس سے خلیق مستعد و مستقل مزاج بنیں اسی طرح بہت سے لوگ یہ خیال نہیں کرتے کہ ہم جن لمحات کو بیکاری و سستی میں ضائع کر رہے ہیں وہ ہماری آئندہ زندگی میں ترقیوں کے لئے سدِ راہ ہونگی۔

کسی فرم کے مالک کو بحیثیت نوکر کے گستاخانہ جواب دینا اور اپنے کاموں میں غفلت و بے پروائی برتنی تمام آنے والی خوشیوں اور کامیابیوں کا استیصال کر دیتی ہے۔

وہ لوگ جو اپنے فرض کو فرض نہیں سمجھتے، وہ جسقدر جو کام کرتے ہیں اس سے زیادہ اُسے خراب و برباد کر دیتے ہیں، انہیں شروع شروع میں اپنی یہ غلطیاں بہت خفیف معلوم ہوتی ہیں لیکن بعد میں یہی نقائص بنکر کامیابیوں کے لئے دیوار بن جاتی ہیں۔

ایسے لوگ کبھی اس پر غور نہیں کرتے کہ اُن کی بزدلانہ اطوار، اُن کی غفلت اور کم ہمتی خود اُنکی کامیابیوں کے لئے سدِ راہ ہوگی اور وہ کبھی اپنی منزل مقصود پر نہ پہونچ سکیں گے

جوانی کو حقیر و ناچیز سمجھنے کے بعد ایک انسان زیادہ سے زیادہ چپراسی، کلرک یا کاشتکار بن سکتا ہے، جسکے بعد زندگی کے ان نقائص کو دور کرنا اس کے امکان سے باہر جاتا ہے اور پھر اس قابل بھی نہیں رہتا کہ اپنی مقررہ قلیل آمدنی کے اسباب پر غور کر سکے۔ ہزاروں آدمی بظاہر کسی عمدہ موقع کی تلاش میں رہتے ہیں لیکن جب انھیں کوئی ایسا موقع میسر آجاتا ہے تو اُس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اُٹھاتے۔

اسکی کبھی پروا نہ کرو کہ تمہارے آباؤ اجداد کیا تھے اور تم نے باقاعدہ کسی اسکول یا کالج سے کوئی سند حاصل کی ہے یا نہیں، بلکہ اپنی ذات پر بھروسہ کرو اور دیکھو کہ ہم کیا ہیں وہ امداد جو دوسروں سے تمھیں مل رہی ہے اس پر کبھی مطمئن نہ ہو بلکہ اسپر فخر کرو کہ تم خود اپنی مدد کیا کر سکتے ہو، اپنی ذات پر بھروسہ کرنے کی عادت غیر محسوس طور پر انسانی طاقتوں کا نشو و نما کرتی ہے، دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرنا اپنے آپ کو تباہی میں ڈالنا ہے۔

"ہنری وارڈ بیچر" کا مقولہ ہے کہ "یہ نہ دیکھنا چاہیئے کہ انسان روپیہ کس قدر پیدا کر سکتا ہے بلکہ دیکھنا یہ چاہیئے کہ وہ آدمی کیسا ہے"۔

یہ ہرگز قابل غور بات نہیں کہ تم کس قدر ناز و نعم میں پرورش پائی ہے، یا تمہاری سوسائٹی کس قدر وسیع ہے ان باتوں کے باوجود اگر تم میں ذاتی اعتماد نہیں ہے تو تم کبھی ایک کامیاب زندگی بسر نہیں کر سکتے۔

کامیابی کے مندر کا دروازہ ہر وقت کُھلا نہیں رہتا بلکہ اُس میں داخل ہونے کیلئے ہر شخص کو اپنی کنجی گھمانی پڑتی ہے اور جب وہ داخل ہو جاتا ہے تو وہ پھر اسیطرح بند ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اُسکی اولاد بھی بغیر جدوجہد کے داخل نہیں ہو سکتی۔

نوجوان لنکن کے اس کہنے پر کرا فورڈ نے مضحکہ اڑایا تھا کہ میں ایک دن کوشش کر کے یونائیٹڈ اسٹیٹ کا صدر بن جاؤں گا، چنانچہ اس کا یہ تمسخر، تمسخر ہی رہا، اور لنکن اپنی

طاقتوں اور اعلیٰ صفات کا نشو و نما کرنے کے بعد ایک دن اپنی خواہش کے مطابق صدر بن گیا۔

درحقیقت یہ مستقل مزاجی، مواقعات کا دروازہ کھول دیتی ہے اور دنیاوی جد و جہد میں اس کے سر پر فتح و نصرت کا تاج رکھ کر سربلند کر دیتی ہے، دوسروں کی امداد، کوئی امداد نہیں ہے اور نہ اس کا تمھاری زندگی کے کاموں میں شمار کیا جا سکتا ہے البتہ شمار کے قابل وہی کام ہیں جنھیں تم نے خود انجام دیا ہو۔

ایسے لوگ جو عیش و مسرت میں رہ کر کسی کام کے لئے مجبور نہیں ہوئے ہیں ان کی طاقتیں شاذ و نادر ہی قوت عمل میں آسکی ہیں، بخلاف اسکے وہ بیکس، غریب اور محتاج لڑکے جنھیں دنیا حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے صرف اپنی ذاتی جد و جہد سے میدان ترقی میں سب سے آگے نکل جاتے ہیں۔

ایک مستقل مزاج نوجوان کی کامیابی کے راستے میں دنیا کی کوئی طاقت سدراہ نہیں ہو سکتی خواہ اُسے کتنی ہی مصیبتوں، مجبوریوں اور مفلسی کی حالت میں رکھا جائے، یا اسے کسی تنگ و تاریک کوٹھری ہی میں کیوں نہ محبوس کر دیا جائے، مگر وہ پھر بھی اپنے آپ کو وزارت کے ایک وسیع ہال میں خیال کرے گا۔

اس کا کبھی خیال نہ کرو کہ تم ایک جھونپڑی میں پیدا ہوئے ہو یا ایک محل میں، بلکہ میدانِ ترقی میں آگے بڑھنے کی کوشش کرو، اور اپنی قسمت یا موقع کا انتظار نہ کرو، تمھارے دلوں میں کام شروع کرنے سے پہلے عمدہ اوزاروں کی ضرورت کا خیال بھی نہ آنا چاہئے کیونکہ جو لوگ اپنی زندگی میں بڑے بڑے کام کر چکے ہیں وہ کسی اوزار یا سرمایہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

نوجوان فراڈے جب کہ وہ دواؤں کی دوکان میں کام کرتا تھا، اگر صرف اپنے ہی دل میں سائنس کے بڑے بڑے تجربوں کا خواب دیکھتا رہتا کہ "کاش مجھے سائنس کے آلات سے بھرا کمرہ ملجاتا تو میں بھی بڑے بڑے اور محیر العقول اختراعات و ایجادات کا مالک ہوتا" مگر اس نے صرف

خواہشات ہی میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا بلکہ بہ نمٹا اور معمولی آلات ہی سے جو اُسے میسر ہوئے اس نے سائنس کے حیرت ناک تجربات حاصل کئے، اور ہنری ہمفری ڈیوی" جیسے قابل شخص سے اپنی قابلیت کا اعتراف کرا لیا۔

کیا تم خیال کر سکتے ہو اگر دوا فروش کا یہ ادنیٰ ملازم کچھ عرصہ تک آلات دواؤں کا انتظار کرتا رہتا تو۔ ڈیوی جیسا لائق شخص اسکی ایجادات کو تسلیم کر لیتا اور اُسے "مائیکل فراڈے" کہنے پر مجبور ہوتا؟ ... نہیں ہرگز نہیں۔

اسیطرح ایک اور مستقل مزاج انسان گزرا ہے جس نے مائیکل کی طرح ایک معمولی پتھر سے جسے دوسرے صناعوں نے بیکار سمجھ کر چھوڑ دیا تھا، ڈیوڈ کا مجسمہ تیار کیا۔

بیو رٹ، جو ایک غریب لوہار کا لڑکا تھا عمدہ موقعوں کا منتظر نہ رہا، اور اس خیال کو اس نے بالکل نظر انداز کر دیا کہ مختلف زبانیں سیکھنے کے لئے دوسرے ممالک کا سفر ضروری ہے، بلکہ اس نے اپنی فرصت کے ہر لمحے کو غنیمت سمجھ کر دوسری زبانوں کا از خود مطالعہ شروع کر دیا اور تھوڑے عرصے میں مختلف زبانوں کا عالم ہو گیا۔

دنیا میں ایک بڑا آدمی بننے کے لئے دولت، اور با اثر دوستوں کی ضرورت نہیں، عظمت خود انسان میں موجود ہے وہ سنہری اتفاقات جنکی تلاش ہے وہ خود تم ہی میں مضمر ہیں، قسمت ماحول مواقعات اور دوسروں کی امداد پر تمہاری ترقی کا انحصار نہیں ہے ✦

(ترجمہ) سید ابو محمد ثاقب کانپوری

*

یاقوت خطرت

پندرہ سو چھپن کے موسم بہاریں، برادرِ کوچک حکمرانِ خطرت[1]، مقرب خاں ایک دور دراز کی شاہی سفارت سے وطن کی جانب واپس آ رہا تھا نصف درجن رفقا ہمرکاب تھے سردار اپنا گھوڑا تیزی سے ڈالے ہوئے بادیہ فرسا تھا، نہ تو وہ راستہ میں کہیں تفتیش احوال کی غرض سے رکا اور نہ بھائی کے اس کوہی حصار کے قریب پہونچنے سے پہلے، کسی جگہ اس نے گھوڑی کی باگیں کھینچیں جو سواد شہر خطرت میں شاہانہ شان سے استادہ تھا۔

فضا، حصار حیرت خیز انداز سے ساکن تھی، مگر یہ سکون فرط اطمینان کی بدولت نہ تھا، کیوں کہ جب آنے والا صدر دروازہ کے قریب پہونچا تو عجیب کیفیت نظر آئی۔ درِ داخلہ قلب صد پارہ یا گریباں ہزار چاک بنا دیا گیا ہے اور دونوں جنگی پٹ[2] اپنے فولادی[3] قبضوں پر شان تساہل لئے ہوئے جھول رہے ہیں خان اس خوف انگیز نظارہ سے متاثر ہو کر کودا، اور سیف بدست ہو کر اندر داخل ہوا۔ مداخلت راہ کے لئے کوئی دشمن موجود نہ تھا مگر آنے والے کی نگاہیں جس طرف اٹھ گئیں "اجل و بربادی" سے دوچار تھیں، کمروں کی مشجری زردوزی حجاب، چوب کاریوں کے کارچوبی[4] کام شکستہ و برباد تھے، اور ادھر اُدھر ٹوٹے ہوئے صندوق، مشرقی تخیل پرست شیشیاں ساغر و کے پیوند طلب آبگینہ صفت بلوریں دلوں کی صورت بکھرے ہوئے تھے یا بقول ان کے کوُے قاتل میں شیشہ ہائے دل کے چکناچور ٹکڑے تر بتر تھے سنگی فرش پر مرد، عورتیں اور بچے اپنے اپنے خون میں نہائے ہوئے دست و گریباں تھے۔

[1] خطرت اسی صوبہ کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی جو تاریخ ہند کے موجودہ دور میں افغانستان کے نام سے موسوم ہے۔ [2] پٹ۔ کواڑ کے تختے [3] جنگی زبردست مضبوط [4] چوب کاری۔ لکڑی کا کام۔

بالاخانہ والی، خواب گاہ کے اندر، وفا پرست جاگیرداروں کی، دلیل وفائے عملی نقشوں کی جھرمٹ میں، خان کی بدرِ مثال بھاوج اپنے مہ پارہ مقتول شیرخوار کو، آغوش محبت سے لپٹائے کلیجہ سے لگائے ہوئے، خواب نوشین مرگ کی تسکین نواز فضائے خاموش میں محوِ آرام و سرشارِ رحمت ہوکر، تہذیب عالم و تمدن زمانہ کی نامنصف نگاہوں کے سامنے، انتہائے مظالم کمال بے دردی مافوق الفطرت حرص و دولت و خلاف انسانیت جذبہ نصرت کے مقابلہ میں وہ لطیف و عبرت خیز دلدوز معصوم و بے زبان تصویریں پیش کر رہی ہے جو صحیفہ تاریخ عالم کے اعلیٰ ترین انقلابی صفحات کے اندر، ماتا کی پھکن وہ دودھ پیتے کی معصومیت ظالموں کی زبردستی صنف لطیف کی بیکسی کے بہترین و زندہ جاوید ناقابل محو یادگار، خون بھری گلکاریاں بن کر رہیں گی۔ جڑاؤ فیروزی پہونچوں کے چھیننے میں پہونچوں پر ایسی زبردستی سے دست درازی کی گئی ہے کہ سیمیں کلائیاں لہولہان ہو رہی ہیں، کان کی جواہر زیب لویں گوشواروں کے کھچ جانے سے شگافتہ ہو گئی ہیں جن پر تازہ لہو کے منجمد قطرات، یاقوت احمر کی صورت نمودار ہیں نیلی جوشن کے ریشمی بند نوک خنجر سے بڑی بیدردی کے ساتھ کاٹتے وقت انگوری بازوؤں پہ آڑی ترچھے چرکے پڑ کر انگور ہو گئے ہیں گوہر آمود لٹیں وحشیانہ انداز سے بکھری ہوئی ہیں، آب دار موتیوں کے ساتھ سنہری بالوں کے ریشمی گھونگر بھی نوچ لئے گئے ہیں سینہ و گلو پہ پیشانی پر، چنپن ہار، حسن زیب، چمپا کلی چھینے جانے کی جراحتیں صاف ہویدا ہیں، زخمی و شیرخوار بچے کی آدھی کھلی ہوئی نرگسی آنکھیں ماں کی جانب ہیں اور مجروح و بے بس ماں کا ایک ہاتھ بچے کی ڈھلکتی ہوئی گردن سنبھالنے کے لئے تکیہ اور دوسرا (کیونکر لکھوں) پارہ جگر کے ننھے سے سینہ پر خمدار چاقو کا زخم چھپائے ہوئے ہے بچے کے منھ سے خون کے ساتھ دودھ بھی اُبل آیا ہے اور ماں کی چھاتی خون سے بھری ہے، یہ دونوں خاموش ہستیاں ننھلے زبان بے زبانی سے فضائے بسیط کی بھیانک گہرائیوں میں تلاطم مچا رہی ہیں، اے اولاد رکھنے والو

دلوں پر ہاتھ رکھو، اور میری زبانی، دکھیا ماں کی کہانی سنو! میں غیب داں نہیں، میں فطرت نگار نہیں، میں عکاس جذبات نہیں مگر پیٹ کی ماری ماں کے خون بھرے لبوں کا منجمد تحرک، اور شیرخوار کی زخمی آنکھوں کا جما ہوا پرتو خود داستان خیز ہے۔ سنو! اور عبرت نیوش کانوں سے سنو!! ؎ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو! میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہے

اے جنگ پرست انسانو وحشی مزاج باشندو! کیا تمہاری ماؤں نے تمہیں دودھ نہیں پلایا، کیا تمہاری بہنوں بیویوں کی گود بچوں سے خالی ہے؟ تم نے خونریزی کا نام شجاعت اور قتل و غارت کا نام مردانگی رکھ چھوڑا ہے؟ تم نے آجتک لاکھوں زندہ و نفیس ترین ہستیوں کو مٹا دیا کیا آج تک کسی مٹی ہوئی بدترین ہستی کو زندہ بھی کر سکے ہو؟ دیکھو! میرے اس دودھ پیتے بچے کی طرف دیکھو، اس طرح کی شجاعت، بزدلی اور اس قسم کی مردانگی، نامردی ہے، اے دنیا کی تہذیب مجھے کیوں ستانے آئی تھی۔ تیری آنکھوں میں آنسو کیوں چھلکے؟ شاید تیرا سیاہ دل پسیج گیا۔ مگر اب کیا فائدہ۔ اُف میرا بچہ۔ ظالمو! تم خوش ہو۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم مسرور ہو۔ صرف اس لئے کہ میں بے بس ہوں، اور میرا بچہ ابھی گھٹنیوں بھی نہیں چل سکتا۔ یہ سچ ہے کہ تمہاری کوکھ ماتا کی چبھن سے بےخبر تمہارے دل، مادری تڑپ سے بے نیاز ہیں۔ مگر کیا تم قسم کھا کر کہہ سکتے ہو کہ تم نے کبھی اپنی ماں بہنوں کو، بیمار بچوں کی تیمارداری، اپنی خالہ پھپھیوں کو چاند سے لال کو مسرت سے لوریاں دیتے ہوئے اپنے بہرے کانوں سے پھوٹے دیدوں سے نہیں سنا، نہیں دیکھا ہے؟ تم انکار نہیں کر سکتے میری آنکھوں میں دیکھ لو تمہارے چہروں سے رنگ اڑ گئے ہیں۔ ہائے میرا بھولا بچہ تو میرے جگر کا ٹکڑا، اس گھر کا اکیلا چراغ، اس آنگن کا کھیلنے والا بے داغ مہ پارہ تھا، تم نام کے مرد ہو، تمہاری حرکتیں، جنہیں تم کمزور قلب کہتے ہو، ان عورتوں سے زیادہ رکیک ہیں۔ ہائے تم نے اسکو کیوں مارا؟ شوہر کے سبب میں قصوروار سہی مگر اس بچے کی خطا بتاؤ؟ مانتی ہوں کہ میں پوشیدہ دفینہ نہ بتاتی جواہرات کا پتا نہ دیتی مگر میرا لعل تو بے زبان تھا۔ وہ سہم کر میری چھاتی سے لپٹا ہوا تھا تمہارے بھاری ہاتھ ٹوٹیں، اسکی ننھی سی کلائیاں مروڑ دیں پھول سا بدن زور سے جھنجھوڑ دیا۔ تمہاری نسلیں برباد ہو جائیں تم میرے گھر کے اکیلے چراغ کو گل کرنا چاہتے ہو، میں نے تمہاری منتیں کی، ہاتھ جوڑے، پاؤں پکڑ

تیار تھی کہ میرے بچے کو چھوڑ دو میں جوگن بنکر، جنگل بساؤں گی، اپنے لعل کی یاد میں کملائی جاؤں گی مگر تم نے ایک بھی نہ سنی۔ پہاڑ کیوں نہیں ٹکراتے زمیں کیوں نہیں پھٹتی۔ زلزلہ کیوں نہیں آتا، سمندر طوفانی کیوں نہیں ہو جاتے۔ ہائے تم مجھ ماں کی پھوٹ نہ جانے والی آنکھوں کے آگے ننھے سے سینہ میں فولادی خنجر اتار رہے ہو پہلے مجھے مار ڈالو۔ اُف، اسے جلدی نکالو، کہیں خنجر کے ساتھ دل کے ٹکڑے بھی نکل نہ آئیں ہائے! میں زخم کے بوسے لینے میں بھول گئی، نہیں تو، فولادی خنجر چبا جاتی اور دیوانی شیرنی کی طرح تمہاری بوٹیاں دانتوں سے اڑا دیتی، نامردو سُن رکھو!! تم سمجھتے ہو کہ ہم ماں بیٹے مر چکے ہماری داستانیں بھی اس زندگی کے ساتھ مٹ گئیں۔ ہرگز نہیں، جب تک عالم کی زبانوں میں گویائی، دماغوں میں تمیز جذبہ آنکھوں میں بصارت، اور دلوں میں سمجھنے کی قوت باقی ہے ہماری داستانیں تازہ ہوتی رہیں گی، اور تم پر، تمہاری صدہا۔ ہزارہا لکھو کھا آیندہ نسلوں تک ہر طرف سے ابدی لعنت و مستقل ملامت برستی رہیگی، تمہاری نجس روحیں قید خاکی سے آزاد ہو جائیں مگر عالم ارواح میں جہاں ذکور و اناث کیساں ہیں، بار نجاست کی ناگزیر قید میں ہمیشہ ہمیشہ گرفتار رہینگی، آخر تم نے اس نادان کا خون کیوں بہایا؟ دیکھ لو یہ تمہاری بزدلی پر مسکرا رہا ہے، ہائے کیسی مسکراہٹ ہے۔ بزدلو نامردو! تم اس سے ڈر گئے۔ ضرور ڈر گئے، جب تم کو مرگنتی اگر میری آنکھیں دیکھنے کو باقی رہنے دیتے اور میرے دُودھ پیتے لال کو اتنی مہلت دیدیتے کہ بڑا ہوتا جوان ہوتا اور تلوار سنبھال سکتا اُسوقت تمہیں بھی چھٹی کے دُودھ کا مزا یاد آجاتا اور میں دیکھتی کہ اسکو اس بے بسی سے قتل کر لیتے یا مجھ پر اس نامردی سے ہاتھ ڈال لیتے، خان اس روح فرسا نظارہ سے متاثر ہو کر بُت بن گیا، سارا جسم پیکر مردنی کی صورت بے حس تھا، صرف سیاہ پتلیاں اس تلاش میں بے فائدہ متحرک تھیں کہ کوئی ذی روح ہستی مل جائے جو سامنے کی ان قیامت خیز گتھیوں کی حقیقت انسانی زبان میں سُلجھا سکے۔

آخرکار خونیں کمرے کے ایک تیرہ تر گوشہ سے جہاں وہ بہت دیر سے بیہوش پڑے تھے ایک سفید ریش مُلا لڑکھڑاتے ہوئے باہر نکلے جن سے خان خوب واقف تھا کہ یہ ہماری نسل کے بزرگ ترین و مخلص ترین افراد میں اُن کے پنجۂ نورانی سے تین اُنگلیاں کاٹ لی گئی تھیں اور سراپا استقدر زخمی تھا کہ لطیف روح تن زخمی کی قید سے گھبرا کر نکلنے ہی والی تھی کچھ بھی سہی ان بزرگ نے آخری سنبھالا لیا اُکھڑی ہوئی سانسیں بہ [illegible]

اور ساری کہانی کسی طرح سہی سنا دی، گو الفاظ کی روانی جگہ جگہ سسکیوں اور ہچکیوں سے ٹوٹ ٹوٹ گئی۔

خلاصہ بیان:۔ حکمرانِ خطرت اپنے تمام و کمال رفیقوں کو ساتھ لیکر قوی تر غنیم کے مقابلہ میں دام مکاری میں پھنس کر اپنی مختصر جماعت سمیت خاک ہو گئے، جیسے ہی اس قیامت خیز طوفان بداماں حادثہ کی خبر خطرت تک پہونچی، فوراً صحرائی قزاقوں کا ایک دستہ دامان کوہ کی جاروب کشی کرتا ہوا حصار پر آپڑا باقی ماندہ پاسبانوں نے جو دروازہ پر موجود تھے نہایت جی داری سے مقابلہ کیا مگر کثرت تعداد سے مغلوب ہو گئے، ڈکیتوں نے تمام قلعہ کو مذبح قصاب اور تمام کمروں کو گنج شہیداں بنادیا جی کھول کر قتل و غارت کیا اور اپنے کوٹلے واپس چلے گئے مگر صرف ایک شے ایسی ہے جسکو وہ نہیں پاسکے گو انھوں نے تلاش مقصود میں، گوشہ گوشہ، ذرہ ذرہ چھان ڈالا۔ یعنی "**یاقوت خطرت**" آخری وارثِ جانے سے پہلے تمہاری حور خصائل بھاوج نے وہ یاقوت اس امید کے ساتھ چپکے سے مجھے دیدیا کہ دنداں دار کلب مجھکو پرستار خدا سمجھکر چھوڑ دیں گے۔ میں خود لب گور تھا مگر حتی الوسع اسکی حفاظت کرتا رہا اور اب یہ امانت اس آخری حقیقی وارث کو دیتا ہوں جسکے گھرانے کی خدمت میں میری ساری زندگی بسر ہو گئی اور جسکی خدمتوں میں میں ..... مر..... رہا..... ہوں"۔ اور حقیقتاً ہوا بھی یہی۔ جیسے ہی اِن بزرگ امین نے، انمول یاقوت مقرب خاں کے ہاتھوں میں دیدیا، ان کی خون آلود آنکھیں رُتانی ہوئیں، فرطِ تسلی، تکمیل مدت و جوش طمانیت پھرتی ہوئی پتلیوں میں شعلہ افگن ہو کر باصرہ نواز ہو گئے، اور وہ خود فرش سنگی پر گر کر پیکر بے ارماں تھے۔ مقرب خاں نے یاقوت کو زرنگار کمر زیب میں بعجلت محفوظ کرلیا اور باہر نکل آیا جہاں اسکے پانچ ساتھی چشم براہ تھے معلوم ہوا کہ چھٹا ساتھی حصار کے اندر مالک کے پیچھے پیچھے داخل ہوا تھا اور آقا کے آگے آگے باہر نکل کر پشت مرکب پر دیوانہ وار بیٹھا اور سلسلۂ کوہ کی جانب سرپٹ ہوا ہو گیا ذکی الحس مقرب خاں نے سپاہی کی حرکت کو مکاری سے تاویل کیا اور بدترین نتائج کے واسطے تیار ہو گیا، اسی دوران میں گوشوں میں چھپے چھپائے شہری باشندے خان کے گرد مجتمع ہو گئے، جنہیں ہدایتیں دی گئیں کہ اگر ہمارا ا قرار، امر نا گزیر ٹھہرا، تو تم، شہیدوں کی تجہیز و تکفین، میری جگہ، عمدگی سے کردینا، اور سردار نے مڑکر اپنے ساتھیوں سے کہا گھوڑوں کو کھلاؤ پلاؤ اور تازہ کر کے باگوں پہ

نگار رکھو تا کہ یک لمحی اطلاع پر ہم لوگ بآسانی سوار ہو کر چل نکلیں - آیئے اب ہم آپ اس مفرور سپاہی کا تعاقب کریں جو مقرب خان و ملا کی گفتگو و داستند کیوقت موجود تھا، اور جسنے طے کر لیا تھا کہ یا تو یاقوت خطرت پر قبضہ حاصل کرے یا اپنی بیش بہا معلومات سے، جتنا بھی ممکن ہو فائدہ اُٹھائے، اسی ارادہ سے وہ سلسلہ کوہ کی جانب روانہ ہوا تھا کہ بہترین تدبیر انہیں قزاقوں سے مل کر عمل پذیر ہو سکتی ہے جو حصار خطرت کو برباد کر چکے تھے۔ خوش بختی ہمراہ رکاب تھی - کئی میل جانے سے پہلے ہی وہ اُنہیں ڈکیتوں کے جال میں پھنس گیا اور ایک سیاہ ریش شبرنگ افغانی افسر کے سامنے لایا گیا جسکا چوڑا سینہ بن مانس کی طرح بالدار تھا اور ایک بد صورت مگر قوی جسم ترکانی النسل اسپ ہمرنگ پر سوار تھا، مکار سے سوالات کئے گئے جسکا جواب یہ تھا کہ میرے پاس کچھ خاص اطلاعات ہیں جو میں صرف سردار کو بتاؤں گا - لہذا کم درجہ کے قزاقوں کو حد سماعت سے دور کھڑے ہو جانے کا حکم دیدیا گیا اور مکار سے مطالبہ کیا گیا کہ جو کچھ کہنا ہو، فوراً کہہ گزرے۔

مکار = میں جانتا ہوں کہ "یاقوت خطرت" کس جگہ ہے - اگر تم اور تمہارا قوی بازو مجھے اُس پر قبضہ دلا دے تو میں ایک ہزار روپیہ تم پر تقسیم کر دوں گا۔

سردار = انعام بہت کم ہے (حقارت سے) ہماری تلواروں کا استعمال اتنا کم قیمت نہیں ہو سکتا - اور قبضہ بھی ایسے جوہر کا مد نظر ہے جس کا مثل اس وقت شاہ فارس و سلطان روم کے جواہر خوانوں میں موجود نہیں اس طور سے گفتگوں میں، باہمی نفرت و تکرار معاملت کی ابتدا ہو گئی - ڈکیت مُصر تھا کہ ہم اصل قوت مہیا کرینگے اس لئے گویا ہمیں یاقوت کا اصل مالک ہونا چاہیئے ، آخر ایک سمجھوتہ ہو ہی گیا، جسکے رو سے مکار سپاہی کو اسی مقام پر پچاس اشرفیاں نقد ملجائیں، اور وہ راز سے خبردار کردے اور جب یاقوت پر قبضہ حاصل ہو جائے تو وقت سو اشرفیوں کا اور مستحق ہو گا، سمجھوتہ کی پہلی شرط مناسب وقت عمل میں لانے کیلئے قزاق نے اپنی چرمی پٹی سے پچاس طلائی ٹکڑے نکالے اور فریق ثانی کو ہاتھوں ہاتھ دیدیے - اب پردہ در نے بتایا کہ "یاقوت مقرب خان کے پاس ہے اور وہ اب تک خطرت میں موجود ہے۔

قزاق = میں نے تم کو تمہاری اطلاع کی قیمت پچاس اشرفیاں پیشگی (اپنا ہاتھ بے پروائی سے پشت کی جانب لیجاتے ہوئے) دیدی ہیں اور اب مجھے وجہ ہے کہ تمہیں اپنے مالک سے مکاری کا انعام دیدوں" ہر ایک برباد ہو جائے گا (اپنے

سپاہیوں کو فیض سماعت کیلئے بلند آواز میں، جسنے کبھی اسلحے کی حرکت کی، یہ کہتے ہی کہتے اس کا ہاتھ بس کر ٹوٹ کر فضا میں اڑ گیا بجلی چمکی اور چشم زدن میں مکار کی کھوپڑی ٹھوڑی تک دو نیم تھی۔ اب قزاق نے مردہ انسان کی جیبی سے خوفزدہ ہی کر سنا "قیمت مکاری" کالالی تحویل کر ڈالی اور اسکی لاش کو رحم کرگس ان پر چھوڑ کر اپنے ساتھیوں کے پیش پیش جہاں خلوت کی طرف گامزن ہو گیا۔ ابھی یہاں مقرب خاں دفن و کفن کی ہدایات سے فارغ بھی نہ ہوا تھا کہ — سوار کی ٹولی دامن کوہ سے اترتی ہوئی نظر آئی خان نے اپنی ذہانت سے فوراً قیاس کر لیا کہ کیا کچھ گزرا ہوگا، یقین تھا کہ راز یاقوت فاش ہو گیا، جھٹ پٹ گھوڑوں پر ایڑیاں جمائیں۔ بقیہ پانچوں نے بھی پیروی کی مقرب خاں کی پیش بندی کام آگئی، پوری جماعت، اچانک فرار کے واسطے کمر بستہ تھی شاید ایک لمحہ کی پرہی ہوگی کہ وہ لوگ اپنے متعاقبین سے اچھے خاصے فاصلہ پر باد پیما تھے۔ مقرب خاں نے جنوبی درہ کی طرف باگیں اٹھا دیں کہ اگر نصیب نے ساتھ دیا تو میں کابل تک پہنچ رہوں گا جہاں اسوقت بادشاہ فرماں روا تھا۔ ان چھیوں کو متعاقبین کے بہت پہلے دہانہ درہ تک پہنچ جانے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی۔ اب یہ دونوں جماعتیں درہ کے اندر والے پتھریلی گزرگاہ سے گزر رہی تھیں ذکیت صفرا اپنے سیاہ ترکمان پر تمام ڈاکوؤں سے اتنا آگے بڑھا ہوا تھا گویا نقطہ بین الخطوط یا دو دیگر دوں کا ملانے والا درمیانی کڑا بنا ہوا۔ یہ دوادوش، موت وحیات کی گھوڑ دوڑ گلنار کی مقرب خاں کے ہمراہیوں میں سے ایک گھوڑے نے پتھر سے ٹھوکر کھا کر سکنہ ہی لی اور سوار بمعیت زمین پر تھا، راکب و مرکب دونوں کے افتادہ پیکر چشم زدن میں گھوڑوں کے سموں سے پامال ہو کر پاش پاش ہو گئے، کیونکہ سارے قزاق ان پر سے ہی جا با گذر گئے جنہوں نے جسم مردہ کے شانوں سے لباس نہیں اتارا وہ خوب جانتے تھے کہ وہی شاہزادہ جبکر زجیبم اور گلنار جیبی ہے وسیلاخ فارس تھے ان کا اصلی شکار ہے۔

رستہ میں کوئی اور سانحہ پیش نہیں آیا، تھوڑی دیر بعد دونوں جماعتیں، دہانہ خارجہ سے کھلے ہوئے جنوبی میدان میں آنکلیں، مقرب خاں نے اپنے چار بقیہ سپاہیوں کو حکم دیا کہ "مجھ سے جدا ہو جاؤ" اور واقعی سب ہی کی سلامتی کیلئے یہی عمل بہترین چارہ کار تھا۔ سردار اپنے نجیب الطرفین عربی سمند پر سوار تھا جسکی تیزی ضرب المثل متفق رکھی گئی تھی اور ساتھیوں کا پہلو نہ چھوٹنے پائے جو مقامی گھوڑوں پر سوار تھے اس سے قطع نظر یا کو خوب معلوم تھا کہ دشمنوں کے تعاقب کا اصلی مقصود وہی یاقوت ہے جو اسکے کمر زیب میں پوشیدہ تھا شورش و گیر ودار سے

گذرنے میں یہ تمام خیالات ہوشیار سردار کے منتشر دماغ میں کوند چکے تھے۔ نتیجہ حسب امید ہوا۔ چاروں سپاہی جدا ہو کر دوسری راہ پر ہولے، انکی پیش رفتاری سے ذرا بھی مزاحمت نہ کی گئی اور متعاقبین کی جماعت کے آگے آگے سیاہ ترکمانی، عربی سمند کے نشان سم پر گامزن تھا

مقرب خاں نے تنہا ہوتے ہی ریشمیں باگیں گھوڑے کی مرضی پر چھوڑ دیں ہوئی ساہی سبزہ زار کے نرم تختوں پر بجلی کیطرح تڑپ کر روانہ ہوا لہراتی ہوئی ریشمی ایال کے نقرئی گھونگر فاتحانہ انداز کے ساتھ فضائے بسیط سے اٹھکھیلیاں کر رہے تھے دُم طاؤس کیطرح چنور تھی کنوتیاں، فراست کی آڑی ترچھی تصویریں تھیں صبا خرامی جوشِ طرب کی دلیل تھی وہ مخمور تھا مسرور تھا کہ حلقۂ لجام کی کشیدہ گرفت سے نجات تو ملی آزادی تو نصیب ہوئی اس اچانک تسک نسیم تیزی نے مغل شاہزادے اور افغانی ڈاکوؤں کا درمیانی فاصلہ بہت زیادہ بڑھا دیا اگرچہ سیاہ ترکمانی، مالک کی ہر آواز پر گرتا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان تمام گھوڑوں سے آگے تھا جو دوسرے تنزاقوں کے زیر ران تھے، بہر طور اس طریق سے کچھ گھنٹوں بعد تختہ کیفیت قطعاً منقلب ہو گیا، یہاں تک کہ جب تھکا ہوا آفتاب اہن افق میں مائل بپستی ہونے لگا، تو باہمی دوڑ صرف سبک خرام عربی سمند اور قوی جسم سیاہ ترکمانی تک محدود رہگئی تمام کم درجہ متعاقبین نگاہوں سے کلیتاً ناپید ہوگئے، سواد قبین کے جواب تک بہت خفیف طور پر شرقی افق کے دھندلکے میں گھرائی اور لڑکھڑاتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

حالات ظاہرہ بتاتے تھے کہ سمند جیت جائے گا، سیاہ ترکمانی اپنے کثیر استخوان وگوشت کی باوجود بھی اپنی چوڑی پیٹھ پر ضخیم سوار اور گرانبار فولادی سلاح کا بوجھ تکلیف سے محسوس کرنے لگا تھا، اس بار کو سبک کرنے کے لئے، حماقت نصیب قزاق نے غلاف ایال کے ساتھ، اپنا مغفر و چار آئینہ بھی اتار پھینکا امید یہ تھی کہ اگر تنہا مقابلہ کی نوبت آئی تو ان کی حفاظت کے بغیر بھی مغل جیسے ہلکے پھلکے بچے کو دبوچ بیٹھوں گا۔ مگر اس طور سے بھی درمیانی فاصلہ کچھ ایسا کم نہ ہو سکا اور قزاق محسوس کرنے لگا کہ ہیہات! شکار ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی وقت مقرب نے مڑ کر دیکھا کہ متعاقبین میں ایک اکیلا آدمی مجھسے قریب ہے رگ شجاعت متحرک ہوئی، مردانگی نے غیرت دلائی اتنی دور، اتنی تیز روی سے فرار کے خیال پر ندامت آئی

پلٹ پڑی کی ٹھہر گئی، باگیں کمر زیب کے کانٹے سے لگالی گئیں، غیور نے شانہ سے کمان اُتاری، ترکش سے تیر نکالا اور یکایک لجام کھینچکر مقابلہ دشمن کو لئی پلٹ پڑا، تیر خانہ کمان میں زہ تھا، چٹکی رہائی کیلئے تیار تھی، بھاری قزاق اپنے بھرکم گھوڑے پر گرجتا ہوا آیا، اور پھینکے ہوے سلاح حفاظت کے دردبھرے احساس ضرورت سے باخبر ہوکر ترکمان کی ایال پر جھک پڑا تاکہ نشانہ خالی جائے۔ کمان کڑکی، ناوک چلا، فضا میں زناٹا ہوا پردیں سرسراہٹ ہوئی، تیر نے خطا کی، راکب بچ گیا مگر مرکب کا شانہ جھول پڑا خود سیخ پا ہوکر گر پڑا جسیم قزاق بھی گرا، دھماکا ہوا، گرد اُڑی، اور افغانی ایسا بے حس ہوگیا گویا صدمۂ ضعف افتادگی نے اسکو دنیا سے گونگا بہرا بنا دیا تھا۔ سبک اندام مغل پشت سمند سے نیچے کودا، تاکہ زمین گیر کو دیکھے اور بشرط ضرورت رشتۂ حیات کاٹ دے۔ مگر قزاق کی ظاہری بدحواسی محض مکاری تھی، اسنے زخمی ہوکر سونچا کہ اب میں پھرتیلے مغل کے رحم کا محتاج ہوجاؤنگا جو عربی مرکب پر ہے اور جسکے ہاتھ میں تیر و کمان موجود ہے جسکے استعمال میں وہ کافی مشاق ہے، صرف اکیلی امید فتح یہ تھی کہ دشمن سے قریب ہوکر دست بدست کی نوبت پہونچ جائے۔ بہترین تدبیر یہی سمجھ میں آئی کہ زمین پر گرکر موت کا بہانا کردیا جائے۔ بہرحال جیسے ہی مغل شاہزادہ لاش پر جھکا مردہ صورت قزاق کا داہنا ہاتھ تڑپ کر اُٹھا اور پٹکے پر جھپٹ گیا اور حقیقتاً پوشیدہ یاقوت گو افغانی اس سے بے خبر تھا اسکی ہتیلی کے حلقہ میں آگیا۔

اب تختے بالکل منقلب تھے۔ نازک اندام مغل اپنے زبردست حریف کی پنجہ میں تھوڑی دیر تک کمسن لڑکے کی طرح تڑپا کیا جیسے کوئی زبردست کتا چوہے کو جھنجھوڑتا ہے۔ مگر خان کی حاضر دماغی اب بھی حاضر تھی، اسنے فوراً پیش قبض نکالا اور اُس کو بکمال گوشت جسم میں پیہم ڈبونے اُبھارنے لگا، قزاق نے مجبوراً اپنی گرفت ہٹائی اور کمر سے تلوار لیکر کھڑا ہوگیا، خان نے بھی ولایتی کو ہوا میں جنبش دی، اب کم رنگ شفقی روشنی میں دو دستی جنگ شروع ہوگئی جسمیں مغل کی سبک دستی افغان کی زبردستی سے ہمسر تھی، مگر خان کو اتنی بھی فرصت نہ تھی کہ بھاری دشمن کو تھوڑی دیر کھلاتا رہتا، تاکہ وہ ہانپ جاوے سینہ کے زخموں سے کافی خون بھی بہ نکلے جسکے بعد غشی یقینی تھی، ڈر یہ تھا کہ دو چار متعاقب جانے کس گھڑی پہونچ جائیں اور سب مل کر معاملہ خراب کردیں اسی لئے چابکدست مغل نے افغانی کے کھلے ہوے سر و سینہ پر بوچھار کرکے شکستہ غربال یا کُھلا اُدار ذرہ بنا دیا، جب حریف نے دیکھا کہ برق انداز مغل کا ترکی بہ ترکی جواب ناممکن ہے تو اسنے سارا جگر اکیبارگی چکا دینے کیلئے ضرب کاری کو کمر تا کر سر پر ایک بھرپور ہاتھ چھوڑ دیا مغل نے تلوار کو تلوار پر گانٹھ لیا خوفناک جھناکا ہوا، اور قزاق کی شمشیر کا پھل شاہزادے کی بہتر مزاج فولادی صمصام سے ٹکراتے ہی دستہ تک تھرا کر جدا ہوگیا، قزاق نے فوراً بکار

قبضہ اس پر پھینکدیا اور کمر سے چوڑا تیغہ لیکر دوسرا وار لگانے کے لئے بڑھا مغل نے تلوار تو روک لی مگر وار زبردست ہاتھ پر بھرپور تھا، دانتوں پسینہ آگیا۔ افغان نے اس جدید دگرانبار حربہ کا آخری وار اپنی تمام وکمال قوت صرف کرکے کیا، مد نظر یہ کہ رزمی تیغہ کا پورا لنگر ایک دمشقی پارہ فولاد بھی برداشت نہیں کرسکتا، لہٰذا خان نے بھی اس وار کو ایک پہلو میں جست کرکے خالی دیا، اور اس سے پہلے کہ قزاق اپنا زمیں دوز حربہ، دوبارہ غبار آلود فضا میں بلند کرسکے، پھکیت مغل نے اپنی ناگن کو ہوا میں جنبش دی اور لپک کر تلوار کا پھل دشمن کے دل میں دستہ تک اتار دیا اور جسم حریف بغیر حرکت و صدا، نقش ریگ ہوگیا۔

دنیا پر اب پورا دھندلکا چھا چکا تھا اور مقرب خاں بھی خستہ آفتاب کی طرح اپنی صبر آزما دوڑ دھوپ سے تھک چکا تھا، اس نے کان لگائے، تھوڑی دیر غور کیا مگر ٹاپوں کی کوئی صدا محسوس نہ ہوئی، نتیجہ یہ نکلا کہ غالباً اور دل نے راہ بہلادی ہے اسنے سوچ لیا کہ آگے نہ جاؤں گا رات یہیں بسر کروں گا۔ سیٹی کی صدا ہوا میں گونجی، پابند صوت سمند دوڑ کر آیا جسکو آقا نے قریب کی چراگاہ میں لاکر کھول دیا اور کاٹھی پر تکیہ کیے ہوئے ایک بلند دیوار کے نیچے سوگیا، جو شمالی سرد ہوا سے بچائے ہوئی تھی۔

دوسری صبح کو نکلتا ہوا آفتاب پوری روشنی سے چمکا اور طائران سحر خیز کے بشاش ترین نغمے فضائے غلمان میں گونجنے لگے جو افغانستان کی نفیس وادی سمجھی جاتی تھی، وادی کی سیراب کرنے والی نہر کے ہر پہلو میں، شہتوت، خوبانی، زرد آلو، شفتالو، آلوے بخارا، چہار مغزی اخروٹ اور انشبار چنار کے صدہا پودے پھلوں سے لدے ہوئے کھڑے تھے نظر نواز دھانی پتیاں شعاع مرتعش و رقصاں سے عکس پذیر ہوکر، دھانی سنہری قبائیں برپا کر رہی تھیں، دو منزلہ سرائے جنکا سر بہ ابر محل گرداگرد کی پہاڑیوں کا سرتاج تھا۔ محض ان زرخیز و ثمر آمود پودوں سے عطر دولت نہ کھینچتے تھے بلکہ خود اس نہر سے بھی جسکی طلائی ریگ جمی ہوئی گداز تہوں سے حاصل کرلی جاتی تھی جو نہر کے طبقہ سفلیہ پر قدرتی عنوان سے سنگین ہاتھوں میں محفوظ رہتی تھیں۔ موسم بہار اپنے شباب پر تھا، خودرو اشجار معراج تازگی پر تھے گرد و نواح کے صوبوں میں کسی جگہ بھی فصل ثمار نفیس کا اتنا گرانبہا یقینی اعتبار نہ تھا جتنا کہ سرائے کے ملحق محل پائیں باغ میں تھا۔

اس چمن کے اندر صبح صادق کی تازہ و لطیف سپیدہ میں دوست محمد کی اکلوتی بیٹی زلیخا، اپنی دو کنیزوں کے ساتھ ٹہل رہی تھی دوران خرام میں سن خادمہ سے اصرار تھا کہ باغچہ کا دیواری دروازہ کھلا

دسمبر ۴۲ء

حدود حصار کی بیرونی دنیا پر صرف ایک نظر ڈال لینے دے۔ وہاں کوئی بیٹھا تھوڑی ہی ہوگا، اور میں اس چمن کی چکر سے تھک چکی ہوں جسکی روشیں اپنے ہوش سنبھالنے کے بعد سے آجتک صبح و شام روزمرہ روندتی رہی ہوں' خادمہ اس یاددہانی کے لیے کہ (اگر آپکے ابا جان نے سن لیا تو کسقدر خفا ہوں گے) راضی ہوگئی اور گرانبار سیخچہ سرکاکر دروازہ کھول دیا۔ زلیخا تڑپ کر نکلی محرابی سائبان میں کھڑی ہوگئی شاید صبح کے سورج نے حسن و دلکشی کی ایسی پاکیزہ معصوم تصویر اس دن کے سوا نہیں دیکھی ہوگی کوئی دیکھنے والے اس کا اندیشہ تو تھا ہی نہیں لہذا کماں زیرا بروں نسیم سرد کیلئے برہنہ تھی جو اس کے سنہری گنجان بالوں کے ریشمی گھونگرے چھیڑ چھیڑ کر اٹھکھیلیاں کر رہی تھی، چشمان کافر کبھی ہندوے کافر کی درنہ دار رہی ہونگی نیلگوں تھیں اور معصوم رخساران گلابی رنگت شفتالوی غماز کلیوں کو مات کر رہے تھے جو اُسکے بالین سر اور پائین پا سرسبز ڈالیوں اور بیلوں میں بکھری ہوئی تھیں۔

جب مغل شاہزادہ اُس دن قریب صبح کو اپنے خاکی بستر سے آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا تو اُسی نظرنواز، نگاہ پرور دیوی سے نگاہیں لڑ گئیں، زلیخا نے لجاکر چہرہ پر گوشۂ نقاب کھینچا، مغل نے داہنا ہاتھ سینہ پر رکھ لیا اور سر جھکا کر نہایت ادب سے "السلام علیکم" کہا۔ جسکے جواب میں مرمریں لبوں میں خفیف سی مسیحا صفت حرکت ہوئی اور قریب قریب ناسموع لہجہ میں اسلامی نقرہ لڑکھڑائی زباں سے نکل گیا، وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" مگر ساتھ ہی ساتھ اسی شرم و حجاب سے مغلوب ہوکر جو مشرقی محبوس کنواریوں کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے حسینہ چمن کے اندر ہو رہی۔ جسکے اوجھل ہوتی ہی نوجوان خان کی نگاہ میں عکس آفتاب بے نور، اور زمزمہ سنج پرندوں کے نغمات سحر بے سرے معلوم ہونے لگے حقیقت یوں ہے کہ وہ حسین دوشیزہ پرجو صبح کی ارغوانی دھوپ میں صرف چند لمحات کے لئے نظر آئی تھی وارفتہ ہوچکا تھا۔

مگر اسکے جیسے آوارہ وطن غریب کے لئے کوئی امید نہ تھی کہ ایسے امیر سردار کی دختر کا ہاتھ جیت سکے جسکے سر بہ فلک محل کی کگریاں دیوار چمن کے اوپر باصرہ نواز تھیں!! اسی طرح کے یاس نصیب خیالات دماغ میں گذر رہے تھے کہ یکایک اس خوش اختر کو یاقوت خطرت یاد آگیا۔ اسنے کمر زیب پر انگلیاں دوڑائیں فیض لمس سے محسوس ہوا کہ وہ اب تک پٹکے کی تہوں میں محفوظ ہے، اب کیا تھا۔ امنگوں نے مایوسیوں پر فتح پائی۔

یہ انمول شفقتی متاع وراثت باپ سے بیٹے تک دست بدست چلا آتا تھا وہ ہمیشہ احترام و تقدس کے ساتھ محفوظ رکھا گیا تھا۔ کیونکہ اُس زبردست و زلزلہ انگیز پیشین گوئی کا انتظار تھا جو حصار خطرت کی امتیازی بربادی سے

یاقوت خطرت

دسمبر ۲۴ء

متعلق تھی، دو سو برس گذرے ہونگے کہ ایک قدسی صفت ستارہ شناس نے جس کے احکام کبھی غلط نہیں ہوئے ذیل کے مصرع مروجہ اوزان و قوانی میں نظم کئے تھے خلاصہ نذر نگاہ ہے۔

"جب بربادی کی آگ چمنِ خطرت کو جلا کر راکھہ کر چکے اور اسکی تمام خوبیوں میں صرف ایک
غنچہ (وارث) زندہ بچ جائے تب یاقوت خطرت اسی گلفروش کے پاس پوشیدہ رہے
آفتاب کی طرح چمکے اور چمنِ خطرت کا دس گنا واپس دلائے"

اسی علم نے مقرب خاں کے اسلاف کو یاقوت خطرت سے جدا نہ ہونے کو ہمیشہ مجبور رکھا گو دشواریاں پیش آئیں مگر ایسی نہ تھیں جیسی منجم کے منظوم احکام سے ہویدا ہیں۔ آج پیشین گوئی کی تمام شرطیں پوری ہو چکیں اور ہمارا ابھا در (روح روال فسانہ) برباد شدہ محل کے دن پھرنے کے لئے یاقوت خطرت کا صحیح استعمال کر رہا ہے، اسنے کانٹھی کھینچی اور نہایت دیدہ دلیری سے در چمن تک سوار ہو کر آیا سردار غلمان، خاندانی شناسا تھا جسنے نوجوان خان کی دکھ بھری کہانی سنکر تسلی دی اور خوشی سے راضی ہو گیا کہ اپنی لڑکی کا ہاتھ مالکِ یاقوت خطرت کے ہاتھ میں بسلسلہ شادی دیدیگا۔ غیر ضروری تاخیر کے بغیر شادی دھوم دھام سے ہو گئی، کیونکہ جوشیلا خان اس زبردست فوج میں شریک ہونے کے واسطے بے چین تھا جو الوالعزم بابر شاہ ہند پر حملہ کرنے کے لئے جمع کر رہا تھا، خسر صاحب نے یاقوت کے معاوضہ میں اپنی بھری ہوئی تھیلیوں سے پانچ لاکھ روپے نکال کر دیے جسکی بدولت داماد نے ایک ہزار سواروں کی مسلح جماعت اکھٹا کر لی، انہیں کی کمان لیکر وہ بابری فوج میں داخل ہو گیا اور بابر کی دسیکری کے صبر آزما معرکوں میں بقدر حوصلہ شجاعت کے سکے چلا دیے۔

جب وہ حملہ ہند سے عزت و بہادری اور اپنے حصہ کا مال غنیمت لیکر وطن کی جانب پلٹا تو اسکو اپنے ہمسایہ سردار کو شکست فاش دینے میں کوئی دقت نہیں ہوئی خان نے اپنی فوج کی فتح کی ہوئی ریاستوں کو بھی موروثی علاقہ میں شامل کر لیا اور حصارِ خطرت میں ایسی تمکنت سے حکومت کرنے لگا جسکا دسواں حصہ بھی اسکے بزرگوں میں سے کسی کے قرعہ نصیب میں اس روز سے آیا تھا جس دن سے وہ "تاج بخش یاقوت" اسکی نسل میں آیا تھا۔ اسکو کبھی بھول کر بھی پچھتاوا نہیں ہوا کہ یاقوت خطرت ہاتھوں سے نکل گیا۔ اس لئے کہ اب اسکے بجائے اس کے ہاتھوں میں دوسرا پتھر وگراں قدر یاقوت تھا جسکی قیمت کا اندازہ ہی ناممکن ہے یعنی اسکی .... "پیاری بیوی"۔

طالب الہ آبادی

شمع ہدایت

از "خان بہادر" سید محمد ہادی صاحب ایم۔آر۔اے۔سی۔ایم۔آر۔اے۔جی۔ایس
سابق کلکٹر غازی پور

(رباعیات)

امی جو اقرار کا سبق یاد ہوا　　کیا معجزۂ علم خداداد ہوا
کچھ دن میں وہی عارف نا حرف شناس　　استاد ہوا اور حکمت استاد ہوا

یہ ترک صلوٰۃ و صوم توبہ، توبہ　　یہ پچھلا پہر اور یہ نوم توبہ، توبہ
ہادی! اس سن میں روز توبہ شکنی　　توبہ اے ننگِ قوم توبہ توبہ

دنیا کی ہوس میں دیں کی بربادی واہ　　تو اور یہ راہ واہ، اے ہادی، واہ
روزے غائب، نماز گاہے گاہے　　مولا کا غلام اور یہ آزادی، واہ

خضاب

یہ ذوقِ کبابِ مرغ و ماہی کب تک　　آزادہ روی و کجکلاہی کب تک
شرمائے تجھے سفید ڈاڑھی تیری　　آخر ہادی یہ روسیاہی کب تک

اک درد جنوں کے ساتھ سر میں ٹھیرا　　دل میں اُترا کبھی جگر میں ٹھیرا
آخر اسکو بھی گوشہ گیری تھی ضرور　　پیری میں جھکی ہوئی کمر میں ٹھیرا

ہادی

نکاتِ زرّیں

(۱) جن لوگوں میں عصبیت نہیں اُنکی شرافت بھی مجازی و بے اعتباری ہے۔
(۲) احساب و اخلاق نسب کی طرف رجوع ہوتے ہیں اور شرافت و حسب کا مدار اخلاق و اطوار پر۔
(۳) نسب کا فائدہ ہے عصبیت و غیرت اور باہمی نصرت و حمایت پس جب کہ عصبیت قوی اور ہیبت ناک ہوگی اور گھرانا حسیب شریف تو نسب کا فائدہ بھی زیادہ ہوگا۔ اور آباؤ اجداد کی شرافت و عزت اُس پر طرہ ہوگی۔ اس لئے ایسے گھرانے میں ثمرات نسب کافی ہونے کی وجہ سے حسب و شرف بھی حقیقی و واقعی ہوگا۔
(۴) نازو نعمت کی بدمستی اور بات بات میں نمود کی خواہش۔
(۵) نفس انسان جب تک سادہ اور اپنی اصل فطرت پر ہوتا ہے تو اُس میں بہ آسانی خیر و شر کے قبول کرنے کی استعداد و صلاحیت ہوتی ہے۔ چنانچہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ " کلُ مولود یولدُ علی الفطرت فابواہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ۔
(۶) جب تک نفس اپنی فطرتِ اولی پر قائم ہے تو جس قدر خیر و شر میں سے ایک حس حاصل کرتا ہے اسی قدر دوسرے سے الگ اور بے تعلق ہوتا ہے۔ اگر ابتداءً نیکی طبیعت میں مرتکز ہوگئی تو بدی کو جگہ نہیں ملتی اور اگر بدی نے جگہ پکڑلی تو پھر نیکی کا گزر نہیں ہوتا۔
(۷) نفوس انسانی سرکش و خود رائے ہیں۔
(۸) اگر حکومت تعزیر و عقوبت کی ادا پر کیجاتی ہے تو محکوم جماعت کی جرات و شجاعت کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ عقوبت کی برداشت اور عجز مدافعت نفوس انسانی کے لئے ذلت و خواری کا باعث ہے جس سے خودداری اور جرأت کی بیخ کنی ہوجاتی ہے۔
(۹) ایک دفعہ کسریٰ نے نعمان سے دریافت کیا کہ عرب کے قبیلوں میں سے کسی کو کسی پر شرف و برتری بھی ہے یا نہیں۔ جواب دیا ہاں ہے۔ کہا کس سبب سے۔ کہا جس کی تین پشتیں برابر رئیس رہی ہوں۔ اور پھر چوتھی پشت کو بھی ریاست ملی ہو۔ اُسی کا گھرانہ قبیلہ میں شریف تر

مانا جاتا ہے۔

۱۰۔ جناب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ جسکی اصلاح شریعت سے نہ ہو وہ اصلاح پذیر ہو ہی نہیں سکتا۔ بایں وجہ کہ ہر شخص آپ اپنا مصلح ہو کر شارع علیہ السلام کے احکام کی پیروی سے تزکیہ نفس بہ اتم وجوہ کر سکتا ہے۔

محمد شریف الزماں شریف

افکار فکری

دل کسی کے تیر کی اتنی تو مہمانی کرے
زخم خود مُنہ کھول کر جسکی ثنا خوانی کرے

خلق کی نظروں میں عبرت کا مرقع بن گئی
نازکیوں مجھپر نہ میری گھر کی ویرانی کرے

رشک کے قابل ہے اُس مقتول کی وہ موت بھی
جس کا ماتم عمر بھر اُن کی پشیمانی کرے

دل سے اُنکی یاد بھی یہ کہہ کے رخصت ہوگئی
کون اس اجڑے ہوئے گھر کی نگہبانی کرے

آج بالیں سے اطبا بھی یہ کہہ کر اُٹھ گئے
اب مدد بیمار کی تائید یزدانی کرے

خوگر عشرت بنانا دل کو زیبا ہی نہیں
دے خدا توفیق تو وقف پریشانی کرے

مرگ فکری کا نہیں غم اُن کو اسکی فکر ہے
کس پہ اب تیر نظر مشق ستم رانی کرے

فکری

اعتذار۔ گزشتہ ماہ نومبر کا پرچہ مشین بند ہو جانے کی وجہ سے بجائے ۵ نومبر کے ۹ نومبر کو شائع ہو سکا چنانچہ یہ تعویق قابل معافی ہے۔ مینجر

ایک خاتون کا دامانِ خیال

یہ کیوں، ایک سنگلاخ پتھر کا بڑا ٹکڑا چھوٹے چھوٹے ذرات کو پیسنے میں مصروف کار ہے، غالب درخت مغلوب درختوں کی قوت نامیہ کو کیوں فنا کر رہا ہے، اور کیوں ایک طاقتور درندہ کمزور جانوروں کو چیر پھاڑ ڈالتا ہے، کیا ان میں ادراک و شعور کا فقدان، اس طوفان حوادث کا باعث ہے، کیا غیر شعور مخلوق تک ہی یہ قصابیت محدود ہے۔؟

لیکن نہیں میں دیکھتی ہوں کہ کائنات آفرینش میں مرد کا وجود ان سب سے زیادہ وحشیانہ اور مبدء خرابی ہے۔ یہ وہی ہے جو اپنے کو اشرف المخلوقات کہتا ہے جو بار امانت کا حامل بتاتا ہے، اور خود کو عقل و فطانت کا مجسمہ قرار دیتا ہے۔ لیکن اسکی سفاکیوں سے دنیا تنگ آ گئی ہے، فضاء عالم ہولناک مصائب سے بھر گئی ہے تاریخ روزگار کے جس صفحہ کو اُلٹو سفاکیوں اور بیرحمیوں سے خوں چکاں نظر آتا ہے۔

ایک درندہ محض جذبۂ اشتہا سے بیتاب ہو کر جانوروں کو شکار کرتا ہے لیکن یہ خونخوار عفریت محض بیجا اغراض، نمائش و تمکنت کے باعث سیکڑوں بندگان خدا کو خلیج ہلاکت میں ڈھکیلتا ہے یہ جب دنیا میں آتا ہے تو سب سے پہلے مشق جفا کے لئے پتھروں کے اوزار بناتا ہے، لوہے کے اسلحہ تیار کرتا ہے، اور جو ہاتھ اس کا پہلے جانوروں کی ہلاکت میں جنبش کرتا تھا پھر وہ کمزور دل کی سرزنش میں اٹھنے لگتا ہے، جب تمدن آگے بڑھتا ہے تو قبائل میں ایک تنومند ہستی کارفرما ہوتی ہے اور وہ مغرورانہ سبعیت کے ساتھ دوسرے قبائل پر حملہ کرتی ہے، اور انکو زیر کر کے وحشیانہ سفاکیوں سے انہیں مجروح کر دیتی ہے۔

تھوڑے دنوں میں سطوت و شکوہ شاہی کی بنیادیں پڑ جاتی ہیں اور دنیا میں ظلم و عدوان کے وحشتناک مناظر اُن سے زیادہ نظر آنے لگتے ہیں۔

اس طبقہ کی خوں آشامیوں کے حالات، مورخ کی قلم کا سینہ چاک کر ڈالتے ہیں، بخت نصر اٹھتا ہے، اکثر ملکوں کو تاراج کر ڈالتا ہے، اسکی فوج کی یلغار مفتوح قوم کی ملبوسات حیات کو

پھاڑ ڈالتی ہے ۔ نمرود، خدائی کا دعویٰ کرتا ہے، اور وہ گردنیں جو صانعِ حقیقی کے سامنے جھکنا چاہتی تھیں، ان کو بجبر جھکایا جاتا ہے، اور مظالم و خوں فشانیوں سے اپنا وقار تمکنت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ فرعون بنی اسرائیل کے ساتھ جو مظالم روا رکھتا ہے، حضرت موسیٰ سے جس متکبرانہ لہجہ میں گفتگو کرتا ہے، اور جسطرح وہ اپنی موت و حیات کے اختیارات کی نمائش کرتا ہے، اور حق و صداقت کی جس نہج سے تکذیب کرتا ہے اسکے اظہار سے زبان میں لکنت پیدا ہو جاتی ہے ۔

سکندر و دارا، رچرڈ و صلاح الدین، نادر و چنگیز کے عہد میں جو خونریزیاں ہوئیں اور امن و امان کی سطحات ہیں ۔ اس دورِ ہلاکت بیزی میں جو کشتیں پڑیں انکی تفصیلات سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں زمانہ ماضی کے حالات چھوڑ دو، آج جب کہ تہذیب و شائستگی کی نغمہ ریزیاں ہو رہی ہیں دیکھو ولیعہد آسٹریا سازشوں کا شکار ہوتا ہے، وہ حکومتیں جو امن و اصلاح کی مدعی تھیں جو دنیا میں مناقشت اور خوں ریزی کو فعلِ قبیح سے منسوب کرتی تھیں جو مظالم و جور پر لعنت بھیجتی تھیں اور جو ہمدردیٔ بشری کے حدود سے گزر کر جانوروں کی ہمدردی میں اجرائے قانون کی نمائش کیا کرتی تھیں، انکو جوعِ ارض کا جذبہ گھیر لیتا ہے، وہ خوفناک اسلحہ ہاتھوں میں لیکر اٹھتی ہیں، لیکن دنیا سے یہی کہتی ہیں کہ صداقت و ہمدردی کا عصا ہمارے ہاتھوں میں ہے ۔ ہر ایک حکومت اپنے کو شاہ راہِ حق پر سمجھتی ہے لیکن سنہ ۱۴ء سے لیکر سنہ ۲۰ء تک انسان سوز بہیمیت، اور وحشیانہ جذبۂ انتقام کا کوئی پہلو باقی نہیں رکھا جاتا مشین گنیں، توپیں، استعمال کیجاتی ہیں ہنگامۂ رستخیز بلند ہوتا ہے، کرۂ ارضی کانپ جاتا ہے، پہاڑ ہلنے لگتے ہیں، کوہِ آتش فشاں آنسو بہانے لگتا ہے غرض کہ جنگ ختم ہوتی ہے اور اتلافِ مال و نفوس کا جائزہ لیا جاتا ہے تو ۱/۲ اکرہ خدا کی مخلوق کم ہو جاتی ہے اور لاتعد مال تباہ و برباد ہو جاتا ہے ۔

وہ دل و دماغ جو پرامن مذہب کا فلسفہ بیان کیا کرتے تھے وہ فاضلانہ ہاتھ جنکی جنبشِ قلم سے رحم و ہمدردی کے پرمغز مضامین نکلا کرتے تھے اس ہنگامہ بربریت میں یا تو نقشہ جنگ کھینچنے میں مصروف تھے یا کارخانوں میں گولے ڈھال رہے تھے ۔

سلاطین کے طبقہ کو چھوڑ دو اُن مقدس ہستیوں کو لو جو دنیا میں اس لئے آئے تھے کہ نوامیس فطرت کو بیدار کریں جو ارتقائے روحانی سے انسان کا متخیلہ رفیع بنائیں لیکن شیوع اور ترویج مذاہب میں جو انقلاب پیدا ہوے ہیں، اور پیروان مذاہب کے دامنوں نے جو شعلہ ہائے جنگ و منافرت بھڑکائے ہیں اگر ان کو دیکھنا چاہتے ہو تو یہودی و بنی اسرائیل کی تاریخ پڑھو کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کی منافرت اور خوں فشانیوں کے واقعات پر غور کرو۔

اگر کہیں عقائد کے موضوعات پر تلواریں کھنچی ہیں اور خون کا سیلاب بہتا ہے تو کہیں فلاسفر اور موحد شعلہ فشاں آگ میں زندہ جھونک دیے جاتے ہیں۔

ہاں ایک گروہ اور بھی ہے جسنے حریت و مساوات کا غلغلہ بلند کر رکھا ہے جوزف میزنی اٹلی میں پیدا ہوکر انقلاب کی بنیاد رکھتا ہے۔ کیمل فرانس میں زعیمانہ اسپیچوں میں مصروف ہوتا ہے، ڈی ویلرا آئرلینڈ میں طوفان قیامت پیدا کرتا ہے، انجمن ترقی و اتحاد ارکین کان کے پردے پھاڑ ڈالتے ہیں، لینن پیٹربرگ میں ایک ہیجان عظیم ڈالدیتا ہے۔ سعد زاغلول کے بدولت مصر کی گلیوں میں خون کے فوارے اُچھلنے لگتے ہیں غرض کہ ان حضرات کے کارناموں کے سمندر میں لہو اور خون کا تموج ہی تموج نظر آتا ہے۔

مردوں کی شقاوت کا باب انہیں واقعات پر ختم نہیں ہوتا، انہوں نے ہمارے صنف نازک و ناتواں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ تاریخ انسانیت کا بدترین داغ ہے۔

افسوس اُنہوں نے اُس درخت کی شاخیں تراشی ہیں جسکے سایہ میں انکو راحت ملی تھی، انہوں نے بیدردی سے اُنہیں ہاتھوں کو مفلوج کیا ہے جو اُن کے سروں پر مادرانہ شفقت اور رافت سے اٹھا کرتے تھے۔

ان کے ظالم اور بے درد ہاتھوں نے بے شمار ہماری معصوم لڑکیوں کو زندہ زمین میں دفن کیا ہے، انکے اس فعل سے زمین و آسمان تھراتے تھے، خدا کے فرشتے لعنت بھیجتے تھے مگر اُنہوں نے اپنے کانوں کو بہرے بنا لئے تھے، اُن کے بے مہر قلب ہمارے شیون و فریاد سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوتے تھے۔

کل کا واقعہ ہے کہ لینن اور ٹراٹسکی کی زعیمانہ اسپیچیں پیٹرزبرگ میں ہولناک انقلاب پیدا کرتی ہیں اور زار روس کے ساتھ ملکہ کیتھرائن کے خاندان کی وہ معصوم بچیاں اور وہ بے گناہ عورتیں کمال بے دردی اور شقاوت کے ساتھ خوفناک بندوقوں کی باڑھ سے فنا کردی جاتی ہیں۔

یونان کے خونخوار درندے ایشیائے کوچک میں پہونچتے ہیں اور ہمارے بچوں کو سنگینوں سے اچھال کر اپنی کرتب بازی سے چونک کرتے ہیں۔

اٹلی کے وحشی طرابلس میں گھس جاتے ہیں ہماری عصمتوں پر حملہ ہوتا ہے، ہماری املاک پر قبضہ کیا جاتا ہے ہمپر توپوں کے گولے برسائے جاتے ہیں اور ہماری بے گناہ ہستیوں کو تودۂ خاکستر بنادیا جاتا ہے،

یہی طبقہ ہے جو ہمکو جانوروں سے بدتر سمجھا کیا اور مدتوں اسنے ہمارے جسموں میں روح کو ہی تسلیم نہیں کیا۔

ہمنے ان کو نو ماہ پیٹ میں رکھا، جب یہ ایک مضغۂ گوشت تھے ہمنے انکی پرورش کی انکو کلیجے سے لگائے رکھا خود مصیبتیں جھیلیں اور ان کو تکلیف سے محفوظ رکھا لیکن جب یہ جوان ہوئے تو ان کا ناشکر گزار قلب جذبات تشکر سے خالی پا یا گیا۔

زہاد، اور بادیہ نشینوں کا طبقہ جو راہبانہ زندگی بسر کرتا تھا اُن تک نے ہمکو مبغوض نظر سے دیکھا اور خودغرض مقننین نے ہمارے حقوق کے عطا میں ہمیشہ بخل روا رکھا۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ صرف تنزلی دائرہ میں رہنے کے لئے مخلوق کی گئی ہو، تمہارا یہ فرض ہے کہ خانگی انتظام رکھو، اور مردوں کی خدمت گزاری کے لئے غلاموں کی طرح مصروف رہو، ہم نباتات کی طرح اپنی ہستی بسر کرنے پر مجبور کئے گئے۔

ان کے بیدردا ور گستاخ ہاتھ اکثر ہمکو اخلاقی رفعت سے کھینچنے میں سعی کرتے رہے، ہمکو علوم و فنون سے اسلئے محروم رکھا گیا کہ جذبۂ حقوق طلبی نہ پیدا ہو اور ہمکو فرائض حکومت میں اس واہمہ کے سبب حصہ نہیں دیا گیا کہ کہیں انتقام مظالم و عدوان ہمسے نہ لیا جائے۔

آج اگر یورپ میں ظاہری نمائش ہمکو حاصل بھی ہوئی ہے تو وہ قدرتی اغراض کو پورا نہیں کر سکتی دار العلوم میں نہ ہمارا پریسیڈنٹ ہے اور نہ دار الامرا میں ہمارا کوئی چیرمین۔

نہ وزیر خارجہ کے عہدہ پر ہماری صنف کا نمایندہ ہے اور نہ وزیر داخلی کا دروازہ ہمپر کھولا گیا ہے۔

جب کبھی ہمارا ڈپوٹیشن پارلیمنٹ کے ایوان میں پونچتا ہے تو پولیس ذلت کے ساتھ ہمکو واپسی پر مجبور کرتی ہے، جب ہماری آواز طلبِ حقوق میں اُٹھتی ہے تو اُسکے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جب ہم آگے بڑھنے کا قصد کرتے ہیں تو بیدردی کے ساتھ ٹھکرائے جاتے ہیں غرض کہ موجودہ بدترین نظام اجتماعی میں ہمکو اس کا

موقع نہیں دیا گیا کہ ہم اپنی قابلیتوں کی نمائش میں حصہ لے سکتے۔ کاش وقارِ حکومت کی باگیں ہمارے ہاتھوں میں ہوتیں تو نہ قیصر کی خون آشام تلوار فضاءِ عالم پر چمکتی اور نہ خون کے سمندر میں ½ کرور مخلوق غرقاب ہوتی۔ ولسن رحم و ہمدردی کا جامہ پہن کر ڈپلومیسی کے اسٹیج پر آتا ہے، وہ مستقبل میں امن و امان قائم رکھنے کیلئے حکومتوں کو مشورہ دیتا ہے کہ عساکر و جیوش کم کئے جائیں، خوفناک اسلحہ مٹا دیئے جائیں، کمزوروں کی محافظت کی جائے، لیکن اسکی صدا کی آواز بازگشت معدوم نہیں ہونے پاتی کہ نیویارک میں تباہ کن جہازات بڑھائے جاتے ہیں اور ہر ایک حکومت خفیہ و علانیہ ہولناک آتشباری کے آلات بڑھانے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ نامعلوم زمانہ سے دنیا کا مطلع بیرحمانہ شقاوت کی ظلمتوں سے مکدر ہو رہا ہے جسقدر عقل و شائستگی میں اضافہ ہو رہا ہے، اور تمدن کی دیوی جسقدر رعنائی دکھا رہی ہے سفاکیوں کا طوفان بڑھ رہا ہے۔ اور مظالم کی پرستش ہو رہی ہے۔

جب کہ اس طویل مدت میں مرد خونخواری کی جگہ رحم کو اور سبعیت و درندگی کی جگہ ہمدردی کو نہیں دے سکے تو وسعت تمدن کا مستقبل کب تسلی بخش متوقع ہو سکتا ہے۔

وہ فطرت جس میں غضب و جوش کا مادہ زیادہ ہے اسکی جگہ ایسی سرشت کی ضرورت ہے جسکے قوائے جنسی میں رحم و ہمدردی کے جذبات ہوں پس مرقع عالم کا مستقبل اگر دل آویز نظر آسکتا ہے تو تجربتاً دنیا میں سیادت و اقتدار کی باگیں ہمیں دیدو! اور صبر کے ساتھ دیکھو کہ ان مظاہر خوں چکاں کی جگہ امن و سکون رحم و ہمدردی کی فضا قائم ہوتی ہے یا نہیں۔

پس ٹراٹسکی کو ہٹا دو، سعد کو معزول کر دو، دی ولیرا کو ڈھکیل دو، غرض کہ ان بے شمار قائدین کی جگہ انکی رفیق زندگیوں کو حوالہ کر دو اور ایک صدی تک ہمارے نظام حکومت کی گلکاریاں دیکھو۔

ایڈیٹر

غالب و مانی

ملی کیا شے ازل میں ایک قسمت واژگوں وہ بھی   اُسی سے زندگی وابستہ لیکن بے سکوں وہ بھی
جو کچھ سرمایۂ عمرِ دو روزہ ہے کہوں وہ بھی   بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

تغافل دل ستانی کا ہے کوئی راز فرماؤ   تکبر دل بری کا ہے کوئی انداز فرماؤ
نہ یوں خونِ تمنائے دلِ جانباز فرماؤ   نہ اتنا برشِ تیغِ قضا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

ملے آرام زیرِ چرخ کیا یہ حوصلہ کیجے   امید کامیابی ہو تو عرضِ مدعا کیجے
تہی ظرفوں سے کیوں بیکار کوئی التجا کیجے   مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

فغاں سے پیشتر بھی دل تڑپتا تھا مگر کم کم   معاذ اللہ اب تو یہ تپش کا ہو گیا عالم
کہ گویا اک جہانِ بیقراری ہے دلِ پُر غم   نہ کرتا کاش نالہ مجھکو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

یہ سچ ہے رہتے ہیں عاشق کے دلمیں سیکڑوں ارماں   کہ مانی کے بقول اُنکا بیاں ہے خارج از امکاں
مگر سن مجھسے دو لفظوں میں شرحِ حسرتِ پنہاں   مرے جی میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جب اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

مانی جائسی

نوٹ:۔ اس ماہ میں بوجہ عدم گنجائش "پاپیا" کا ترجمہ شائع نہ ہو سکا، آئندہ ماہ میں پیش کیا جائے گا۔
ایڈیٹر

دسمبر ۱۹۲۴ء

۷۹

گفتارِ صدق

لطف ب تیرا کبھی یا اے ستمگر آگیا — اشک آنکھوں میں بھر آئے نالہ لب پر آگیا

اُٹھ کے ارماں میں ترے بیٹھا کہ تیورا کر گرا — گر کے حسرت میں تری اُٹھا کہ چکر آگیا

نیچی نظریں تھیں کہ آنکھوں میں نہاں دو تیر تھے — اک جگر میں چبھ گیا، اک دل کے اندر آگیا

جاتے جاتے جانِ مضطر اک دن جاتی رہی — آتے آتے آپ کے وعدہ برابر آگیا

کیا تصور میں جگر پر رکھ دیا تھا تم نے ہاتھ — درد اُس پہلو سے اِس پہلو میں کیونکر آگیا

دشت میں بہلا ہے کچھ [illegible] گا کچھ گلشن میں دل — تو نے اے وحشت کہا اور مجھکو یا [illegible] آگیا

وہ پوچھتے ہیں تو نے تو پیار [illegible] بھی [illegible] — گر [illegible] نہ کہیں تو [illegible]

اللہ رے سیاہی تری اے روزِ جدائی — [illegible]

وحشت کدہ دل کا مرے حال نہ پوچھ — [illegible]

تو نے ابھی اے [illegible] دیکھے ہیں — [illegible]

کو [illegible] صدق [illegible] — خندہ [illegible] گریباں [illegible]

(صدق)

منتخب اشعار

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اُٹھا — فانی — مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اُٹھا
اس طرح گذری ہماری عمر کوئے یار میں — سحر — دھوپ سے اٹھے تو بیٹھے سایۂ دیوار میں
محفل میں اُٹھ گئی ہے نظر سوئے آسماں — شہید — گویا یہ دیکھتا ہوں کہ میرا خدا بھی ہے
اب ہمیں کس پتہ سے ڈھونڈھو گے — ؍؍ — نقش لوحِ مزار بھی نہ رہا +
کیا کروں دل کی تباہی مذکور + — تمنا — ہائے وہ شکل کہ معصوم سی ہے +
عشق نے بنالیا اُونکا آستان وطن — ؍؍ — میں غریب ہوگیا ساری کائنات میں
اب قفس ہی نظر آتا ہے نہ صیاد مجھے — آہی — کھینچ لائی ہے کہاں طاقتِ فریاد مجھے
میں لیتا رخصتِ یک نالہ اور خاموش ہو جاتا — ؍؍ — قفس صیاد اگر اک بار رکھ دیتا گلستاں میں
نیند آنکھوں میں برائے نام بھی آئی نہ تھی — شفق — اُسنے شانِ حسن دکھلائی تھی انگڑائی نہ تھی
میں وہ برگشتہ مقدر ہوں کہ گر پڑ کر کبھی — ؍؍ — سایہ تک پہونچا تو سایہ چڑھ گیا دیوار پر
یہ آج تک نہ ہوا طے کہ کیا کہیں اُن سے — محوی — تمام عمر ہوئی دل سے گفتگو کرتے
کاٹ دے اے ناامیدی توڑ دے اے بیکسی — ؍؍ — یہ جو اک نازک سا رشتہ میرے جان و تن میں ہے
گوشہ جو ہٹ گیا ہے کسی کی نقاب کا — ذکی — پھر پھر گیا ہے چرخ پہ تختہ آفتاب کا
ہمیں بھی ہے شوق مثل موسیٰ کہ تم سے ہو جائیں چار باتیں — ؍؍ — تمہاری باتوں پہ نطق صدقے تمہارے لب پر نثار باتیں
جدھر دیکھو اُدھر رونا پڑا ہے حشر میں دل کا — عالی — کہاں تک آگیا ہنگامہ بڑھ کر اُسکی محفل کا
حسن بے پردہ وہ غیروں کو دکھاتے آئے — ؍؍ — گھر مرے راہ میں لٹتی ہوئی دولت آئی
اُسکی خلوت میں پہنچنے کو پہنچتا ہے خیال ؛ — فکری — راہ میں لیکن ہزاروں ٹھوکریں کھاتا ہوا
ہاں پھر دکھا وہ جلوۂ حیرت فزا مجھے — منیر — غفلت سے تیری ہوش سا آنے لگا مجھے
کر دیا مجبور او بیدرد تیرے درد نے — صدقی — ورنہ پہلو میں جگہ دینے کے قابل دل نہ تھا
ہوش میں جو نہیں رہے ان کو پیمبری ملی — ایڈیٹر — دیکھئے مجھکو کیا ملے جلوۂ یار دیکھکر
کنج قفس ہو یا چمن اُس کے لئے سب ایک ہے — ؍؍ — جسنے خزاں بھی دیکھ لی فصلِ بہار دیکھکر